جرم اور سراغرسانی کی سچی کہانیاں



محبوب عالم

بن بیاہی ماں

جرم اور سراغرسانی کی سچی کہانیاں

محبوب عالم

جہانگیر بک ڈپو
لاہور، راولپنڈی، کراچی

فہرست

پیش لفظ

محترم محبوب عالم کی تفتیشی کہانیوں کا پہلا مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

محترم محبوب عالم محترم احمد یار خان کو اپنا اُستاد کہتے ہیں۔ ان کی تفتیش اور سراغرسانی کی روئیداد پڑھو تو پتہ چلتا ہے کہ وہ خود اُستاد ہیں۔ "حکایت" میں ان کی کہانیاں پڑھنے والوں کو اندازہ ہے کہ محترم احمد یار خان کی طرح محترم محبوب عالم بھی قاری پر سحر طاری کر دیتے ہیں۔

یہ کہانیاں مصنف کی تخلیق نہیں، یہ حقیقی زندگی کے ڈرامے ہیں۔ اِن کے کردار عادی مجرم نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کے ایسے کردار ہیں جو انتہائی معمولی جُرم کے ارتکاب سے بھی گھبراتے ہیں مگر ایسی لغزش کر بیٹھتے ہیں جو تھانے میں جا کر جُرم و سزا کی بھیانک اور عبرتناک کہانی بن جاتی ہے۔

یہ کہانیاں ہیں تو جُرم اور سراغرسانی کی لیکن ان میں آپ کو چاردیواری کی دُنیا کے ڈھکے چھُپے گوشے نظر آئیں گے۔ یہ وہ گوشے ہیں جن کے متعلق لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ان میں کوئی نہیں جھانک سکتا اور یہ کسی کو نظر نہیں آسکتے مگر ذرا ذرا سی لغزشیں، دولت اور عورت کا نشہ اور ان کے نتائج سے چشم پوشی اچھے بھلے انسانوں کو پھانسی کے تختے تک پہنچا دیتی ہے۔

ہمارے ہاں جُرم و سزا کی ایسی کہانیاں پسند کی جاتی ہیں جو صرف تفریح مہیا کرتی ہیں لیکن ہم اس صنف کی ایسی کہانیاں سُناتے ہیں جو حقیقی

ہونے کے علاوہ تفریح بھی مہیا کرتی ہیں اور قاری کو کچھ سوچنے اور غور کرنے کا مواد بھی فراہم کرتی ہیں۔ اس طرح یہ کہانیاں آپ کے ذہن میں فلم کی طرح چلتی رہتی ہیں۔

ہم اپنی مطبوعات میں جہاں انسانی فطرت کے جائز مطالبے یعنی تفریح کو پیشِ نظر رکھتے ہیں وہاں یہ خیال بھی رکھتے ہیں کہ یہ کہانیاں گھروں میں بچے اور بچیاں بھی پڑھتی ہیں۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ ہماری کہانیاں نوجوانوں کو اُن کہانیوں سے ہٹا دیتی ہیں جن میں تفریح اور ذہنی لذت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

عنایت اللہ

مدیر "حکایت" لاہور

خُدا کا فیصلہ

ٹانگ کٹ گئی تو میں دُنیا سے کٹ گیا۔ بتیس تینتیس سال کی عمر میں ایک ٹنگا ہو جانا بڑے غم والا نقصان ہے لیکن مجھے غم نہ ہونے کا سبب یہ ہوا کہ میں نے دو عورتوں کی عزت سکھوں سے بچائی تھی۔ وہ ہندوستان سے پاکستان آرہی تھیں۔ اس کہانی کو الگ رکھ دیں۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں نے کہا ہے کہ میں دُنیا سے کٹ گیا تھا۔ نہ کبھی کتاب پڑھی نہ کبھی کوئی رسالہ پڑھنے کی تمنا ہوئی۔ ایک روز اپنے داماد کے گھر گیا تو "حکایت" دیکھا۔ اس میں احمد یار خان کا نام پڑھا تو یادیں جاگ پڑیں۔ میرے اس پرانے یار کا مجھے پتہ معلوم تھا۔ ایک روز اُس کے گاؤں جا پہنچا۔ یادیں ہمیں وہاں لے گئیں جہاں ہم دونوں تھانیدار تھے۔ ملک مجھے واپس نہیں آنے دے رہا تھا۔ مجھے ایسا مشتبہ بٹھایا کہ چوتھے روز چھوڑا۔ میری اس کی بہت باتیں ہوئیں۔ ملک بڑا چالاک آدمی ہے۔ مجھے ایسی پٹیاں پڑھائیں کہ میں نے اپنی تفتیشوں کی کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ میری اُردو تھانے والی ہے۔ آپ خود سیدھی کر لینا۔ ہم پرچے کاٹنے والے اور برآمدگیوں کے مشیر نامے لکھنے والے لوگ ہیں۔

قتل کی یہ واردات ۱۹۴۶ء کی ہے جب سارے ہندوستان میں الیکشن ہو رہے تھے۔ یہ الیکشن مسلمانوں اور ہندوؤں کی ایک طرح کی لڑائی تھی۔ مسلمان اسے غلام ہندوستان کی آخری لڑائی بنانے کے لئے بہت کوشش کر رہے تھے۔ ہمارا نعرہ "پاکستان" تھا۔ اگر مسلمان الیکشن ہار جاتے تو پاکستان کبھی نہ بنتا اور ہم برہمنوں کے غلام ہوتے۔ میں بھی مسلمانوں جیسا

مُسلمان تھا لیکن تھانیداری کی ہتھکڑیاں مَیں نے خود پہنی ہوئی تھیں۔ اسی واسطے مَیں قوم کے ساتھ اپنا حق اور فرض ادا نہیں کر سکا۔

مَیں ایک قصبہ کمال پور (بدلا ہُوا نام) کے تھانے کا انچارج تھا۔ کمال پور ایک بڑا قصبہ تھا۔ تھانہ ایک ہی تھا لیکن قصبہ شہر کی برابری کرتا تھا۔ اس میں مُسلمانوں کی آبادی تھوڑی تھی۔ ہندو زیادہ تھے۔ قریبی دیہات میں دو جاگیریں مُسلمانوں کی تھیں۔ ایک روز مَیں ایک تفتیش کے سِلسلے میں باہر گیا ہُوا تھا۔ واپس آیا تو اپنے محرّر ہیڈ کانسٹیبل پرتاپ سنگھ اور ہیڈ کانسٹیبل نور احمد سے پُوچھا کہ میری غیر حاضری میں کوئی رپورٹ رپاٹ، کوئی ٹیلیفون تو نہیں آیا۔ پرتاپے نے مذاق کے لہجے میں کہا کہ ایک پگلی بڑھیا آئی تھی۔ کہتی تھی بڑے تھانیدار سے ملنا ہے۔ اُس سے وجہ پُوچھی تو اُس نے نہیں بتائی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی۔

پرتاپ سنگھ اور نور احمد نے بتایا کہ وہ جانے لگی تو اسے اے۔ایس۔آئی رام ناتھ آگیا۔ بڑھیا کو نُورے نے مذاق سے کہا کہ بڑے تھانیدار صاحب آگئے ہیں۔ بڑھیا نے رام ناتھ کو بڑا تھانیدار سمجھ لیا اور اُسے بتایا کہ وہ گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ صبح وہ بازار سبزی ترکاری لینے خود جاتی ہے اور گھر کو تالا لگا جاتی ہے۔ جب واپس آتی ہے تو اُس کے گھر کی بعض چیزیں اِدھر اُدھر ہوگئی ہوتی ہیں۔ اُسے یقین تھا کہ اُس کی غیر حاضری میں کوئی اُس کے گھر میں داخل ہوتا ہے اور تلاشی لیتا ہے اور بعض چیزیں اِدھر اُدھر کر جاتا ہے۔

اُس نے رام ناتھ سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ باہر کا تالا لگا رہتا ہے۔ کوئی چیز چوری نہیں ہوتی لیکن کوئی اندر آتا ضرور ہے۔

مَیں نے رام ناتھ کو بلا کر پوچھا کہ وہ بُڑھیا کون تھی۔ رام ناتھ نے مُنہ بنا کر کہا — "پگلی تھی جی! اکیلی رہتی ہے۔ بوڑھی ہوگئی ہے۔ وہمی ہے۔ دماغ بڑھاپے نے کھا لیا ہے۔ میں نے چلتا کیا اُسے۔ مَیں نے اُسے کہا تھا کہ کل سے تمہارے گھر پولیس کا پہرہ کھڑا کر دیں گے۔"

آنٹی بدچلن نہیں تھی

پرتاپا، نُورا اور رام ناتھ بُڑھیا کی بات کو ہنسی مذاق میں ٹال رہے تھے۔ اس سے مجھے مزہ آ رہا تھا اس واسطے کہ میں بہت تھکا ہُوا تھا، کوئی رپورٹ سُننے کا موڈ نہیں تھا۔ مَیں نے بڑھیا کے بارے میں کوئی بات ٹھٹھے مخول میں کی تو ہیڈ کانسٹیبل نور احمد فوراً بولا — "جناب! اس بُڑھیا کی جگہ اس کی بھانجی آجاتی تو اُسے ہم کبھی نہ ٹالتے۔ آپ کے آنے تک بٹھائے رکھتے" — اُس نے ہیڈ کانسٹیبل پرتاپ سنگھ کی ران پر ہاتھ مار کر کہا — "کیوں اوئے پرتاپے! ... بول اوئے ریچھ کی اولاد!"

"ہائے خا ئے سرکار!" — پرتاپے نے داڑھی اور مونچھوں کے جنگل میں سے دانت نکال کر کہا — "وہ آجاتے تو اُسے آپ مشتبہ ہی بٹھا لیں اور ہم سب کو شہر کی گشت پر بھیج دیں ... ایسی جوانی۔ ایسا حُسن۔"

تھوڑا وقت ہم اُس طرح کی باتوں سے دل "پشوری" کرتے رہے جس طرح پولیس اور فوج کی وردی پہن کر بارکوں میں کی جاتی ہیں۔ بڑھیا کی بھانجی کی باتیں ہوتے ہوتے اس خاندان کی تاریخ بیان ہوئی۔ نور احمد اور پرتاپ سنگھ اس تھانے میں پُرانے تھے۔ بُڑھیا جو تھانے میں آئی تھی، وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ نُورے اور پرتاپے نے بتایا کہ بڑی امیر عورت ہے۔ اس کا خاوند ریلوے میں ملازم تھا۔ چار پانچ سال گزرے مر گیا تھا۔ وہ پہلے گُڈز کلرک تھا اور پکا حرام خور۔ سامان جو ریل گاڑی سے بُک ہوتا یا آتا تھا وہ اس میں سے اُڑا کر بیچ دیتا تھا۔ وہ کسی بڑے شہر میں تھا۔ اُس نے بہت دولت کمائی۔ ریلوے میں وہ اُونچے عہدے تک بھی پہنچا۔ اُس نے اپنے معمولی سے مکان کو ایسی حویلی بنا دیا جو ہندوؤں کا مقابلہ کرتی تھی۔ حویلی میں لکڑی اور گارڈر ریلوے کے لگے تھے۔

اس شخص نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دی تھی، اس واسطے کہ بچّہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک روز اس گھر میں دوسری بیوی آگئی۔ اسے وہ اُسی

طرح لایا تھا جس طرح ریلوے کا اور بلٹیوں کا سامان اُڑا کر لے آتا تھا۔ لوگوں نے مشہور کیا کہ یہ عورت ہندو ہے اور یہ شخص اسے بھگا لایا ہے۔ اُس وقت عورت جوان اور شکل دار تھی۔ وہ اپنا نام نصرت بیگم بتاتی تھی۔ خُدا نے اس شخص کو حرام خوری کی یہ سزا دی کہ اس کی حویلی کو بچوں کی رونق عطا نہ کی۔ نصرت بیگم کی گود خالی رہی۔ اسے عورتوں نے بہت دفعہ کہا کہ وہ کسی خانقاہ پہ جاتے، کسی پیر فقیر کے پاس جاتے، کسی درگاہ پہ نذر نیاز دے، شاید کسی کی دعا لگ جاتے لیکن اُس نے کسی کی نہ مانی۔ پھر لوگوں نے اس کو بدنام کر دیا کہ بد دعا تی ہوتی ہے۔ کسی پیر کو نہیں مانتی۔ اس نے محلّے میں کسی کے ساتھ میل ملاقات بھی نہیں رکھا، نہ کسی کے بھلے میں نہ بُرے میں۔

اس کا خاوند نوکری ختم کر کے آگیا۔ ریلوے سے اُسے بہت پیسہ ملا اور تین چار سال بعد وہ مر گیا۔ نصرت بیگم پہلے ہی اکیلی رہنے کی عادی تھی۔ بیوہ ہو کر وہ گھر میں قید ہو گئی۔ تھوڑا عرصہ پہلے حویلی والے محلّے میں ایک جوان اور بڑی خوبصورت عورت نے ایک مکان خریدا اور اسے گرا کر پکا مکان بنا لیا۔ اُس کے ساتھ دس گیارہ سال کی عمر کا ایک بیٹا بھی تھا۔ یہ عورت فوراً ہر طرف مشہور ہو گئی، اس واسطے کہ بڑی خوبصورت تھی۔ خوبصورت تو بہت ساری عورتیں ہوتی ہیں۔ یہ عورت اس واسطے مشہور ہوتی کہ اپنی خوبصورتی سب کو دکھاتی پھرتی تھی۔ سُرخی پاؤڈر کا بہت استعمال کرتی تھی۔ اس گلی میں شکاریوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی لیکن عورت اتنی بدچلن نہیں تھی جتنی لوگوں نے مشہور کر دی تھی۔ ویسے شہرت اُس کی بہت ہوتی۔ اُس کا نام جمیلہ تھا۔

پتہ نہ پایا اور تھوڑا سا مزے سے لے کر اس بُڑھیا اور جمیلہ کی باتیں سُنا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ جمیلہ اپنے آپ کو نصرت بیگم کی بھانجی بتاتی ہے لیکن نصرت بیگم اُس کے ساتھ بھی میل ملاقات نہیں رکھتی۔ جمیلہ کے بارے میں پتہ چلا کہ شہر سے تین چار میل دُور ایک گاؤں کا بہت بڑا زمیندار تھا۔ جمیلہ اُس کی دوسری بیوی تھی اور اپنی خالہ نصرت بیگم کی طرح اُس زمیندار کی خاطر گھر سے بھاگ آئی تھی۔ زمیندار کی پہلے بھی ایک بیوی تھی۔ جمیلہ کا ایک ہی لڑکا ہوا جو

دس گیارہ سال کا ہوا تو زمیندار مر گیا۔ یہ لڑکا باپ کی جائیداد کا حصہ دار تھا، لیکن ایسا ہوا کہ جمیلہ اپنے بیٹے کے ساتھ شہر میں آگئی اور یہاں معمولی سا مکان خرید کر اسے بڑا اچھا مکان بنا لیا۔ شاید زمیندار کی پہلی بیوی کے بیٹوں نے اُسے کچھ نقد رقم دے کر چلتا کیا ہوگا۔ اس کے بیٹے کے متعلق بتایا گیا کہ اب وہ اٹھارہ انیس سال کا ہو گیا ہے اور وہ آوارہ پھرتا ہے۔ جُوا بھی کھیلتا ہے اور چرس بھی پیتا ہے۔

یہ باتیں ہنسی مذاق کے رنگ میں ہو رہی تھیں اور میں ان باتوں کو گپ شپ سمجھ کر مزے لے رہا تھا۔ بوڑھی نصرت بیگم کو سب نے وہمی اور خبطی بُڑھیا کہہ کر خارج کر دیا۔

بُڑھیا ماری گئی

اگر میں بھول نہیں رہا تو شاید تیسرے دن صبح صبح کا ذکر ہے کہ ایک آدمی غریب سی ایک مائی کو ساتھ لئے لئے تھانے میں آیا۔ میں ابھی آکر بیٹھا ہی تھا۔ اس آدمی کا نام مجھے یاد نہیں۔ بشیر نام رکھ لیں۔ اُس نے کہا۔ "ہمارے محلّے میں ایک بوڑھی عورت نصرت بیگم رہتی ہے۔ وہ گھر میں مری پڑی ہے۔" میں نے پوچھا کہ جسم پہ زخم ہیں؟ اُس نے جواب دیا — "نہیں۔ مجھے کچھ شک ہے۔"

میں نے اُسے کہا کہ اپنے شک کو اچھی طرح بیان کرے۔ اُس کے ساتھ جو بوڑھی مائی تھی، اُس نے بھی کچھ باتیں بتائیں۔ بشیر ساٹھ سال کے لگ بھگ عمر کا تعلیم یافتہ شخص معلوم ہوتا تھا۔ اُسے میں ٹال نہیں سکتا تھا۔ اُس نے اور مائی نے اس طرح بات سُنائی کہ مائی نصرت بیگم کے گھر ہر صبح جایا کرتی تھی اور کوئی کام کاج ہو تو کر دیتی تھی یا نصرت بیگم کا جسم دابتی تھی۔ اس نے صبح دیکھا۔ نصرت بیگم کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اُس نے تین چار دفعہ دروازے پہ زور زور سے ہاتھ مارے لیکن دروازہ نہ کھُلا۔ مائی چلی گئی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد پھر گئی۔ دروازہ ابھی تک اندر سے بند تھا۔ اُس وقت

نصرت بیگم بازار جایا کرتی تھی۔ مائی نے زور زور سے دروازہ بجایا لیکن اندر سے کسی نے نہ کھولا۔

مائی کو شک ہُوا کہ نصرت بیگم بیمار ہو گی۔ وہ دروازے کے سامنے کھڑی سوچ رہی تھی کہ کیا کرے کہ بشیر بازار کی طرف سے آگیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اکیلا شخص ہے جس کے ساتھ نصرت بیگم کی میل ملاقات ہے۔ سبب اس کا یہ تھا کہ نصرت بیگم کا خاوند بشیر کا دوست تھا۔ وہ مر گیا تو بشیر نصرت بیگم کی خبرگیری کرتا رہتا تھا۔ نصرت بیگم اُسے روزانہ بازار میں ملتی تھی۔ اُس دن وہ بازار میں نظر نہ آئی۔ یہ معمول کے خلاف تھا۔ بشیر بازار سے آیا تو مائی کو کھڑا دیکھا۔ اُس سے نصرت بیگم کا پُوچھا۔ مائی نے اس کو خبر دی کہ وہ دو دفعہ آچکی ہے۔ اندر سے دروازہ نہیں کُھلتا۔

بشیر کو معلوم تھا کہ کل تک نصرت بیگم کو کوئی تکلیف نہیں تھی۔ آج اتنی بیمار ہو گئی ہے کہ اُٹھ کر دروازہ بھی نہیں کھول سکتی۔ بشیر کا مکان حویلی سے تیسرا تھا۔ وہ مائی کو ساتھ لے کر اپنے گھر گیا اور اُوپر جا کر چھتوں سے نصرت بیگم کے گھر میں اُترا۔ اندر جا کر دیکھا وہ تو مری ہوئی تھی۔ اُس کا مُنہ کھلا ہُوا اور آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ بشیر کو شک ہُوا کہ اُسے قتل کیا گیا ہے۔ اُس نے تھانے میں رپورٹ دینا اپنا فرض سمجھا۔

کسی کے ذرا سے شک پر کوئی بھی تھانیدار قتل کا پرچہ چاک نہیں کر دیتا۔ متوفیہ بوڑھی تھی۔ وہ ہارٹ فیل ہونے سے مری ہو گی۔ کسی اور بیماری کا اچانک حملہ ہُوا ہو گا۔ مَیں نے بشیر اور مائی سے کہا کہ مَیں ان سے جان چھڑانے کی کوشش نہیں کرتا لیکن وہ میرا اطمینان نہیں کر سکے۔ بشیر نے کہا "جنابِ عالی! مَیں کسی جھمیلے میں پڑنے سے ڈرتا ہوں لیکن دوستی کا حق ادا کرنا بھی فرض سمجھتا ہوں۔ مجھے ایک شک ہے۔ نصرت بیگم امیر عورت تھی۔ ہو سکتا ہے اس نے گھر میں کوئی رقم رکھی ہوئی ہو اور اس کا کسی کو پتہ چل گیا ہو۔"

"مَیں نے سُنا ہے کہ اُس کی ایک بھانجی ہے جو اپنے بیٹے کے ساتھ

اکیلی رہتی ہے" — مَیں نے کہا — "اور یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اس بھانجی کا بیٹا آوارہ نوجوان ہے۔ ان کے متعلق آپ کو کچھ پتہ ہے؟"

"میرا خیال ہے جمیلہ جو نصرت بیگم کی بھانجی ہے ایسی سنگین حرکت نہیں کر سکتی" — بشیر نے کہا — "ایک بات کا خیال آتا ہے۔ جمیلہ کا بیٹا قدرت نصرت بیگم کے پاس کبھی کبھی آتا تھا اور نصرت بیگم کو اس لڑکے سے پیار تھا۔ مَیں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ یہ لڑکا جسے سب آوارہ اور بدمعاش کہتے ہیں، نصرت بیگم کی بہت خدمت کرتا تھا۔ جمیلہ اچھے اخلاق کی عورت نہیں لیکن میرے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ مَیں اُسے بدچلن کہوں۔ بنی ٹھنی رہتی ہے اور اُس کی باتیں شریف عورتوں جیسی نہیں۔ شک کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ کوئی ایک مہینے سے نصرت بیگم مجھے بتا رہی تھی کہ وہ باہر تالہ لگا کر بازار جاتی ہے لیکن واپس آکر دیکھتی ہے کہ گھر کی کچھ چیزیں اُلٹ پلٹ کی گئی ہیں۔ اُس کی غیر حاضری میں کوئی اُس کے گھر میں آتا ہے۔ مَیں اسے اُس کا وہم سمجھتا رہا۔"

مَیں نے اُس مائی کو جو بشیر کے ساتھ آئی تھی، باہر بھیج دیا اور بشیر سے پوچھا کہ یہ مائی کیسی ہے؟ مجھے شک تھا کہ اس مائی نے گھر بھیدی کا کام نہ کیا ہو۔ بشیر نے کہا کہ یہ تو مری مٹی سی عورت ہے اور محلے میں نیک نام بھی ہے۔ مجھے یہ خیال آگیا کہ مَیں نے ابھی یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ نصرت بیگم کس حال میں مری ہے اور مَیں نے ایک ایسے شخص کے ساتھ تبادلۂ خیالات شروع کر دیا ہے جو پولیس کا آدمی نہیں۔ بشیر بے شک عزت دار آدمی تھا اور تعلیم والا بھی تھا لیکن بعض آدمی پنشن پر گھر آکر فارغ ہوتے ہیں تو ہر کسی کے کام میں ٹانگ اڑاتے پھرتے ہیں۔ مَیں نے بشیر کو بھی ایسا ہی آدمی سمجھا لیکن وہ ایک اطلاع لایا تھا۔ مجھے کچھ نہ کچھ حرکت کرنی چاہیے تھی تاکہ پبلک کا کوئی شخص یہ نہ کہے کہ پولیس اپنا کام نہیں کرتی۔ مَیں نے اُسے کہا کہ مجھے نصرت بیگم کے گھر لے چلو۔

عورت مالدار تھی

وہاں جاکر دیکھا۔ نصرت بیگم کا کمرہ عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ باہر کچھ آدمی کھڑے تھے۔ بشیر اور ماتی دوسرے لوگوں کے کوٹھوں سے گزر کر نصرت بیگم کے گھر میں اُترے تھے اس واسطے یہ اطلاع سارے محلّے کو مل گئی کہ نصرت بیگم مر گئی ہے۔ اب میں کیا کر سکتا تھا۔ کسی کے پاؤں کا نشان یا کوئی اور سراغ نہیں مل سکتا تھا۔ کمرے اور صحن میں عورتوں کا شور ایسا تھا جیسے بہت سارے کوّے ایک جگہ جمع ہو گئے ہوں۔ پولیس کو دیکھ کر ایسی خاموشی ہو گئی جیسے سارے کوّے اُڑ گئے ہوں۔

میں نے لاش دیکھی۔ چہرہ دیکھتے ہی مجھے شک ہو گیا کہ معاملہ گڑبڑ والا ہے۔ یہ تجربے کی بات ہے۔ میں لفظوں میں نہیں سمجھا سکتا کہ گڑبڑ والا چہرہ کس طرح کا ہوتا ہے۔ پولیس کے پرانے آدمی ذرا غور سے دیکھیں تو پہچان لیتے ہیں۔ لاش کی ٹھوڑی تک رضائی تھی۔ میں نے رضائی ہٹائی۔ نصرت

گھر میں غنڈوں کی طرح ہنگامہ کر کے پیسے لے جاتا تھا۔ وہ کونسا کام ہے جو وہ باہر نہیں کرتا تھا۔ ہم بہنیں تو اُس سے ڈرنے لگی تھیں۔ وہ گھر آتا تھا تو ہم تینوں کمرے میں چھپ جاتی تھیں۔

تین سال بعد ابّا جان کی نوکری ختم ہو گئی۔ اُن کی پنشن کُل بیچانوے روپے تھی۔ یہ بھی پورا ایک سال نہ ملی۔ ہم نے یہ سال کس طرح گزارا؟ ہمارے خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ چھوٹی بہن کو سکول سے اٹھا دیا۔ اُس سے بڑی دسویں میں تھی۔ سکول والوں کی منت سماجت کر کے فیس معاف کرائی۔ گھر میں سلائی کی مشین تھی۔ ہم چوری چھپے کچھ گھروں سے سلائی کا کام لے آتیں اور اس سے دال روٹی چلاتی تھیں۔ چوری کام لانے کی وجہ یہ تھی کہ میرے والدین کی سفید پوشی میں فرق آتا تھا۔ رسّی جل گئی تھی، بَل نہیں گیا تھا۔ ہم سب کو جلنے کے بعد بھی اپنے بَل قائم رکھنے پڑتے ہیں کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ اس گھر کی عورتیں دوسروں کا کام کرتی ہیں۔ میرے والدین کو اپنی گردن اُونچی رکھنے کی ضرورت اس لیے بھی زیادہ درپیش تھی کہ وہ اپنی بیٹیوں کو اچھے گھروں میں بیاہنا چاہتے تھے، مگر یہ تو اب ایک خواب تھا جو وہ دیکھ رہے تھے۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ مجھے دیکھ کر اُن کی آہ نکل جاتی تھی۔

ان تین برسوں میں ہمارا بھائی ایسا غنڈہ بن گیا جو گھر میں دو تین دنوں کی غیر حاضری کے بعد آتا تھا تو ایسے لگتا جیسے یہ شخص غنڈہ ٹیکس لینے آیا ہے۔ وہ بدکاری اور بدمعاشی میں اتنی دُور نکل گیا تھا جہاں سے اُسے واپس نہیں لایا جا سکتا تھا۔ یہ ایک کڑوا گھونٹ تھا جو ہمیں نگلنا پڑا۔

ہم تینوں بہنیں سلائی، کڑھائی اور اُونی کام کر لیا کرتی تھیں۔ دال روٹی اور زندہ رہنے کی باقی ضروریات آسانی سے پُوری ہو جاتی تھیں۔ نہایت ٹیڑھا مسئلہ ہماری شادیوں

بیگم کی گردن لمبی تھی۔ میں نے دیکھتے ہی بشیر کی طرف دیکھا اور سر ہلا کر اُسے بتایا کہ اُس کا شک صحیح نکلا۔ شہ رگ اور ٹھوڑی کے بالکل نیچے گردن پر ایک نیلا دھبّہ تھا — بڑھیا کو شہ رگ پر انگوٹھا رکھ کر مارا گیا تھا۔

میں لاش کے باقی جسم کا معائنہ کر رہا تھا۔ تشدّد کا اور کوئی نشان نہیں مل رہا تھا۔ جسم اکڑ چکا تھا۔ اس حساب سے اُسے مرے ہوئے دس بارہ گھنٹے ہو گئے تھے۔ یہ میرا فضول سا اندازہ تھا۔ صحیح اندازہ ڈاکٹر نے بتانا تھا۔

"تھانیدار صاحب!" — اپنے قریب مجھے ایک عورت کی آواز سنائی دی — "آپ کیوں آتے ہیں؟ میری خالہ کو کیا ہوا ہے؟"

میں نے اُسے دیکھا۔ وہ اپنی خالہ کی لاش پر سرخی پاؤڈر لگا کر کھڑی تھی۔ اگر وہ پہلے ہی بنی ٹھنی ہوتی تھی تو اسے مُنہ دھو کر آنا چاہیئے تھا کیونکہ اُس کی خالہ مر گئی تھی۔ میں نے آہستہ سے اُسے کہا "تم جمیلہ ہو؟" — اُس نے اس طرح مجھے دیکھا جیسے میں نے کوئی پہیلی بُوجھ لی ہو۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ مسکرانے کا موقع نہیں تھا۔ وہ شاید اس واسطے خوش ہو گئی تھی کہ شہر کا کوتوال بھی اُسے جانتا ہے۔ جس طرح پرتاپ اور نُور نے مجھے بتایا تھا وہ اُسی طرح خوبصورت تھی۔ اُس کی عمر پنتیس چھتیس سال تھی لیکن سُرخی پاؤڈر کی وجہ سے وہ جوان نظر آتی تھی۔ میں نے اُسے بتایا کہ تمہاری خالہ کو قتل کیا گیا ہے۔

اُس نے حیرانی سے مجھے دیکھا اور اُس کے منہ سے آہستہ سے نکلا۔
"قتل، خالہ قتل ہوگئی ہے؟" ——— مَیں نے جو چیز دیکھی وہ یہ تھی کہ اُس کی آنکھیں خشک تھیں۔ مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ خالہ کے ساتھ اس کی میل ملاقات بہت کم تھی۔ یہ سبب ہو سکتا تھا کہ اُسے خالہ کی موت کا اتنا دُکھ نہیں تھا جتنا ہونا چاہیئے تھا۔ مَیں نے اُسے کہا کہ مَیں لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا رہا ہوں۔ اِدھر سے فارغ ہو کر اُس سے کچھ پُوچھوں گا۔

"مَیں آپ کو کیا بتا سکتی ہوں" ——— اُس نے کہا ——— "مَیں اس گھر میں کبھی آئی ہی نہیں، نہ خالہ مجھ سے یا کسی اور سے ملتی تھی۔"

مَیں نے اُسے باہر بھیج دیا اور ہیڈ کانسٹیبل نُور احمد کو جو میرے ساتھ آیا تھا، کہا کہ وہ پوسٹ مارٹم کا انتظام کرے۔ لاش کی برآمدگی اور اسے قبضے میں لینے کے لئے کاغذ تیار کرنے پڑتے ہیں۔ ان پر گواہوں کے دستخط لینے پڑتے ہیں۔ مَیں نے یہ ساری کارروائی کر کے لاش ہسپتال بھجوا دی اور باہر کے لوگوں کو گھر سے باہر نکال کر خانہ تلاشی شروع کر دی۔ نصرت بیگم سلیقے والی عورت معلوم ہوتی تھی۔ گھر کا سارا حال اور ناک نقشہ امیروں والا تھا اور صاف سُتھرا۔ اس طرح نہیں لگتا تھا کہ چیزیں اور برتن وغیرہ بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر پڑے ہوں۔

لاش ایک کانسٹیبل کی نگرانی میں محلے کے چار آدمی چارپائی پر اُٹھا کر لے گئے۔ ہیڈ کانسٹیبل نور احمد میری مدد کے لئے میرے ساتھ رہا۔ پولیس مشین کی طرح خانہ تلاشی لیا کرتی ہے، یعنی آنکھیں باندھ دو تو بھی پولیس والے گھر کی تلاشی لے لیتے ہیں۔ انہیں ٹریننگ اور مشق ہوتی ہے اور کانسٹیبلوں کو کوئی اپنی پسند کی چیز جیب میں ڈال لینے کی بھی مشق ہوتی ہے۔ گھر والوں کو پتہ بھی نہیں چلنے دیتے۔ نورا ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے کر ایک کمرے میں غائب ہو گیا۔ مَیں نے اُسے کہہ دیا تھا کہ یہ ایک بیوہ کا گھر ہے، کوئی حرام خوری نہ ہو لیکن نُورے کی مسکراہٹ سے مجھے شک ہوتا تھا کہ اُس پر میری ہدایت کا اثر نہیں ہُوا۔ اُسی نے مجھے بتایا تھا کہ اس حویلی میں سب مال ریلوے کا ہے

اور حویلی بھی حرام مال سے بنی ہے۔

مَیں نے اُس کمرے کی تلاشی لینی شروع کی جس میں لاش تھی۔ ایک خوبصورت میز تھی جس کے سامنے سنگار میز کی طرح بڑے سائز کا آئینہ بھی لگا ہُوا تھا۔ مَیں نے اس کی دراز کھولی تو ایک پرس نکلا۔ اسے کھولا۔ اس میں ساٹھ روپے اور تھوڑے سے آنے پیسے تھے۔ یہ بڑا پرس تھا۔ اس میں ڈاکخانے کی ایک پاس بُک بھی تھی۔ کھول کر دیکھی۔ آخری بیلنس سنتالیس ہزار روپیہ تھا۔ اگر اسے آج کے حساب کتاب سے دیکھیں تو رقم آج کے پانچ لاکھ کی مالیت کی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں گوشت آٹھ آنے سیر ہُوا کرتا تھا اور خالص دُودھ چھ آنے سیر بھی مل جاتا تھا اور چار آنے سیر بھی۔

بڑھیا صحیح معنوں میں دولت مند تھی۔ پہلا شک یہ تھا کہ مقتولہ کے قتل کا سبب روپیہ پیسہ تھا، اس واسطے مَیں نے پاس بُک کو دیکھنا شروع کر دیا کہ رقمیں کس طرح نکلوائی گئی ہیں۔ اُس وقت عام لوگ ڈاکخانوں میں پیسے جمع کرایا کرتے تھے۔ بنکوں کی شہرت بہت کم تھی۔ مقتولہ نے چار روز پہلے آخری رقم دو ہزار روپیہ نکلوائی تھی۔ مَیں آپ کو ایک بار پھر بتا دوں کہ آج کل دو ہزار روپیہ کوئی رقم ہی نہیں سمجھی جاتی۔ اُس زمانے میں اس طرح مان لیں کہ یہ رقم دس گیارہ ہزار تھی۔ اس سے پہلے مقتولہ ہر مہینے کی پہلی یا دو تاریخ کو کبھی دو سَو روپے، کبھی سوا دو سو اور کبھی اڑھائی سو روپے نکلواتی رہی تھی۔ یہ اُس کا ماہوار خرچ تھا۔ اتنی زیادہ رقم یعنی دو ہزار روپیہ اُس نے پہلی بار نکلوایا تھا۔ یہ رقم اس کے گھر میں ہونی چاہیئے تھی۔ اگر گھر میں نہیں تو اُس نے کسی کو قرض دے دی ہوگی۔ مجھے وہم ہونے لگا کہ یہی دو ہزار روپیہ بڑھیا کی موت کا سبب بنا ہے۔

مَیں نے ہیڈ کانسٹیبل نور احمد سے کہا کہ وہ کوئی ٹرنک یا سُوٹ کیس نہ کھولے۔ مجھے ان لوگوں پر اعتبار نہیں تھا۔ میز کے دراز سے چابیاں مل گئیں۔ مَیں نے ٹرنک کھولے۔ بشیر بطور گواہ اور رپورٹ کنندہ میرے ساتھ تھا۔ مَیں نے نمبردار اور محلے کے دو اور معزز آدمیوں کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ ٹرنکوں میں سے زیورات تو نکلے، رقم کہیں سے بھی نہ ملی۔ مَیں نے ابھی

ان لوگوں کو نہیں بتایا تھا کہ میں کیا ڈھونڈ رہا ہوں۔ جب رقم کا نشان بھی نہ ملا تو ویسے ہی میرے منہ سے نکل گیا —— "یہ دو ہزار روپیہ کہاں گیا!؟"

وہ گھر سے بھاگ آئی

بشیر نے میرے پہلو کے قریب آ کر میری ران پر انگلی ماری۔ میں سمجھ گیا کہ وہ علیحدگی میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ باقی سب آدمی جو اندر میرے ساتھ تھے، ہندو تھے۔ میں اُن پر ظاہر کئے بغیر بشیر کو دوسرے کمرے میں لے گیا۔ اُس نے کہا "اگر آپ یہ دو ہزار روپیہ تلاش کر رہے ہیں جو پاس بک میں لکھا ہے، تو یہ آپ کو نہیں ملے گا۔ یہ مسلم لیگ کے فنڈ میں چلا گیا ہے۔ اس کی رسید میرے پاس ہے۔ میں ان لوگوں کے سامنے اس واسطے یہ بات نہیں کرتا تھا کہ یہ ہندو ہیں۔ آپ کو سب حال معلوم ہے مسلمانوں کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ یہاں بادشاہی ہندوؤں کی ہے۔ روپیہ پیسہ اُن کے پاس ہے۔ وہ الیکشن میں مسلمانوں کو بھی اپنی طرف گھسیٹ رہے ہیں۔ مسلم لیگ نے پاکستان کے واسطے اپنا امیدوار کھڑا کیا ہے۔ اگر مسلمانوں کی یہ سیٹ کانگرس کا امیدوار لے گیا تو ہمارے لئے بہت بُرا ہو گا۔ شہر کے مسلمانوں نے مسلم لیگ فنڈ کو اپنی اپنی توفیق سے بڑھ کر چندہ دیا ہے۔ نصرت بیگم نے مجھے ڈاکخانے میں ساتھ لے جا کر دو ہزار روپیہ نکلوایا اور مجھے دیا تھا کہ مسلم لیگ کے دفتر میں دے آؤ۔ وہ گھر آ گئی اور میں دو ہزار روپیہ شیخ عبدالودود صاحب کو دے آیا۔ آپ شیخ صاحب کو جانتے ہوں گے۔ انہوں نے رسید کاٹ دی۔ میں نے آ کر رسید نصرت بیگم کو دی تو اس نے کہا، میں رسید کو کیا کروں گی۔ میں نے خدا کو اُدھار تو نہیں دیا۔ جناب! وہ رسید میرے گھر میں ہے۔ اسی کے نام کی ہے۔ آپ حکم کریں تو لا دوں۔"

اللہ میرا شاہد ہے کہ میرا دماغ پھر گیا۔ اس واسطے پھر گیا کہ نصرت بیگم کو میں بہت معمولی عورت سمجھا تھا جو جوانی میں ایک آدمی کے پیچھے گھر سے

اس واسطے بھاگ آئی تھی کہ یہ شخص حرام خوری سے دولت اکٹھی کر رہا تھا، لیکن بشیر کی بات سن کر یہ عورت میرے واسطے محترمہ فاطمہ جناح بن گئی۔ بشیر نے اُسی وقت مجھے اپنے گھر سے رسید لا کر دے دی۔ میں نے رسید پر نصرت بیگم کا نام پڑھا۔ میں دو منٹ اس نام کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ مسلم لیگ کو اتنی زیادہ رقم نہ دیتی تو اُسے کون پکڑ سکتا تھا۔ وہ علاقہ پاکستان کو نہیں مل سکتا تھا۔ وہ پاکستان کی سرحد سے بہت ہی دُور ہے لیکن نصرت بیگم اسلام کی شیدائی معلوم ہوتی تھی۔

میں نے اس کے بارے میں تفتیش کے دوران بشیر سے جو کچھ معلوم کیا تھا وہ ابھی آپ کو بتا دیتا ہوں۔ وہ کمال پور سے ستر بہتر میل دُور کے ایک کمال پور جیسے قصبے کی رہنے والی تھی۔ اُس نے اب آخری عمر میں بشیر کو سنایا تھا کہ وہ اس خاوند کے ساتھ کس طرح آئی تھی۔ نصرت بیگم کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ یہ شخص جو بعد میں اُس کا خاوند بنا، اُسی شہر میں ملازم تھا۔ بشیر نے بتایا کہ وہ ایکسٹرا آدمی تھا اور شکل دار بھی تھا۔ وہاں اُس کی دوستی نصرت بیگم کے رشتہ داروں سے ہو گئی۔ اُن کے گھروں میں آنا جانا ہو گیا اور نصرت بیگم سے ملاقات ہو گئی۔ یہ امیر زمینداروں کا خاندان تھا۔ نصرت بیگم کی منگنی ایک زمیندار کے بیٹے سے ہو گئی جو شرابی کبابی تھا اور طوائفوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا تھا۔ یہ نصرت بیگم کو منظور نہ تھا۔ اُس کا دل اس شخص سے لگ گیا تھا۔ اُس نے اسے بتایا۔ اس شخص نے اُسے کہا کہ وہ ریلوے سے اتنا کما رہا ہے جتنا جاگیردار جاگیروں سے کماتے ہیں۔ نصرت بیگم نے اسے کہا کہ اُسے دولت نہیں چاہئے شریف خاوند چاہیئے جو صرف اُس کا ہی ساتھی بن کر رہے۔

اس شخص نے اُسے کہا کہ وہ اس کا شریف خاوند بنے گا۔ دونوں نے معاملہ طے کر لیا۔ اس شخص نے اُوپر کسی کو رشوت دے کر کمال پور میں تبادلہ کرا لیا اور نصرت بیگم کو ساتھ لے آیا۔ میں بہت حیرت میں ہوں کہ نصرت بیگم کو تلاش کرنے کوئی نہ آیا۔ انہیں شاید اس شخص پر شک نہیں ہو گا۔ نصرت بیگم نے یہاں کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے۔ شاید اس واسطے سب کہتے

تھے کر ہندو سے۔ اُس نے بشیر کو آخری دنوں میں بتایا تھا کہ اس شخص کے ساتھ شادی کر کے اُسے معلوم ہُوا کہ یہ ریلوے کا اور لوگوں کا مال ہضم کر رہا ہے اور اسی ذریعے سے وہ جاگیرداروں کی طرح دولت کما رہا ہے تو نصرت بیگم کو یہ بہت بُرا لگا۔ اُس نے خاوند سے کہا کہ اُسے ایسی دولت نہیں چاہیئے۔ اُسے شریف خاوند اور پیار کرنے والا خاوند چاہیئے۔ اُس نے بے شک بڑے امیر زمیندار گھر میں شہزادیوں کی طرح پرورش پائی تھی لیکن اُسے بدی اور بدکاری سے نفرت تھی۔

خاوند پکا حرام خور تھا۔ وہ باز نہ آیا۔ نصرت بیگم نے اس لحاظ سے اچھی زندگی نہیں گزاری۔ خُدا نے اولاد بھی نہ دی۔ نقص خاوند میں تھا۔ نصرت بیگم گھر سے بھاگی ہوئی تھی۔ اُس کا کوئی اور ٹھکانہ نہیں تھا۔ خاوند نے اس کو پیار محبت بہت دیا اور اس کی بہت خدمت کی۔ عیش عشرت نہیں کی۔ حرام کا کمایا، حلال کا کمایا، سب نصرت بیگم کے آگے رکھ دیا۔ نصرت بیگم نے سنبھال لیا لیکن خوش نہیں ہوئی۔ پھر خاوند اپنی گزار کر مر گیا۔ اُس نے سارا پیسہ نصرت بیگم کے نام ڈاک خانے میں جمع کرا دیا تھا۔ باقی زیور بنا کر اُسے دے دیا تھا۔

یہ باتیں سُن کر مجھے نصرت بیگم کے قتل کا بہت افسوس ہُوا۔ یہ تو میری اپنی ماں بہن قتل ہو گئی تھی۔ ایک عظیم عورت کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔ میرا خون گرم ہو گیا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ جو آگے آئے گا اُسے پھانسی دلاؤں گا۔

سب سے پہلے تو مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ قتل کا سبب کیا تھا۔ قتل کی واردات ہو جائے تو سب سے پہلے سبب معلوم کیا جاتا ہے۔ سبب کئی ہوتے ہیں۔ دشمنی، ڈاکہ، رقابت، کسی لڑکی لڑکے کے رشتے کا معاملہ، جائیداد کا تنازعہ اور ایسے بہت سے سبب ہوتے ہیں۔ اس کا پتہ چل جانے سے مجرم کا سراغ لگانا ذرا آسان ہو جاتا ہے۔ یہاں معاملہ کچھ اور تھا۔ ٹرنکوں میں سونے کے زیورات موجود تھے۔ کسی بھی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا گیا تھا۔ پاس بُک بھی موجود تھی۔ اگر مقتولہ بہت پہلے قتل ہوتی ہوتی تو یہ سبب ہوتا کہ اس کے ماں باپ کو اب پتہ چلا ہے کہ وہ گھر سے بھاگ کر یہاں آگئی ہے، اس واسطے انہوں نے غیرت میں آ کر

اسے قتل کر دیا۔ اب تو وہ بہت بوڑھی ہو چکی تھی۔ اُس کے ماں باپ مر کر خاک ہو چکے تھے۔

میں نے ان معزز اشخاص سے جو میرے ساتھ تھے اور نمبردار سے کہا کہ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ مقتولہ کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ محلے کی عورتوں سے معلوم کریں اور مجھے تھانے میں آکر بتائیں کہ اس واردات میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے اور قتل کا سبب کیا ہے۔ ان لوگوں کو کچھ اور باتیں کہہ سُن کر میں نے بشیر سے کہا کہ وہ بھی کچھ اور سراغرسانی کرے اور مجھے تھانے میں ملے۔ جمیلہ بھی وہیں تھی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ گھر چلی جائے۔ میں اُسے شاید تھانے بلاؤں۔ میں نے حویلی کو تالہ لگا کر سر بمہر کرنے کا انتظام کیا اور مائی کو ساتھ لے کر میں تھانے چلا گیا۔ اس مائی سے مجھے اُمید تھی کہ کوئی سراغ مل جائے گا۔

ماں بدمعاش، بیٹا چرسی

تھانے لے جا کر میں نے مائی سے کہا کہ وہ بالکل نہ ڈرے اور وہ جو کچھ بھی جانتی ہے بتا دے تاکہ میں قاتل کو پکڑ سکوں۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ نصرت بیگم کیسی عورت تھی۔ اُس کے آنسو نکل آئے اور اُس نے کہا — "آپ کو کیا معلوم آج کتنے بچے بے آسرا ہو گئے ہیں۔ میرا بڑھاپا بیگم صاحبہ کے آسرے پر گزر رہا تھا۔ وہ غریب گھروں کے چار پانچ بچوں کا خرچ ہر مہینے انہیں دیا کرتی تھی۔ میں آپ کو اور کیا بتاؤں کہ بیگم صاحبہ کیسی عورت تھیں۔ آپ کہتے ہیں تو میں مان لیتی ہوں کہ بیگم صاحبہ کو کسی نے قتل کیا ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ ایسی عورت کو کوئی بھی قتل نہیں کر سکتا۔"

اس طرح کی مائیاں گھروں کے اندر کے حالات، بلکہ عورتوں کے دلوں کے حالات بھی جانتی ہیں۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس کے دماغ میں کیا آتی ہے کہ اُسے کس نے قتل کیا ہو گا۔

"اگر دشمنی کی بات کرتے ہو تو میں اُس کی بھانجی کا نام لوں گی" — مائی

نے کہا — "اس کا نام جمیلہ ہے۔ محلے میں اُسے جمیلو کہتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کہا کرتی تھیں کہ مجھے اس عورت کی صورت زہر لگتی ہے۔"

"دشمنی کی وجہ کیا تھی؟" — میں نے پوچھا — "کیا جمیلہ، بیگم کی سگی بھانجی ہے؟"

"جمیلو، بیگم صاحبہ سے کبھی کبھی پیسے مانگا کرتی تھی" — مائی نے کہا — "بیگم صاحبہ نہیں دیتی تھیں۔ وہ بیگم صاحبہ کی سگی بھانجی ہے۔"

"جمیلہ کے ساتھ تمہاری بھی کبھی بات ہوتی ہے؟"

"کئی دفعہ ہوئی ہے" — مائی نے بتایا — "وہ مجھے کہا کرتی تھی کہ اپنی بیگم صاحبہ سے کہو کہ اتنی دولت قبر میں لے جاؤ گی؟ کچھ رقم مجھے دے دو.... میں نے بیگم صاحبہ سے ایسی بات کبھی نہیں کی تھی۔ دو تین مہینے گزرے، جمیلو نے مجھے گلی میں جاتے دیکھ لیا اور بُلا لیا۔ اُس نے بہت باتیں کیں۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہاری بیگم مر جائے گی تو یہاں میرے سوا اس کا کون وارث ہے؟ میں ہی ہوں، پھر کمبخت پتہ نہیں مجھ سے کیوں روٹھی ہوئی ہے۔"

جمیلہ کا ایک بیٹا بھی تھا جس کے بارے میں مجھے پتہ چلا تھا کہ چرسی اور جواری ہے۔ مائی سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ وہ تو کئی کئی روز گھر ہی نہیں آتا۔ وہ ماں کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ مائی کو یہ پتہ نہیں تھا کہ ماں بیٹے کے آپس کے تعلقات کیسے ہیں۔ یہ رائے میں نے سوچی تھی کہ ماں بدمعاش ہے اور بیٹا چرسی اور جواری، اس واسطے یہ ہو سکتا ہے کہ ماں نے نصرت بیگم کی حویلی اور روپے پیسے کے واسطے اپنے بیٹے سے اُسے قتل کرا دیا ہو۔ مجھے یاد آ گیا کہ مجھے بتایا گیا تھا کہ نصرت بیگم کو اس لڑکے کے ساتھ پیار تھا اور لڑکا اُس کے گھر جایا کرتا تھا۔ اس سے میری رائے مضبوط ہو گئی۔ اِس طرح کے آوارہ نوجوان جن کو نشے اور جوئے کی لت پڑ جاتے وہ کسی کے سگے نہیں ہوتے۔ ضرور اس لڑکے نے نصرت بیگم کو ڈنک مارا ہے۔

میں نے مائی سے بہت ساری باتیں پوچھیں۔ اُس کے مُنہ سے جو بھی بات نکلی وہ جمیلہ اور اُس کے بیٹے کے خلاف تھی۔ میری رائے اور میرا شک اور زیادہ مضبوط ہو گیا۔ میں نے مائی پر بہت سارا وقت صَرف کر دیا۔ پھر اُسے کہا کہ وہ گھر چلی جائے اور کوئی پُوچھے کہ تھانیدار کے ساتھ کیا باتیں ہوئی ہیں تو بالکل نہ بتائے۔

"اکیلی ہوتی ہوں، ضرور آئیں"

سرکاری ہسپتال قریب ہی تھا۔ لاش اور پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ مقتولہ کی موت سانس کو روکنے سے واقع ہوئی ہے۔ سانس روکنے کا نشان شہ رگ پر موجود ہے۔ سانس کی نالیوں اور پھیپھڑوں کے معائنے سے پتہ چلا ہے کہ مقتولہ کی شہ رگ دبا کر سانس روکی گئی ہے۔ ڈاکٹر نے موت کا وقت آدھی رات کے بعد لکھا تھا۔ بارہ سے ایک بجے کے درمیان۔

لوگوں کو شاید معلوم نہ ہو کہ گلا گھونٹ کر کسی کو مارا جائے یا ناک اور مُنہ کسی طریقے سے بند کر کے کسی کو مارا جائے تو سانس کی نالیوں اور پھیپھڑوں کے معائنے سے ڈاکٹر بتا دیتے ہیں کہ سانس روکی گئی ہے۔ سانس کی نالیوں کی حالت قدرتی موت کی حالت سے مختلف ہوتی ہے۔

جب لاش میرے پاس آ گئی تو میرے سامنے یہ سوال آیا کہ لاش کس کے حوالے کروں۔ جمیلہ اُس کی بھانجی تھی۔ لاش اُسی کو لے جانی چاہیے تھی۔ وہ نہ لیتی تو بشیر موجود تھا۔ میں جمیلہ سے بھی کچھ پوچھنا چاہتا تھا، بلکہ وہ مشتبہ تھی، اس واسطے میں نے جمیلہ کو بُلوا بھیجا۔

وہ فوراً آ گئی۔ اُس نے کپڑے پہلے سے زیادہ بھڑکیلے پہنے ہوئے تھے اور سُرخی پاؤڈر سے چہرے کو پہلے سے زیادہ جوان بنایا ہوا تھا۔ مجھے مائی نے بتایا تھا کہ جمیلہ نصرت بیگم کی حویلی اور دولت کی باتیں کرتی تھی۔ میں نے اُس کے ساتھ یہ چال چلنے کا ارادہ کر لیا کہ اُسے شک نہ ہونے دُوں گا کہ میں اُسے مشتبہ سمجھتا ہوں۔ میں نے دوستی والا رویہ اختیار کر لیا۔ میں نے

اُسے کہا — "اب تم ہی اِس کی والی وارث ہو۔ اِس کا جو کچھ بھی تھا وہ سب تمہارا ہے۔ اس واسطے اس کی لاش بھی تم ہی لے جاؤ گی۔"

"ہاں جی! اور کون لے جائے گا" — اُس نے کہا — "خالہ کے گھر کی چابی کس کے پاس ہے؟"

"لاش اپنے گھر نہیں لے جاؤ گی؟" — میں نے کہا — "میں تمہاری عزّت کے خیال سے کہہ رہا ہوں کہ لاش اپنے گھر لے جاؤ۔ اگر تم لاش اس کے گھر لے گئیں، تو لوگ باتیں کریں گے کہ بھانجی نے اپنی خالہ کی لاش اپنے گھر میں نہیں رکھی۔ تم عزّت دار عورت ہو۔"

"ہاں، آپ نے اچھا مشورہ دیا ہے" — اُس نے کہا — "میں لاش اپنے گھر لے جاؤں گی لیکن اس کے گھر کی چابی اور ٹرنکوں کی چابیاں مجھے دے دیں۔"

میں نے اُسے بتایا کہ میں ابھی اُسے چابیاں نہیں دے سکتا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اُس کی دلچسپی اپنی خالہ کی لاش کے ساتھ ہے یا اُس کی حویلی اور مال کے ساتھ، اس واسطے میں نے حویلی اور مال کی ایسی باتیں کیں کہ اُسے اتنی جلدی نہیں مل سکتا، پھر میں یہ بھی کہتا رہا کہ سب مال و دولت اُسی کا ہے۔ اُس نے لاش کی بات ہی گول کر دی اور مجھ سے پوچھنے لگی کہ حویلی اور مال و دولت اُسے کس طرح ملے گا۔ کیا وہ حویلی پر اپنے آپ قبضہ کر لے گی یا کوئی عدالتی کارروائی ہو گی؟ میں نے اُسے کہا کہ میں اُسے سب کچھ بہت جلدی دلا دوں گا۔

اُس کا چہرہ اور زیادہ چمکنے لگا۔ وہ چونکہ کھلی عورت تھی، اِس واسطے اُس کی نیّت فوراً ظاہر ہو گئی اور میرا شک بہت پکّا ہو گیا۔ اُس نے مجھے اپنا ہمدرد سمجھ لیا۔ میں نے جو چال چلی تھی وہ کامیاب ہو گئی۔ لاش باہر پڑی تھی اور لاش کی وارث میری دوستی کا دم بھر رہی تھی۔ میں نے اُسے اچھی طرح اپنے جال میں پھانس لیا۔ اُس نے مجھے کسی اور ہی لہجے میں کہا — "کبھی میرے گھر آئیں" — اُس نے ذرا آہستہ سے کہا — "میں اکیلی ہوتی ہوں۔"

"ضرور آئیں" — میں نے اُسی کے لہجے میں کہا — "میں اِسی انتظار میں تھا کہ تم کہو تو میں آؤں۔ میں ضرور آؤں گا۔"

اُس نے کچھ سوچا اور پھر کہا — "لیکن ایک بات دل میں رکھیں۔ میں خود آپ کو یہاں آکر بتاؤں گی کہ آج آجائیں، پھر آپ آئیں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے بتائے بغیر آپ آجائیں اور میں گھر میں نہ ہوں۔"

وہ کچے اخلاق کی عورت تھی اور میں پکّا تھانیدار۔ وہ جب سوچ میں پڑ گئی تھی تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ اُس نے جب سوچ کر کہا کہ وہ مجھے بتائے گی تو میں آؤں، تو میری سوچ صحیح نکلی۔ اُس کے پاس اور بھی کوئی آتا ہوگا۔ یہ اُس کے لئے خطرناک تھا کہ میں اُس کے گھر چلا جاؤں اور وہاں کوئی اور موجود ہو۔

سبز باغوں کا حِصّہ دار

میں نے باتوں باتوں میں یاری پکی کر لی اور میں وہ باتیں پوچھنے لگا جن کا تعلق اُس کی زندگی وغیرہ کے ساتھ تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ کیسے ہوا کہ خالہ بھانجی ایک ہی شہر اور ایک ہی محلّے میں اکٹھی ہو گئیں۔ وہ اب مجھ سے کچھ بھی چھپا نہیں رہی تھی۔ میرا سوال ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ اُس نے بولنا شروع کر دیا۔ وہ بھی اپنی خالہ کی طرح گھر سے بھاگ آئی تھی اور شادی کر لی تھی۔ اُس کے خاوند کی پہلے بھی ایک بیوی تھی جس سے دو بیٹے تھے۔ اُس وقت جب جمیلہ اُس کے گھر میں آئی اُس کے خاوند کے ایک بیٹے کی عمر پندرہ سولہ سال تھی اور دوسرا اس سے دو تین سال چھوٹا تھا۔

یہ شخص جس کے پیچھے جمیلہ گھر سے نکلی تھی کمال پور سے تین چار میل دُور ایک گاؤں کا بڑا امیر زمیندار تھا اور جمیلہ کے خاندان کے ساتھ اُس کی دُور پار کی رشتہ داری تھی۔ اِسی سلسلے میں ان کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا۔ نصرت بیگم اسی واسطے گھر سے بھاگی تھی کہ اُس کی شادی ایک عیّاش آدمی کے ساتھ کی جا رہی تھی لیکن جمیلہ اس واسطے گھر سے بھاگی کہ یہ زمیندار اُسے اچھا لگا تھا۔ جمیلہ نے مجھے بتایا کہ اس شخص نے اُسے بڑے سبز باغ

دکھاتے تھے اور اُس نے جمیلہ سے کہا تھا کہ وہ اُس کے حُسن پر مَر مٹا ہے۔ جمیلہ کو یہ معلوم تھا کہ اِس شخص کی پہلے بیوی ہے جس کے بچے بھی ہیں۔ اِس شخص نے اُسے کہا تھا کہ وہ جائیداد کا وارث جمیلہ کے بچوں کو بنائے گا۔

جمیلہ نوجوان تھی۔ اُس کی شادی بال بچے دار شخص کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی۔ اُس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس شخص کے پیچھے گھر سے نکلی اور اُن کی شادی ہو گئی۔ جمیلہ نے بتایا کہ اُس کے خاوند کی پہلی بیوی نے فساد مچا دیا۔ اُس کے والدین اور بھائیوں نے جمیلہ کے خاوند کو قتل کی دھمکیاں دیں۔ جمیلہ کے والدین بھی آ گئے لیکن جمیلہ کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ مجبور ہو گئے اور لعنت ملامت کر کے چلے گئے۔ اُس کے خاوند نے مِنّت سماجت کر کے برادری کو راضی کر لیا۔ وہ کمزور آدمی نہیں تھا۔ بہت ساری جائیداد کا مالک تھا۔ اُس نے اپنی بیوی کا مُنہ بند کر دیا، لیکن گھر اور زمینداری پر راج پہلی بیوی کا ہی رہا۔

خاوند کی طرف سے جمیلہ کو کوئی تنگی تُرشی نہ ہوتی لیکن وہ ایک داشتہ کی طرح رہی کہ جس کا جائیداد اور گھر کے کسی معاملے میں دخل نہیں ہوتا۔ جمیلہ نے بتایا کہ اُسے سب سے زیادہ نقصان یہ ہُوا کہ اُس کا ایک بیٹا پیدا ہُوا۔ وہ جب بڑا ہُوا تو اُس کے ساتھ اچھوتوں والا سلوک ہونے لگا۔ پہلی بیوی کے بیٹے لڑکپن کی عمر میں تھے۔ وہ جمیلہ کے بیٹے قدرت کو مُنہ نہیں لگاتے تھے، بلکہ اُسے دُھتکارتے اور کبھی کبھی مار پیٹ بھی لیتے تھے۔ وہ اپنی ماں کے کہنے پر ایسا کرتے تھے۔ ماں نے اُنہیں سمجھا دیا تھا کہ یہ بچہ تمہاری جائیداد کا حصہ دار بنے گا۔ اِس سلوک کا قدرت پر یہ اثر ہُوا کہ وہ دوسرے بچوں کے ساتھ جا کھیلتا تھا اور وہ بچے اچھے خاندانوں کے نہیں تھے۔ بچے کو اُس عمر میں بُری عادتیں پڑ گئیں۔ اُس کا باپ پہلی بیوی کے ڈر سے اُس کا زیادہ خیال نہیں رکھتا تھا۔

قدرت دس سال کا ہُوا تو جمیلہ کا خاوند مر گیا۔ اُس وقت تک جمیلہ کے خاوند کے پہلے بیٹے اِتنے جوان ہو چکے تھے کہ دونوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اُس گھر میں اب جمیلہ کے واسطے کوئی جگہ نہیں تھی لیکن وہ مرنے

والے کی بیوی تھی۔ جائیداد میں اس کا حق بنتا تھا۔ اگر جمیلہ کا کوئی آسرا ہوتا تو وہ دعویٰ مقدمہ کر کے اپنا حق وصول کر لیتی، مگر وہاں ساری برادری اُس کے خلاف تھی۔ اُس نے تھوڑا سا شور شرابا کیا تو اُس کے خاوند کے بیٹوں نے اور اِس خاندان کے دو بڑے چوہدریوں نے جمیلہ سے کہا کہ اُس نے زیادہ شور شرابا کیا تو اُس کے بیٹے کی جان کو خطرہ پیدا ہو جائے گا، اِس واسطے اُس کی بہتری یہ ہے کہ اُسے ایک مکان شہر میں بنوا دیں گے اور کچھ نقد رقم دے دیں گے اور وہ شہر میں آباد ہو جائے، اور وہ جوان اور خوبصورت ہے۔ کسی کے ساتھ شادی کر لے۔

وہ اب اتنی جوان تو نہیں رہی تھی لیکن خوبصورت ضرور تھی۔ اُس نے اپنے خاوند کے بیٹوں کی دھمکی سمجھ لی تھی۔ حالات اور انسان اُس کے خلاف تھے۔ وہ مان گئی۔ اب وہ شہر میں جس مکان میں رہ رہی تھی یہ اُسے اُن لوگوں نے بنوا دیا تھا اور اُسے تیس ہزار روپیہ نقد اور گھر کا سامان دے دیا تھا۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ اُس کی خالہ نصرت بیگم اسی شہر اور محلّے میں آباد تھی۔ وہ بُوڑھی ہو چکی تھی۔ یہ نصرت بیگم کے قتل کے چھ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ جمیلہ یہاں آئی تھی۔ نصرت بیگم نے اُسے پہلی ملاقات میں ہی پہچان لیا تھا۔ وہ نصرت بیگم کو نہیں پہچان سکی تھی، اِس واسطے کہ نصرت بیگم بُوڑھی ہو گئی تھی۔ اس بُڑھیا نے اُسے کہا تھا کہ وہ اُس کی خالہ، نُصرت بیگم ہے۔

جمیلہ بہت خوش ہوئی لیکن بُوڑھی خالہ نے اِس کے ساتھ کوئی واسطہ نہ رکھا۔ شروع شروع میں دو تین دفعہ اسے کہا کہ شادی کرنا چاہو تو میں کرا دُوں گی۔ جمیلہ نے شادی کی طرف دھیان نہ دیا۔ وہ مجھے اپنی کہانی یہاں تک کھُل کر سُناتی رہی لیکن اس کے بعد اُس کی زبان اُکھڑ گئی۔ مَیں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھ سے اپنی دَر پردہ زندگی پردے میں ہی رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مَیں نے ایکٹنگ کی اور کہا کہ اب تم اتنی بڑی حویلی اور اِتنے سارے زیورات اور مال و اسباب کی مالک ہو گئی ہو۔ تم نے مجھے اپنا

دوست بنا کر اپنے گھر بلایا ہے۔ مجھ سے چھپانے کا کیا فائدہ؟ .... مَیں نے فلموں کی طرح عشق و محبت کے مکالمے بولے تو اُس کی زبان چل پڑی۔ اُس نے دو مسلمانوں کے نام بتا دیئے جن کی وہ در پردہ، اندھیرے میں داشتہ بنی رہی اور وہ اُسے روپیہ پیسہ دیتے رہے۔ کہتی تھی کہ اب اُن کے ساتھ اُس کا تعلق ٹوٹ چکا ہے۔

مختصر یہ کہ وہ بنی ٹھنی رہتی تھی لیکن ایسی بد نہیں تھی کہ ہر کسی کے ساتھ تعلق جوڑ لیتی۔ اُسے کسی کی محتاجی نہیں تھی۔ ماں بیٹا نصرت بیگم کی طرح گزارہ کرتے تو اُس زمانے میں تیس ہزار روپیہ ساری عمر کے لئے بہت تھا۔ وہ اپنی بوڑھی خالہ کی طرح یہ رقم ڈاکخانے میں رکھتی تو اُسے اِتنا سُود ملتا جو اُس کے ماہوار خرچ میں اُسے مدد دیتا لیکن اُس کا دماغ اُسے کسی اور طرف لے گیا تھا۔ وہ اپنی جوانی اور خُوب صُورتی کے ذریعے دوسروں کے دلوں پر راج کرنا چاہتی تھی، اسی واسطے سُرخی پاؤڈر کا استعمال زیادہ کرتی تھی۔

مَیں نے اُس سے پُوچھا کہ وہ نصرت بیگم سے پیسے مانگتی رہی ہے؟ وہ مان گئی اور کہنے لگی کہ خالہ ہر کسی کی مدد کرتی تھی، صرف اُسے کچھ نہیں دیتی تھی۔ اُس نے خالہ سے کہا کہ اُس کا بیٹا پڑھنے کی طرف توجہ نہیں دیتا، اُسے سنبھال لے۔ خالہ نے یہ مان لیا لیکن لڑکا نہ مانا۔ بعد میں لڑکا نصرت بیگم کے گھر جاتا رہا اور اُسے بتاتا رہا کہ نصرت بیگم اُس سے پیار کرتی ہے اور کبھی کبھی پیسے بھی دیتی ہے۔

اپنے لڑکے کے بارے میں اُس نے بتایا کہ اب (سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں) وہ بالکل ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اُس نے گھر سے تعلق توڑ لیا تھا۔ کبھی کبھی آجاتا تھا اور تھوڑی دیر بعد چلا جاتا تھا۔ مَیں نے جمیلہ سے پُوچھا کہ اُس کا بیٹا آوارہ بدمعاش ہو کر بھی نصرت بیگم کے گھر جاتا رہا ہے؟ اُس نے کہا کہ یہی تو میرا رونا ہے۔ وہ خالہ کے گھر آتا رہا اور اُس مائی نے جو خالہ کے گھر کام کرتی ہے، بتایا تھا کہ خالہ تمہارے بیٹے سے بہت پیار کرتی ہے۔ وہ آتا ہے تو اُسے روٹی کھلاتی ہے۔ اُسے کہتی ہے کہ نہالو۔

اُسے پیسے دیتی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ خالہ نے میرے بیٹے کو خراب کیا ہے۔ مَیں تو کہتی ہُوں کہ اِسی نے میرے بیٹے کو میرے خلاف کیا ہے اُس کے ساتھ پیار کرتی ہے تو اُسے اپنے گھر کیوں نہیں رکھ لیا تھا۔

یہ تو میں نے بھی سوچا تھا کہ اس بدقماش لڑکے کے ساتھ نصرت بیگم کے پیار کا مطلب کیا تھا۔ جمیلہ تو کچھ اور کہہ رہی تھی لیکن مجھے کچھ اور شک ہو رہا تھا۔ قُدرت نُصرت بیگم سے پیسے ہتھیانے آتا ہوگا۔ اِس بدقماش نوجوان نے بُڑھیا کو ڈرا دھمکا رکھا ہوگا۔ بُڑھیا قُدرت کو غُنڈہ ٹیکس دیتی ہو گی، مگر قتل کا معمہ میری عقل میں نہیں آ رہا تھا۔ اگر قُدرت قاتل ہوتا تو ٹرنکوں میں زیورات نہ ہوتے۔ یہ ممکن تھا کہ مقتولہ نے گھر میں رقم رکھی ہُوئی ہوگی۔ قُدرت اُس سے یہ مانگتا ہوگا جو بُڑھیا نے اُسے نہ دی۔ اُس نے بُڑھیا کو قتل کر دیا اور رقم لے گیا۔ اُسے زیورات سے ڈر ہوگا کہ بیچنے پکڑا جائے گا۔

مَیں نے جمیلہ سے پُوچھا کہ اُسے معلوم ہے کہ قُدرت کہاں ہے؟

"نہیں" ــــ جمیلہ نے جواب دیا ــــ "وہ پندرہ سولہ دن ہُوئے گھر آیا تھا، پھر نظر نہیں آیا۔"

پاکستان بن کے رہے گا

مَیں قارئین حضرات سے ایک عرض کرنا چاہتا ہوں۔ واردات اور تفتیش کی کہانی اگر پوری لکھی جاتے تو ایک کتاب بنتی ہے۔ مثلاً پولیس مشتبہ سے تفتیش اور جرح کرتی ہے تو ایک ایک مشتبہ کے ساتھ پُوری پُوری رات گُزر جاتی ہے۔ مخبر کوئی رپورٹ دیتے ہیں، تو وہ بہت لمبی ہوتی ہے۔ اگر تھانیدار پُورا بیان تحریر کرے کہ اُسے فلاں شک کیوں ہُوا تو اُس کے لئے بہت سارے صفحے درکار ہوتے ہیں۔ یہ سارے حال احوال نہیں لکھے جا سکتے۔ بات مختصر کر کے سُنانی پڑتی ہے، نہیں تو آپ کا پورا پرچہ ایک ہی کہانی سے بھر جاتے۔ اِس مختصر کی ہُوئی کہانی

سے پڑھنے والے کو یہ شک ہو سکتا ہے کہ یہ تو ایسے ہی گپ ملا لی گئی ہے۔ آپ ایسا نہ سمجھیں۔ مختصر بات سے کسی شک میں نہ پڑیں۔ جُرم کی کہانی میں موٹی موٹی اور بہت ضروری باتیں لکھی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر جمیلہ میرے پاس تین گھنٹے بیٹھی رہی، لیکن میں نے بات اتنی تھوڑی سنائی ہے جیسے وہ دس پندرہ منٹ بیٹھی ہو گی۔

میں نے اُسے لاش دے دی۔ وہ اس خوشی میں لاش لے گئی کہ وہ مقتولہ کی وارث ہے اور اب وہ امیر عورت بن گئی ہے۔ اُس نے جاتے جاتے پھر پوچھا کہ میں اُسے حویلی اور ٹرنکوں کی چابیاں کب دُوں گا۔ وہ چلی گئی اور اپنے خلاف اور اپنے بیٹے کے خلاف میرے دل میں شک چھوڑ گئی۔ میں نے اُس کی مخبری کا انتظام ایسا کیا کہ دن اور رات اُس کے گھر پر نظر رہے۔ جُونہی کوئی اُس کے گھر میں جاتے تھانے اطلاع دی جاتے۔ اگر محلے سے کہیں باہر جاتے تو اُس کا پیچھا کیا جاتے کہ کہاں گئی ہے۔ پولیس کے واسطے یہ انتظام مشکل نہیں ہوتا۔ آپ نے بھائی احمد یار خان کی کہانیوں میں پڑھ لیا ہے کہ مخبری کون لوگ کرتے ہیں۔ ان میں چرسی بھنگی بھی ہوتے ہیں اور شہر کے معزز آدمی بھی ہوتے ہیں۔ اُن کی بیویاں اور گھروں میں نوکری کرنے والی مائیاں بھی مخبری کرتی ہیں۔

میں نے جمیلہ کے بیٹے قدرت کو بلانے کے لئے ہیڈ کانسٹیبل نور احمد سے کہا۔ اُس نے اُسے شام تک تلاش کیا۔ وہ نہ ملا۔ قبرستان کے ملنگوں سے پتہ چلا کہ کل رات آیا تھا۔ معلوم نہیں اب کہاں ہو گا۔ وہ سارے شہر میں نہ ملا۔ اِس سے مجھے شک ہوا کہ وہ نصرت بیگم کو قتل کر کے غائب ہو گیا ہے۔ اب نہیں ملے گا۔ اِس شہر میں اُس کا ٹھکانہ ہی کیا۔

اُن دنوں میری اور میرے عملے کی ایک ڈیوٹی اور بھی تھی۔ شہر میں الیکشن کا ہنگامہ تھا۔ حالات بہت خراب تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقوؤں، پتھروں اور سوڈے کی بوتلوں سے ایک لڑائی ہو چکی تھی۔ مجھے اِدھر کا انتظام بھی کرنا پڑتا تھا۔ میں دل سے مسلمانوں کے ساتھ تھا۔ ظاہری

طور پر میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ شہر کے ہندو لیڈر میرے خلاف تھے۔ اس واسطے کہ میں مسلمان تھا۔ میں نے انہیں تھانے بُلا کر کہا تھا کہ تم لوگوں کے دلوں میں میرے خلاف کدورت ہے لیکن یاد رکھو کہ ہندوؤں نے گڑبڑ کی تو میں سب سے پہلے تم سب کو گرفتار کروں گا، اس واسطے کہ مسلمان یہاں بہت کم ہیں۔ وہ ہندوؤں پر حملے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ میری بات سُن کر دو لیڈروں نے جو آڑھتی تھے مجھے دھمکایا۔ میں نے دونوں کو اُسی وقت حوالات میں بند کر دیا اور اگلے روز چھوڑا۔ ان میں سے ایک نے مجھے کہا تھا — "اپنے مسلمانوں کو سمجھا دو کہ پاکستان نہیں بنے گا۔ ہم نہیں بننے دیں گے۔ ہمارے ساتھ بھائی بندی رکھیں۔"

معلوم نہیں کیوں میرے مُنہ سے نکل گیا — "مہاشے جی! خُدا نے فیصلہ دے دیا ہے کہ پاکستان بن کے رہے گا" — اِس بات پر گرماگرمی ہو گئی تھی اور میں نے ان میں سے دو کو حوالات میں بند کر دیا تھا اور اُسی وقت اپنے انگریز ڈی۔ ایس۔ پی کو بذریعہ ٹیلی فون اطلاع دے دی تھی کہ ہندو لیڈروں نے مجھے تھانے میں آ کر گالیاں دی ہیں اور میں نے دو کو بند کر دیا ہے۔ ڈی۔ ایس۔ پی دانشمند انگریز تھا۔ اُس نے مجھے کہا کہ کل انہیں چھوڑ دینا، باقی میں سنبھال لُوں گا۔ اُس نے دوسرے دن آ کر ہندو سرکردہ لوگوں کو بُلایا اور اُن کی اچھی حجامت بنا دی تھی۔

میں ایک بات پر حیران تھا۔ شہر میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ مسلمان بہت تھوڑے تھے۔ اُن میں مار پٹائی کی جرأت نہیں تھی۔ ہندوؤں کے غنڈے بہت سخت تھے، پھر بھی مجھے رپورٹیں مل رہی تھیں کہ ہندو غنڈے زخمی ہوتے رہتے ہیں اور وہ مسلمانوں سے دب گئے ہیں۔ میرے مخبر یہ خبر لانے میں ناکام ہو گئے تھے کہ ہندو غنڈوں کو کون زخمی کرتا ہے اور وہ دب کیوں گئے ہیں۔

راما اور جمیلہ تھانے میں

مَیں سیاسی ہنگامے رد کنے میں بھی مصروف رہتا تھا۔ نُصرت بیگم کے قتل کے غالباً چار روز بعد رات کو مجھے خبر ملی کہ شہر کا ایک مشہور ہندو غُنڈہ راما جمیلہ کے گھر میں گیا ہے۔ رامے کا نام رمیش چندر تھا اور وہ راما کے نام سے مشہور تھا۔ اُس کے متعلق مجھے رپورٹ ملتی رہتی تھی کہ سیاسی ہنگاموں میں مسلمانوں کو ڈراتا دھمکاتا رہتا ہے اور ہندو مسلم فساد جو پہلے تین چار بار ہو چکے تھے، ان میں کرتا دھرتا بلکہ کمانڈر یہی تھا۔ اب مجھے خبر دی گئی کہ وہ جمیلہ کے گھر میں ہے تو مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ راما جمیلہ کو اکیلی عورت سمجھ کر کسی اور نیّت سے جمیلہ کی مرضی کے خلاف اُس کے گھر میں جا گھُسا ہے۔ دوسرا خیال یہ آیا کہ جمیلہ نے اُس کے ساتھ تعلق پیدا کر رکھا ہوگا۔ اس خیال سے مجھے غصّہ آگیا۔ تعلق رکھنا تھا تو اس قسم کے ذلیل ہندو کے ساتھ رکھنا تھا؟ تیسرا خیال یہ آیا کہ جمیلہ کا بیٹا قُدرت بھی بدمعاش ہے۔ شاید وہ بھی گھر آیا ہوگا۔ چوتھا خیال یہ آیا کہ جمیلہ نے ان دونوں سے اپنی خالہ کو قتل کرایا ہوگا۔

مَیں فوراً اُٹھا۔ نُورے اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور بہت جلدی جمیلہ کے دروازے پر جا پہنچا۔ دروازے پہ ہاتھ مارا تو دروازہ رامے نے کھولا۔ مَیں نے اُس پر ٹارچ کی روشنی مار کر پُوچھا — "ارے رامے! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ چلو، اندر چلو" — اُسے بولنے کا موقعہ دیئے بغیر مَیں نے اُسے دھکا دیا اور اندر چلا گیا۔ جس کمرے میں روشنی تھی اور دروازہ کھلا ہُوا تھا، مَیں بہت تیز اُس کمرے میں جا گھُسا۔ جمیلہ پلنگ سے بڑی جلدی میں اُٹھ رہی تھی۔ اُس کے جسم پر صرف قمیض تھی۔ مَیں نے اُسے غصّے سے کہا — "اسی حالت میں رہو" — وہ میری طرف گھُومی۔ اُس کا سارا جسم کانپنے لگا۔ مَیں نے رامے کو اپنے قریب کر کے کہا — "رامے! قتل کا اقبال دوستوں کی طرح کر لو گے یا . . . " — اُس نے مجھے ہنس کر ٹال دیا،

پھر کہنے لگا — "اس عورت کے ساتھ میرا کوئی گہرا تعلق نہیں کہ اس کے کہنے پر کسی کو قتل کر دوں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مَیں یہاں کیوں آیا ہوں۔"

مَیں دونوں کو تھانے لے گیا۔ مجھے بڑے آرام سے تفتیش کرنی آتی تھی، لیکن رامے پر مجھے اس لئے غصّہ تھا کہ وہ مُسلمانوں کو دھمکیاں دیتا تھا اور اُس نے مُسلمانوں پر حملے کراتے تھے۔ مَیں نے اپنے دونوں کانسٹیبلوں پر تاپیے اور نُورے سے کہا کہ اس کی ذرا خاطر داری کرو۔ قاتل یہی ہے۔ جمیلہ کو مَیں نے اپنے پاس رکھا۔ وہ روتی اور چیختی تھی کہ خالہ کو اس نے نہ قتل کیا ہے نہ کرایا ہے۔ جمیلہ عورت ذات تھی۔ بیوہ تھی۔ مَیں نے اُسے بہت ڈرایا دھمکایا لیکن اُس پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ اُس نے اتنا ہی مانا کہ رامے کے ساتھ اُس کا یہی تعلق ہے جو مَیں نے دیکھا تھا اور راما اُسے بہت پیسے دیتا تھا۔

رامے کے بارے میں مجھے اُمید تھی کہ اگر وہ قاتل ہے تو مان جائے گا، اس واسطے کہ وہ چور اور ڈکیت نہیں تھا کہ پولیس کی مار سہہ لے گا۔ وہ صرف بدمعاش اور جُوتے باز تھا اور ہندوؤں نے اُسے اپنا کرائے کا غُنڈہ بنایا ہُوا تھا۔ پولیس کے ساتھ اُس کا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ پر تاپا اور نُورا اُس کے ساتھ جو سلوک کر رہے تھے وہ مجھے اس طرح معلوم ہو رہا تھا کہ اُس کی ہائے ہائے سے سارا تھانہ ہل رہا تھا لیکن صبح تک راما اور جمیلہ نہ مانے تو مَیں مان گیا کہ یہ قاتل نہیں۔ مَیں نے بہت بڑی غلطی کی کہ اُنہیں چھوڑ دیا۔ یہ غلطی اِس واسطے مجھ سے ہو گئی کہ میرے اُوپر غصّہ سوار تھا۔ مَیں نے نُصرت بیگم کے قتل کو دماغ سے اُتار دیا تھا۔ مَیں رامے سے انتقام لے رہا تھا۔ اُس نے سیاسی گڑبڑ میں کئی مُسلمانوں کو زخمی کیا تھا اور مُسلمانوں کے جلسوں میں گڑبڑ بھی کی تھی۔ اپنی غلطی کا احساس مجھے دو تین دن بعد ہُوا۔

پاکستان کی تاریخ کا ایک عجیب باب

دوسری یا تیسری شام کا ذکر ہے کہ جمیلہ کا بیٹا قدرت میرے پاس آ گیا۔ اُسے ایک کانسٹیبل لایا تھا۔ وہ بڑی اچھی شکل وصورت کا نوجوان تھا۔ اُس سے میں صحیح معنوں میں تفتیش کرنا چاہتا تھا۔ اُس کے ساتھ میں کچھ پیار سے پیش آیا اور اُسے کہا کہ مجھے بہت ساری باتیں معلوم ہو چکی ہیں، اس واسطے وہ جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرے ورنہ بہت پریشان ہوگا۔ اس نے بڑے اچھے لہجے میں جواب دیا کہ وہ شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ آج ہی واپس آیا ہے اور اُسے اس کانسٹیبل نے دیکھ لیا اور تھانے لے آیا۔ راستے میں اس نے مجھے بتایا کہ میری نانی نصرت بیگم قتل ہو گئی ہے۔

"تم قتل کی رات شہر سے غائب ہوتے تھے" — میں نے کہا — "کہاں گئے تھے؟"

"مسلم لیگ کے شیخ عبدالودود صاحب سے پوچھ لیں" — اُس نے جواب دیا۔

"قدرت! میں تم سے پوچھ رہا ہوں" — میں نے کہا — "اور میں جو پوچھ رہا ہوں وہ مجھے فوراً بتا دو۔"

"جناب! میں آپ کو صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ میں یہاں کی مسلم لیگ کا ایک پیغام ضلع کے صدر کے پاس لے کر گیا تھا" — اُس نے کہا — "اگر آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ وہ پیغام کیا تھا، تو وہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گا۔ میرے ہاتھوں پر جلتے ہوئے انگارے رکھ دیں۔ درد سے چیخیں مار دوں گا، وہ پیغام نہیں بتاؤں گا۔ پولیس کو نہیں بتاؤں گا۔"

مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اُسے گالی دے کر کہا کہ اُس جیسے چرسی اور جوارئیے کا مسلم لیگ کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ وہ عجیب سی ہنسی ہنس پڑا اور کہنے لگا — "آپ ہیں تو مسلمان لیکن آپ صرف لاٹھی چارج اور گرفتاریاں کرنا ہی جانتے ہیں۔ میں مسلم لیگ کے لیے جو کام کر رہا ہوں وہ آپ کو بتا دوں تو آپ مجھے ابھی حوالات میں بند کر دیں گے۔ اگر میں حوالات میں بند ہو گیا تو یہاں رامے جیسے ہندو غنڈے مسلمانوں کا گلیوں میں چلنا پھرنا بند کر دیں گے۔"

اس نوجوان نے مجھے چکر میں ڈال دیا۔ میں نے ایک کانسٹیبل سے کہا کہ شیخ عبدالودود کو بلا لائے۔ وہ شہر کی مشہور شخصیت تھی۔ اُس کے آنے تک میں قدرت سے پوچھ گچھ کرتا رہا۔ وہ اس بات پر زور دے رہا تھا کہ نانی نصرت ہی ایک انسان تھی جس سے اُسے پیار ملا تھا۔ وہ رو پڑا۔ میں نے اپنی زبان کا ہر داؤ آزما لیا۔ اِس پر جرح کی۔ اُس نے ہر سوال کا جواب اتنا مکمل اور ایسے پختہ لہجے میں دیا کہ مجھے اُس کی کسی بھی بات میں جھوٹ کا شک نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی میں اُسے آوارہ، بدمعاش اور چرسی جواریا سمجھتا تھا۔ اس واسطے کہ وہ چالاک تھا۔

شیخ عبدالودود آ گیا۔ میں اُسے جانتا تھا۔ میں دفتر سے نکل گیا اور اُسے باہر ہی روک کر پوچھا کہ وہ قدرت کو جانتا ہے؟ اور کیا وہ فلاں رات کوئی پیغام لے کر کہیں گیا تھا؟ شیخ عبدالودود نے جواب دے کر میرا دماغ صاف کر دیا۔ اُس نے بتایا کہ قدرت اُس شام چار بجے مسلم لیگ کے دفتر میں آیا تھا۔ اُسے رات آٹھ بجے کی ریل گاڑی پر بٹھایا گیا تھا اور یہ آج شام سے کچھ دیر پہلے کام کر کے واپس آیا ہے۔ شیخ عبدالودود نے مجھے کام بھی بتا دیا۔ کمال پور میں مسلمان غنڈوں کی کمی تھی۔ ہندو غنڈے سر چڑھ رہے تھے۔ پہلے قدرت اور اُس کے دس بارہ ساتھیوں نے ہندو غنڈوں کو دباتے رکھا لیکن ہندوؤں نے پندرہ بیس سکھوں کو کہیں سے بُلا لیا۔ پولنگ میں دو دن باقی تھے۔ خطرہ تھا کہ ہندوؤں کے غنڈے پولنگ سٹیشنوں پر مسلمان ووٹروں کو ہراساں کریں گے۔ اس واسطے قدرت کے ہاتھ ضلع کے صدر (مسلم لیگ) کو پیغام بھیجا گیا کہ اِدھر اُدھر سے بیس کے قریب لٹھ باز اور چھری مار کمال پور بھیجے جائیں جو پولنگ کی نگرانی کر سکیں۔ قدرت آج آدمی لے کر واپس

آیا ہے۔

یہ پاکستان کی تاریخ کا ایک عجیب باب ہے کہ پاکستان بنانے میں چرسیوں، جواریوں اور بدمعاشوں نے بہت کام کیا تھا، لیکن میں قدرت کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، اس واسطے کہ وہ تو بچپن سے ہی آوارہ ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس میں جذبات نہیں تھے۔

شیخ عبدالودود نے اس کی بہت تعریف کی اور کہا کہ قدرت دیانتدار ورکر ہے اور یہ جو کام کر رہا ہے وہ کوئی دوسرا شاید نہ کر سکے۔ اُسے کہا گیا تھا کہ وہ اس پیغام کو خفیہ رکھے جو وہ لے گیا تھا۔ اُس نے مجھے بھی یہ پیغام نہ بتایا۔ پھر بھی قدرت کو ابھی قتل کے شک سے پاک نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے شیخ عبدالودود کو جانے کی اجازت دے دی اور قدرت سے تفتیش جاری رکھی۔

ماں، مسلم لیگ اور راما غنڈہ

اب اُس کے ساتھ میرا سلوک بدلا ہوا تھا۔ اُس کی ماں کا ذکر آ گیا۔ اُس نے ماں کے خلاف نفرت کا اظہار کیا۔ کہنے لگا کہ اُس کی ماں جائیداد کے لالچ میں آکر گھر سے ایک بال بچے دار آدمی کے پیچھے آ گئی تھی۔ اس کے طعنے قدرت کو بڑے ہو کر سننے پڑے۔ پھر شہر میں آکر اُس کی ماں نے غیر مردوں کے ساتھ رنگ رلیاں منانی شروع کر دیں۔ قدرت کو وہ بچہ سمجھتی تھی جسے شاید کوئی سمجھ ہی نہیں تھی۔

"میں سب سمجھتا تھا" — قدرت نے کہا — "میری حالت کو ماں نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے میرے باپ کی پہلی بیوی کے بیٹے آوارہ کتا سمجھتے تھے۔ مجھے باپ کا پیار نہ ملا۔ ماں نے بھی پیار نہ دیا۔ باپ مر گیا تو ہم یہاں آ گئے۔ یہاں ماں نے کچھ اور ہی کرتوت شروع کر دیئے۔ وہ مجھے گھر سے باہر ہی رکھتی تھی۔ مجھے تعلیم بھی نصیب نہ ہوئی۔ میں بچپن میں گاؤں میں گندے بچوں کے ساتھ دل بہلاتا تھا۔ شہر میں آئے تو ماں مجھے پیسے دے کر باہر بھیج دیتی تھی۔ میں نے یہاں بھی آوارہ لڑکوں کے ساتھ وقت گزارنا شروع کر دیا۔ سگریٹ پینے انہی لڑکوں نے سکھا دیئے۔ پھر ہر طرح کی بری حرکت شروع کر دی اور ایسا وقت آ گیا کہ ماں مجھ سے بیزار ہو گئی اور میں ماں کو ناپسند کرنے لگا۔ میں نے گھر سے دور رہنا شروع کر دیا۔ مجھے پتہ چلا کہ میری ماں نے رامے بدمعاش کے ساتھ دوستی کر لی ہے۔ میں اُس وقت مسلم لیگ میں شامل ہو گیا تھا اور رامے کے ساتھ میری ٹکر شروع ہو گئی تھی۔ میں اب پکا بدمعاش بن چکا تھا.....

"جوئے کے اڈے پر کوئی سر اُٹھا کر بات کرتا تو میں اُسے دو منٹ میں سیدھا کر لیتا تھا لیکن پاکستان کے نعرے لگنے لگے اور ہندوؤں نے پہلی بار مسلمانوں کے ایک جلسے پر غنڈوں سے حملہ کرایا تو پتہ نہیں میرے دل میں یہ آگ کس طرح لگ گئی کہ میں بھی مسلمان ہوں۔ میں نے اپنے چرسی اور بدمعاش دوستوں کو ساتھ لیا اور مسلم لیگ کے دفتر میں چلا گیا۔ اُس روز سے میں نے اپنی جان پاکستان کے نام پر قربان کی ہوئی ہے۔ رامے بدمعاش کی میں دو دفعہ مرمت کر چکا ہوں۔ میں نے رامے کو دیکھا کہ وہ میری ماں کے پاس جاتا ہے تو میں نے ماں سے کہا کہ جہاں جی چاہے جھک مارو، اس ہندو غنڈے کو گھر میں نہ آنے دو۔ یہ ہمارا دشمن ہے۔ ماں نے مجھے گالیاں دیں۔ میں نے اُسے کہا کہ راما پھر اس گھر میں آیا تو میں تم دونوں کو قتل کر دوں گا۔"

اس موقعہ پر میں نے ایک غلطی کی۔ میں نے شاید جذبات میں آ کر کہہ دیا — "میں نے دو روز ہوئے رامے کو تمہاری ماں کے ساتھ پکڑا ہے۔ وہ رات کو تمہارے گھر میں تھا۔"

اُس کا چہرہ اتنا لال ہو گیا جیسے اُس کی کھال پھاڑ کر خون اُبل پڑے گا۔ اُس نے آہستہ سے کہا — "تو میری ماں باز نہیں آئی۔ میں بہت دن ہوتے گھر نہیں گیا۔ وہ خوش ہو گی کہ میں شہر سے چلا گیا ہوں۔"

میں باقی بات مختصر کر دوں گا۔ بہت وقت اور گزر گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ

قُدرت قاتل نہیں ہے۔ مَیں نے اُسے کہا کہ مَیں قاتل کو پکڑ تو لوں گا لیکن وہ میری مدد کرے اور سراغ رسانی کرے۔ اُس نے کہا کہ قتل میں اُس کی ماں کا ہاتھ ضرور ہے اور وہ سُراغ لگائے گا۔ مَیں نے اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ اُس نے وعدہ کیا کہ وہ ایک دو دنوں میں میرے پاس آئے گا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اگر مجھے اس کی جلدی ضرورت پڑ جاتے تو وہ مسلم لیگ کے دفتر میں ملے گا۔

ایک قومی دُشمنی، دوسری ذاتی اور دو قتل

پولنگ میں دو دن باقی تھے اس واسطے شہر میں ہندو مُسلم دُشمنی بہت بڑھ گئی تھی۔ مُسلمانوں نے بھی غنڈہ فورس تیار کر لی تھی۔ مجھے راتوں کو شہر کی گشت پر جانا پڑتا تھا۔ دن بھی اسی طرح گزر جاتا تھا۔ وارداتوں کی تفتیشیں ملتوی ہو گئیں۔ نُصرت بیگم کے قتل کی بھی تفتیش الگ رکھ دی۔ تیسری چوتھی رات کا واقعہ ہے کہ مَیں گشت سے واپس آ کر گہری نیند سویا ہُوا تھا۔ میرے گھر کا دروازہ کھٹکا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ ضرور شہر میں کسی گڑبڑ کی خبر آئی ہوگی۔ مَیں نے دروازہ کھولا تو باہر قُدرت کھڑا تھا۔ مَیں سمجھا کہ نُصرت بیگم کے قتل کے سلسلے میں کوئی خبر لایا ہے لیکن وہ بڑے غلط وقت آیا تھا۔ مجھے غصہ آ گیا۔

"مجھے گرفتار کر لیں" ___ قُدرت نے کہا ___ "یہ لیں ریوالور۔ مَیں رامے بدمعاش اور اپنی ماں کو اس ریوالور کی دو دو گولیوں سے ختم کر آیا ہُوں۔ نانی نُصرت کو رامے نے قتل کیا تھا اور میری ماں نے قتل کرایا تھا۔"

میری نیند اُڑ گئی۔ مَیں نے اُس سے پُوچھا کہ وہ تھانے گیا تھا؟ اُس نے بتایا کہ وہ سیدھا میرے گھر آیا ہے، تھانے نہیں گیا۔ مَیں اُسے اندر اپنے کمرے میں لے گیا اور اُس کے ہاتھ سے ریوالور لے کر الگ رکھ دیا۔ اُسے کہا کہ وہ بتاتے کہ یہ واردات اُس نے کس طرح کی ہے۔

"رامے کے ساتھ میری ایک دُشمنی تو یہ تھی کہ اُس نے ہمارے جلسوں میں ہندو غنڈوں کو ساتھ لے کر گڑبڑ کرائی تھی" ___ اُس نے کہا ___ "پھر مُسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا جو ٹکراؤ ہُوا تھا وہ رامے نے کرایا تھا۔ وہ مُسلمانوں کو دھمکیاں دیتا تھا۔ مَیں اُس کے مقابلے میں آ گیا اور اُس کی بدمعاشی ٹھنڈی کر دی۔ اُس نے مجھے قتل کی دھمکی دی۔ پھر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ جتنی رقم مانگتے ہو دِلا دُوں گا، میدان سے نکل جاؤ۔ مَیں نے اُسے کہا کہ مُسلمان ہُوں، مُسلمانوں کی حفاظت کروں گا۔ یہاں پاکستان کا نعرہ پہلے سے زیادہ اُونچا لگے گا اور میری بدمعاشی میری قوم کے کام آئے گی۔"

اس طرح رامے کے ساتھ قُدرت کی دُشمنی دو طرح کی ہو گئی۔ ایک قومی سطح پر اور دوسری ذاتی۔ شیخ عبدالودود مجھے پہلے ہی قُدرت کے بارے میں بتا چکا تھا۔ اگر وہ نہ بتاتا تو مَیں قُدرت کی زبان سے ان باتوں کو کبھی سچ نہ مانتا جو وہ مجھے سُنا رہا تھا۔ اُس کا اقبالی بیان بہت لمبا تھا۔ مَیں آپ کا وقت ضائع نہیں کروں گا، اس واسطے بہت ضروری اور ایمان کو تازہ کرنے والی باتیں سُناؤں گا۔ ان باتوں کو وہی لوگ سچ مانیں گے جو ۴۷۔۱۹۴۶ء میں آزادی کی سرگرمیوں میں شامل تھے۔ جو لوگ پاکستان میں پیدا ہُوئے ہیں وہ اِن باتوں کو فلمی کہانی کے مکالمے یا افسانے سمجھیں گے۔ وہ وقت ایسا تھا کہ اُس وقت امیر، غریب، شریف، بدمعاش، بڑے، چھوٹے، تندرست اور مریض اپنی جان اور اپنے مال سمیت ایک محاذ پر اکٹھے ہو گئے تھے اور سب کا نعرہ ایک ہی تھا ___ "لے کے رہیں گے پاکستان۔ بٹ کے رہے گا ہندوستان۔"

مَیں آپ سب کو آزادی کے جہاد کا ایک پہلو خاص طور پر بتانا چاہتا ہُوں۔ وہ یہ ہے کہ مَیں جن علاقوں میں رہا ہُوں، وہ پاکستان میں آنے والے علاقے نہیں تھے۔ بہت دُور کے علاقے تھے لیکن وہاں کے مسلمانوں نے بھی پاکستان کے لئے اتنا ہی جہاد کیا ہے جتنا پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان اور بنگال کے مسلمانوں نے کیا تھا۔ ہندوستان

کے علاقوں کے مسلمانوں کو ہندوؤں نے پاکستان بنانے کی بہت سزا دی تھی اور وہاں مسلمان آج تک سزا بھگت رہے ہیں۔

ان میں کمال پور کے مسلمان بھی تھے جنہیں معلوم تھا کہ پاکستان بن گیا تو وہ ہندوؤں کی حکومت میں رہیں گے لیکن انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ خونی دشمنی پیدا کر لی تھی۔ قدرت جیسے آوارہ اور بدمعاش مسلمان بھی پکے مسلمان بن گئے تھے۔ ان کے پاس ایک ہی ہنر تھا ___ لڑائی اور مار کٹائی اور غنڈہ گردی ___ انہوں نے اسی فن کے زور پر ہندوؤں کو دبا لیا اور پولنگ میں مسلمانوں کو محفوظ اور بے فکر کر دیا۔ اب ان مسلمان غنڈوں میں سے ایک نوجوان ایک ہندو غنڈے، بلکہ غنڈوں کے سردار اور اپنی بدکار ماں کو قتل کر کے میرے پاس آ گیا تھا۔ اُس نے آلۂ قتل جو ایک ریوالور تھا مجھے دے دیا اور وہ اقبالی بیان دے رہا تھا۔

مجھے گرفتار کر لیں

اس لڑکے نے مجھے میری زندگی کے سب سے زیادہ سخت اور خطرناک امتحان میں ڈال دیا۔ میں اپنے ایمان اور ڈیوٹی کے درمیان اس طرح کھڑا ہو گیا جس طرح کوئی پاگل چلتے چلتے رک جاتا ہے اور کبھی دائیں دیکھتا ہے کبھی بائیں اور کبھی اوپر دیکھتا ہے۔ میری خواہش تھی کہ قدرت بہت جلدی اپنا بیان ختم کرے اس واسطے کہ میں جانتا تھا کہ ابھی رپورٹ آ جائے گی کہ راما اور جمیلہ قتل ہو گئے ہیں اور لاشیں جمیلہ کے گھر پڑی ہیں۔

قدرت نے جب بیان کو آگے بڑھایا تو میں جس کشمکش و پیچ میں پڑ گیا تھا، اس سے میرا دماغ آزاد ہو گیا، میرے اندر سے آواز آئی ___ "محبوب! آج پاکستان تجھ سے بھی قربانی مانگ رہا ہے" ___ پہلے آپ قدرت کا بیان سن لیں۔

"اُس روز آپ نے مجھے تھانے بلایا تو میں نے آپ کو بہت سی باتیں نہیں بتائی تھیں" ___ قدرت نے کہا ___ "میں آپ کو اس دن صرف یہ یقین کرا رہا تھا کہ میں نے نانی نصرت کو قتل نہیں کیا۔ نانی نصرت کے قتل کی وجہ ایک اور بھی تھی۔ وہ میرے ساتھ پیار کرتی تھی۔ میں نے جب مسلم لیگ کا کام کرنا شروع کر دیا تو نانی کو بتایا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ اُس نے مجھے پانچ روپے دیئے۔ کہنے لگی ___ قدرت بیٹا! میں جانتی ہوں تم یہ پیسے جوئے میں ہار آؤ گے یا ان کی چرس پی لو گے لیکن میں تمہیں انعام دے رہی ہوں۔ اس کی قدر کرنا۔ اب میں تمہیں نہیں کہا کروں گی کہ برے کام چھوڑ دو۔ اگر تم سچے دل سے پاکستان کے لئے کام کر رہے ہو تو مجھے یقین ہے کہ تم برے کام خود ہی چھوڑ دو گے اور خدا تمہارے سارے گناہ معاف کر دے گا" ___ نانی نصرت دل و جان سے مسلم لیگی اور پاکستان کی عقیدت مند تھی۔ اُس نے میرا حوصلہ خوب بڑھایا....

"میں نے ایک روز اُسے بتایا کہ میں مسلم لیگ کا کوئی شریفانہ کام نہیں کر رہا، میں تو ہندوؤں کے مقابلے میں غنڈہ گردی کرتا ہوں۔ اُسے معلوم تھا کہ مسلمان اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیں تو ہندو انہیں کچا کھا جائیں۔ نانی نصرت کا جو جذبہ تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ میری غنڈہ گردی کی بات سن کر وہ ٹرنکوں والے کمرے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں یہ ریوالور تھا اور ایک بیلٹ جس میں چوبیس گولیاں اڑسی ہوئی تھیں۔ کہنے لگی ___ یہ تمہارے نانا مرحوم کا پستول ہے۔ ہمیشہ ٹرنک میں پڑا رہا ہے۔ یہ لے جاؤ لیکن ایک احتیاط کرنا بیٹا! اسے ہر کسی کو دکھاتے نہ پھرنا، اسی جرم میں پکڑے جاؤ گے۔ ہندوؤں نے گھروں میں بندوقیں اور پستول چھپا کر رکھے ہوئے ہیں۔ ایک نہ ایک دن ان ہتھیاروں سے مسلمانوں پر گولیاں چلیں گی۔ اُس وقت یہ پستول تمہارے کام آئے گا" ___ یہ ریوالور آج رات میرے کام آیا ہے۔ میں نے یہ ریوالور ہر وقت اپنی ٹانگ کے ساتھ باندھ کر رکھا ہے....

"نانی نصرت دس پندرہ روپے مسلم لیگ کے فنڈ میں دے دیا

کرتی تھی۔ اُس کی یہی ایک نیکی کافی تھی کہ مجھ جیسے غنڈے کو سینے سے لگا لیا تھا... ایک روز نانی نے مجھے بتایا کہ الیکشن کے لئے مسلم لیگ کو روپیہ چاہیئے، اس کے واسطے نانی نے بتایا کہ وہ دو ہزار روپیہ دے رہی ہے۔ دو تین دن بعد میں اُس کو دیکھنے گیا تو اُس نے میری ماں کو کوسنا شروع کر دیا۔ اُس نے بتایا کہ معلوم نہیں کس طرح تیری ماں کو پتہ چل گیا کہ نانی مسلم لیگ کو خاصی بڑی رقم دے رہی ہے۔ شاید نانی کی مائی نے میری ماں کو بتایا ہو گا۔ میری ماں نے نانی نصرت کے گھر آ کر کہا کہ نانی مسلم لیگ کو یہ رقم نہ دے بلکہ میری ماں کی مالی امداد کرے۔ نانی نہ مانی۔ میری ماں نے نانی سے کہا کہ پاکستان بکواس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مسلمان لیڈر پرچیاں لے کر ممبر بن جائیں گے اور پاکستان کے نعرے کو بھول جائیں گے۔ نانی پر کچھ اثر نہ ہُوا۔ میری ماں نے کہا فرض کرو مسلمانوں کو پاکستان مل گیا تو بھی ہمارا شہر تو پاکستان میں نہیں آئے گا۔ اس واسطے نانی کو چاہیئے کہ وہ ہندوؤں کو خوش رکھے اور یہ رقم کانگرس کو دے دے۔ نانی نصرت نے میری ماں کی خوب خبر لی اور اُس کی بے عزتی کی۔ میری ماں نے جاتے جاتے رامے غنڈے کا نام لے کر نانی کو ڈرایا...

"مجھے غصہ تو آنا ہی تھا۔ سب سے زیادہ غصہ اس پہ آیا کہ میری ماں نے رامے کا کیوں نام لیا تھا۔ نانی نصرت نے کہا کہ پتہ چلا ہے کہ راما غنڈہ تمہاری ماں کے پاس آتا ہے۔ یہ سُن کر میرا دماغ چکرا گیا۔ میں ماں کے پاس چلا گیا اور اُس سے پوچھا کہ راما کیا واقعی اُس کے پاس آتا ہے؟ ماں نے مجھے گالیاں دینی شروع کر دیں۔ میں نے ریوالور نکالا، چاقو نکال کر کھول لیا اور ماں سے کہا ـــــ 'میرا تیرا تعلق ختم ہے لیکن راما اس گھر میں آیا تو قتل ہو جائے گا' ـــــ وہ چیخی کہ خالہ نے تجھے میری بے عزتی کرنے کو بھیجا ہے۔ اُسے میں ایسا غائب کراؤں گی کہ اس کی لاش تک بھی کسی کو نہیں ملے گی...

"میں نے غصے سے آگے بڑھ کر چاقو کی نوک اُس کی شہ رگ

پر رکھ دی اور دانت پیس کر کہا ـــــ 'تم اپنی خالہ کی نہیں مسلمانوں کی دشمن بنی ہوئی ہو' ـــــ وہ اتنی ڈری کہ اُس نے ہاتھ جوڑ کر میری منت کی کہ اب چلے جاؤ۔ قسم کھاتی ہوں کہ آئندہ راما یہاں نہیں آئے گا۔ اُسے شاید میری غنڈہ گردی کا پتہ چل گیا تھا۔ اُسے رامے نے بتایا ہو گا۔ میں رامے کو تین چار روز پہلے پھینٹی لگا چکا تھا۔ میری ماں کو ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ میں اُسے قتل کر دوں گا، اس واسطے اُس نے سچی بات کہہ دی کہ آئندہ راما یہاں نہیں آئے گا...

"میں گھر سے باہر رہا۔ دیکھا نہیں کہ راما پھر بھی میری ماں کے گھر جاتا ہے یا نہیں۔ اُس روز آپ نے بتایا کہ آپ نے رامے اور میری ماں کو موقع پر پکڑا ہے۔ آپ نے مجھ پر مہربانی کی تھی کہ مجھے چھوڑ دیا تھا۔ میں نے دو راتیں چھُپ کر اپنے گھر پر نظر رکھی۔ آج رات رامے کو اندر جاتے دیکھا۔ تین چار منٹ بعد میں نے جا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ رامے نے کھولا۔ میں کچھ کہے بغیر اندر چلا گیا اور جلدی سے دروازے کی زنجیر چڑھا دی۔ میرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ میں نے کہا، رامے! اندر چلو۔ اُس نے ہنس کر کہا ـــــ 'قدر رے! تم مجھے اپنا بھائی کیوں نہیں سمجھتے۔ مجھے دشمن نہ سمجھو' ـــــ میں نے کہا ـــــ 'رامے! اندر چلو۔ میں تمہیں چاقو نکالنے کا موقع نہیں دوں گا' ـــــ وہ میری ماں والے کمرے میں میرے آگے آگے گیا۔ آگے میری ماں تھی۔ رامے نے میری ماں سے کہا، تمہارا بیٹا تو پگلا ہے۔ وہ جوں ہی میری طرف گھوما، میں نے دو گولیاں چلا دیں۔ ایک قدم کا فاصلہ تھا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ گرا لیکن تڑپا نہیں۔ بغیر تڑپے مر گیا۔ میری ماں نے اپنے منہ پہ ہاتھ رکھ لیا۔ اُسے اتنا خوف ہُوا کہ اُس کے منہ سے آواز بھی نہ نکلی...

"میں نے اُسے کہا ـــــ 'اگر زندہ رہنا چاہتی ہو تو بتا دو کہ نانی نصرت کو کس نے قتل کیا ہے۔ جھوٹ بولو گی تو تمہاری لاش اس کُتے کی لاش کے ساتھ پڑی ہوئی ہو گی۔ میں نے تمہیں کہا تھا کہ یہ کُتا یہاں آیا تو مارا جائے

گا۔ میری ماں کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اُس نے میری منّت کی کہ اُسے گولی نہ ماردوں۔ ریوالور کی نالی اُسی کی طرف تھی۔ اُس نے بتا دیا کہ اپنی خالہ کو اُسی نے رامے کے ہاتھوں قتل کرایا ہے۔ راما نانی نصرت کے گھر کی دیوار چڑھ کر اندر گیا تھا۔ واپس آکر اُس نے میری ماں کو بتایا کہ اس کی خالہ گہری نیند سوتی ہوئی تھی۔ وہ پیٹھ کے بل تھی۔ رامے نے اپنا انگوٹھا اُس کی شہ رگ اور ٹھوڑی کے درمیان رکھ کر دبایا اور نانی نصرت کے سینے پر اپنا گھٹنا دبائے رکھا تاکہ وہ تڑپ نہ سکے۔ وہ مر گئی تو راما دیوار پر چڑھ کر گلی میں اُتر آیا....

"میری ماں نے قتل کی ایک وجہ یہ بتائی کہ نانی نصرت اُسے پیسے نہیں دیتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ مُسلم لیگ کو دو ہزار روپیہ دے رہی تھی۔ میری ماں نے رامے کو بتایا۔ رامے نے کہا کہ نہیں مانتی تو اسے ختم کر دیں گے۔ اس کے مر جانے سے تمہاری خالہ کی حویلی اور مال و دولت تمہیں مل جائے گا۔ اسی واسطے رامے نے نانی نصرت کو قتل کر کے گھر کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ دونوں اس مال کو اپنا سمجھ رہے تھے....

"میں نے ماں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سچ بولے گی تو اُسے زندہ رہنے دُوں گا، لیکن میرا دماغ غصّے اور انتقام سے میرے قابو میں نہ رہا۔ میں نے ماں کے سینے کے ساتھ ریوالور رکھ کر دو گولیاں چلائیں، اور ماں رامے کی لاش کے قریب گری۔ میں وہاں سے آگیا۔ میں بھاگ سکتا تھا۔ اس شہر سے کہیں دُور چلا جاتا لیکن مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میں کیوں آپ کے پاس آگیا ہُوں۔ مجھے گرفتار کر لیں۔"

خدا نے فیصلہ دے دیا

رات ابھی بہت باقی تھی۔ قدرت اپنا بیان دے چکا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا تھا۔ میری نظریں اُس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ

میں کیا سوچ رہا تھا کچھ سوچ ضرور رہا تھا۔ اچانک میں اِس طرح بولا جیسے کوئی اور بول رہا ہو۔ میری زبان سے یہ الفاظ نکلے ـــــ "قدرت! تم یہیں بیٹھے رہنا۔ میں ابھی آتا ہوں۔ بیٹھے رہنا۔ گھبرانا نہیں۔ تمہیں کوئی گرفتار نہیں کرے گا"ـــ اس کمرے کے دو دروازے تھے۔ میں نے دونوں کی کنڈیاں باہر سے لگا دیں۔ دو کھڑکیاں تھیں۔ دونوں میں پُرانے زمانے کی طرح سلاخیں لگی ہُوئی تھیں۔ میں نے اپنے اُوپر کمبل ڈال لیا تھا۔ خوش قسمتی سے میں نے شیخ عبدالودُود کا گھر دیکھا ہُوا تھا۔ ان سیاسی حالات میں مُسلمانوں اور ہندوؤں کے لیڈروں کے گھروں سے واقفیت پولیس کے لئے ضروری تھی۔

دروازہ کھٹکھٹانے پر شیخ عبدالودُود نے خود دروازہ کھولا تو میں نے اُسے کہا کہ فوراً اندر چلیں، میں سب انسپکٹر محبوب عالم ہوں۔ وہ بہت گھبرایا۔ اندر جا کر میں نے اُسے بتایا کہ مُسلمان ہو کر میں مُسلمانوں کے لئے کچھ نہیں کر سکا۔ اب ایک موقع مِلا ہے۔ میں نے کہا ـــ "قدرت نے ایک ہی بار دو قتل کر دیئے ہیں۔ اُس نے ہندوؤں کے سب سے بڑے غنڈے رامے کو قتل کیا ہے۔ کیا آپ قدرت کو اتنی دُور بھیج سکتے ہیں کہ کسی کو اُس کا سراغ نہ مِلے؟ آپ ضلعی مسلم لیگ سے بات کر سکتے ہیں کہ یہاں کا بڑا کارآمد نوجوان سزائے موت پا جائے گا۔ اسے غائب کرنا ہے؟" ـــــ شیخ عبدالودُود حیرانی سے مجھے دیکھتا رہا جیسے اُسے میری بات پر اعتبار نہ ہو۔ میں نے اعتبار کرا دیا۔ اُس نے کہا کہ وہ قدرت کو رات ہی رات غائب کر دے گا۔ میں نے اسے ساتھ لیا اور اپنے گھر لے آیا۔ میں نے راستے میں اُس کے ساتھ تبادلۂ خیالات کر لیا تھا کہ وہ قدرت کو کس طرح غائب کرے۔

قدرت میرے کمرے میں ہی تھا۔ میں نے اُسے کہا ـــ "قدرت جاؤ شیخ صاحب کے ساتھ" ـــ اُس نے بڑی حیرانی سے مجھے دیکھا۔ میں نے شیخ عبدالودُود سے کہا کہ وہ اپنا ایمان پکّا رکھیں اور مجھے ذلیل نہ کرا دیں۔ اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اُنگلی آسمان کی طرف کی۔ کہنے لگا

— "اللہ کو جواب دینا ہے۔ میں بچہ نہیں۔ مجھے احساس ہے آپ کیا کر رہے ہیں۔"

"شیخ صاحب!" — میں نے کہا — "صبح تک یہ لڑکا شہر میں نہ ہو اور یاد رکھیں کہ مجھے نہ بتانا کہ اسے کہاں بھیج دیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی وقت میرا ایمان میرے ہاتھ سے نکل جاتے تو میں اسے جاکر گرفتار کر لوں۔ میں یہ ریوالور اسے نہیں دوں گا۔ یہ میں خود غائب کر دوں گا۔"

"قُدرت!" — میں نے اُسے کہا — "تم سمجھ گئے ہو؟ شیخ صاحب انتظام کر دیں گے" — میرے مُنہ سے ایک بار پھر وہی الفاظ نکل گئے جو ایک بار ہندو لیڈروں سے باتیں کرتے بے اختیار مُنہ سے نکلے تھے۔ میں جوتشی اور نجومی نہیں تھا۔ یہ میرے اندر کی، شاید میرے ایمان کی آواز تھی۔ میں نے قُدرت سے کہا — "تمہیں زیادہ عرصہ روپوش نہیں رہنا پڑے گا۔ یہ خُدا کا فیصلہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو پاکستان دے گا۔ خُدا جلدی دے گا، پھر تم وہاں چلے جانا۔" حالانکہ الیکشن میں ابھی دو دن باقی تھے۔ بہر حال آٹھ ماہ بعد پاکستان بن گیا۔

قُدرت ابھی تک حیران اور ششدر کھڑا تھا۔ میں نے شیخ عبدالودود سے کہا کہ اسے لے جائیں۔ قُدرت پھر بھی کھڑا رہا۔

"قُدرت جاؤ" — میں نے کہا — "جلدی نکلو۔"

وہ شیخ عبدالودود کے ساتھ چل پڑا۔ دروازے میں جاکر اُس نے پیچھے میری طرف دیکھا۔ میں اُسی کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے سلام کیا۔ جب وہ چلا گیا تو معلوم نہیں مجھے کیا ہُوا کہ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے خیال آیا کہ محمد بن قاسم جب ہندوستان میں آیا تھا تو اُس کی عمر قُدرت جتنی تھی۔ میری قوم کی گود میں بہت محمد بن قاسم پل رہے ہیں۔

آپ شاید بُرا منائیں کہ میں نے ایک چپڑاسی اور حرامی کو محمد بن قاسم سے ملا دیا ہے۔ ہاں۔ یہ میں نے گستاخی کی ہے لیکن ہم نے بیشمار محمد بن قاسم پیدا کر کے انہیں جُوتے کے اڈوں کا راستہ دکھا دیا ہے۔ آپ اپنے جوان

بیٹوں کو سینما، ٹی۔وی اور فیشن کے راستے سے ہٹا کر مُسلم کُش ہندوستان کا راستہ دکھا دیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہماری قوم میں کتنے محمد بن قاسم ہیں — سینکڑوں اور ہزاروں نہیں، لاکھوں ہیں۔

قدرت کو غائب کرا کے نُصرت بیگم، رلسمے بدمعاش اور جمیلہ کے قتل نے مجھے جس مصیبت میں ڈالا وہ میں پُوری نہیں سناؤں گا۔ مجھے کچھ کرتب کرنے پڑے۔ مجھے لائن حاضر پھر معطل کیا گیا، پھر میں بحال ہُوا اور دو ماہ بعد میں پاکستان کی طرف جاتے اتنا شدید زخمی ہُوا کہ ایک ٹانگ کٹ گئی۔ خُدا نے بس اتنی سی قربانی قبول کی — قُدرت کو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔



بیوی بیٹی اور کھوکھوں کا بیوپاری

قتل بہت خوفناک جرم ہے لیکن سارے قاتل خوفناک نہیں ہوتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ قتل وہ آدمی کرتا ہے جو ظالم ہوتا ہے اور نسل اُس کی بھیڑیئے سے ملتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا۔ قاتل زیادہ وہ ہوتے ہیں جو چوہے کو مارنے سے بھی خوف کھاتے ہیں۔ ایسا انسان جب کسی کو قتل کر دیتا ہے تو اُسے یقین نہیں آتا کہ یہ خون اُس کے ہاتھ سے ہُوا ہے، اس واسطے کہ کوئی کسی کو جان سے مارتا ہے یا اپنی جان لیتا ہے تو اُس وقت اُس کا دماغ اپنے قابو میں نہیں ہوتا۔ سیانے کہتے ہیں کہ یہ ذرا سی دیر کا پاگل پن ہوتا ہے جس میں کوئی شخص قتل یا خودکشی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی عقل میں آجاتا ہے۔ اگر وہ خود نہیں مرا اور کسی دوسرے کو مار دیا ہے تو آپ نہیں سمجھ سکتے کہ اُس کے اندر کتنی زور کا بھونچال آتا ہے۔ تھانیدار لوگ سمجھ جاتے ہیں اور وہ اُسے حوصلہ اور دلاسہ دے کر اقبال جُرم کرا لیتے ہیں۔

آپ اُس آدمی کو بہت دلیر کہتے ہیں جو کسی کو قتل کر کے آلہ قتل سمیت تھانے چلا جاتا ہے اور جرم کا اقبال خود ہی کرتا ہے۔ وجہ اس کی دلیری نہیں خوف ہوتا ہے۔ وہ اپنے خوفناک جُرم کو اپنے اندر دبا نہیں سکتا اور اُس کو سکون ملتا ہے جب اپنا جُرم تھانیدار کے آگے اُگل دیتا ہے۔ میں آپ کو نہیں سمجھا سکتا کہ وجہ اس کی کیا ہے کہ انسان قتل کرنے کے واسطے نہیں پیدا ہُوا پھر بھی انسان قتل کر دیتا ہے۔ میں نے بہت سارا علم حاصل نہیں کیا اس واسطے میں کوئی وجہ نہیں بتا سکتا۔ آپ کو کہانی سُناتا ہوں۔ آپ کی اپنی عقل سمجھ کام کرے تو وجہ معلوم کر لیں۔

جنگِ عظیم دوم کا زمانہ تھا۔ جنگ انگریزوں کے خلاف تھی اور انگریزوں کی بادشاہی بہت سارے ملکوں میں تھی۔ ہندوستان بھی انگریزوں کا تھا۔ سپلائی کی ٹھیکیداری کا کام اتنا زیادہ ہو گیا کہ چھوٹے چھوٹے دکاندار یا ہوشیار لوگ جو اُستادی ہاتھ جانتے تھے ٹھیکیدار بن گئے۔ انگریزوں پر بہت بڑی مصیبت پڑ گئی تھی، اس واسطے ان کا دھیان اِدھر نہیں آیا کہ ٹھیکیداریوں اور سپلائی میں رشوت چل رہی ہے اور سامان اتنا سپلائی نہیں ہوتا جتنا بل بنتا ہے۔ آپ ایسا سمجھ لیں کہ انگریزوں کی حکومت بہت کنجوس تھی مگر اس کے خزانوں کے منہ کھل گئے۔ پھر کیا ہوا کہ کل جو دکاندار تھے وہ ملٹری کنٹریکٹر اینڈ سپلائر بن گئے۔

اِن ٹھیکوں میں ایک ٹھیکہ لکڑی کے کھوکھے بنانے اور فوج کو سپلائی کرنے کا تھا۔ کھوکھے پتلی لکڑی یا پلائی وُڈ کے بنتے تھے۔ اِن میں گولہ بارود اور دوسرا سامان بھر کر محاذوں پر بھیجا جاتا تھا۔ میں اس وقت ہندوستان کے ایک شہر کے ایک تھانے کا انچارج تھا۔ اس شہر کا نام نہیں بتاؤں گا، اس واسطے کہ وہاں کے مسلمان اور اس واردات والے خاندان پاکستان میں آ گئے ہوں گے۔ اسی واسطے میں ان لوگوں کے نام بھی غلط لکھوں گا، نہیں تو یہ لوگ اپنی بے عزتی سمجھیں گے۔ میں کسی کی بے عزتی نہیں کرنا چاہتا، اس واسطے کہ میری ان کے ساتھ کیا دُشمنی ہے۔

جوان بیوی کا بوڑھا خاوند لاپتہ ہو گیا

کھوکھوں کا ایک مسلمان ٹھیکیدار جس کا نام شیخ نثار احمد سمجھ لیں، لاپتہ ہو گیا۔ پہلے تو مجھے اعتبار نہیں آیا کہ وہ لاپتہ ہوا ہے۔ بے اعتباری کس واسطے ہوئی؟ میرے بیان سے ظاہر ہو جائے گی۔ شام کو سورج اندر باہر تھا۔ ایک جوان جوڑا تھانے میں آیا۔ دولہا دلہن معلوم ہوتے تھے۔ لڑکی کی عمر چوبیس پچیس سال ہو گی۔ بہت خوبصورت اور قد بُت دل کو اچھا لگتا تھا۔ لباس قیمتی اور شوخ رنگ کا۔ سُرخی پوڈر اور کاجل خوب لگا ہوا۔ اس

کے ساتھ اٹھائیس سال کے لگ بھگ عمر کا آدمی تھا۔ رنگ گورا۔ جسم جوانمردوں والا۔ ناک نقشہ بہت اچھا اور لباس بھی اچھا۔ دونوں امیر خاندان کے لگتے تھے اور مجھے پورا یقین تھا کہ دولہا دلہن ہیں مگر دلہن نے بات شروع کی تو میرا خیال غلط ہو گیا۔

"میرے میاں کل صبح گھر سے نکلے تھے" — دلہن نے کہا — "آج دوسرے دن کی شام ہو گئی ہے، واپس نہیں آئے۔ میں اُن کی گمشدگی کی رپورٹ دینے آئی ہوں" — اپنے ساتھ والے آدمی کا اُس نے یہ تعارف کرایا — "یہ ہمارے منیجر ہیں، جمشید صاحب۔ انہیں ساتھ لے آئی ہوں۔ مجھے پولیس کی بابت کچھ بھی معلوم نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اُن کی تلاش میں سستی نہ ہو۔ یہ آپ کی ڈیوٹی ہے لیکن میں مالی خدمت آپ کی ضرور کروں گی۔"

اگر میں خاموشی سے سنتا رہتا تو شاید وہ چُپ نہ کرتی۔ وہ جس طریقے سے باتیں کرتی تھی اُس سے میں نے اندازہ لگایا کہ پیسہ دماغ میں چڑھا ہوا ہے۔ اس کے خاندان کو روپیہ پیسہ اب کہیں سے ملا ہے۔ وہ شو بازی کر رہی تھی۔ اُس نے مالی خدمت کا نام لیا تو میں نے اس کی زبان روک دی، اور اُسے کہا کہ وہ پہلے مجھے کام کی باتیں بتائے، مالی خدمت کی باتیں اس کے بعد کریں گے۔

اُس سے میں نے اُس کے خاوند کی بابت جو کچھ معلوم کیا وہ یہ تھا کہ اس کا نام شیخ نثار احمد تھا۔ وہ لکڑی کے کھوکھے اور کچھ اور سامان گورنمنٹ کو سپلائی کرتا تھا۔ کھوکھوں کا اُس کا اپنا کارخانہ تھا۔ اس کارخانے میں پندرہ سولہ درزی بھی کام کرتے تھے جو خیمے اور فوج کے کِٹ بیگ وغیرہ سیتے تھے۔ شیخ نثار کی اپنی کار تھی جو ڈیڑھ دو سال پہلے اُس نے سیکنڈ ہینڈ خریدی تھی۔ اس کا رنگ ہلکا نیلا تھا۔ اس کا مجھے نمبر لکھوایا گیا۔ شیخ نثار نے شہر سے باہر نئی کوٹھی بنوائی تھی اور اپنی بیوی کے ساتھ وہاں رہتا تھا۔ جب کوئی انسان گم ہو جاتا ہے تو پہلا سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ عمر کتنی ہے۔ میں نے اس خوبصورت بیوی روبینہ سے اس کے خاوند کی عمر پوچھی تو

اس نے اپنے منیجر کی طرف دیکھا۔ منیجر نے ذرا رُک کر بتایا ـــ "پچاس سال۔ ایک دو سال اُوپر ہو گی۔"

مَیں آپ کو بتا چکا ہُوں کہ روبینہ کی عمر چوبیس پچیس سال تھی ۔ یعنی خاوند دُگنی سے بھی زیادہ عُمر کا آدمی تھا ۔ یہ سُنتے ہی میرا خیال بدل گیا ۔ عام طور پر ایسے ہوتا تھا ، اور اب بھی ہوتا ہے کہ کوئی جوان یا بوڑھا مرد یا عورت لا پتہ ہو جائے تو اُس کے گھر والے ایک دن اور رات اُس کی واپسی کا انتظار کرتے ہیں ۔ وہ واپس نہ آئے تو جہاں جہاں وہ جا سکتا ہے وہاں سے پتہ کراتے ہیں ۔ اس کوشش میں چار پانچ دن گزر جاتے ہیں ۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر پولیس کو رپورٹ دی جاتی ہے ۔ یہ قدرتی کارروائی ہوتی ہے جو لوگ کرتے ہیں ۔

شیخ نثار کو گئے ہوئے ابھی دو دن اور ایک رات گزری تھی ۔ مَیں نے روبینہ سے پوچھا کہ اُس کا خاوند کاروبار کے سلسلے میں شہر سے باہر جاتا ہوگا ۔ اُس نے بتایا کہ اکثر جاتا رہتا ہے اور بعض دفعہ تین تین دن باہر رہتا ہے ۔ مَیں نے اُسے کہا کہ اب وہ اچانک چلا گیا ہوگا ۔ اُس نے کہا کہ وہ اُس کو بتائے بغیر کبھی نہیں گیا ۔ مَیں نے اُس سے پوچھا کہ وہ شہر میں جہاں کہیں اکثر جایا کرتا تھا ، یا اُس کا جن کے ساتھ کاروبار ہے ، وہاں سے پتہ کیا ہے ؟ روبینہ نے کہا کہ اُس نے کہیں سے بھی پتہ نہیں کیا ۔

منیجر اتنی دیر سے خاموش بیٹھا تھا ۔ مَیں نے اُسے کہا ـــ "بیگم صاحبہ تو گھبرا گئی ہیں ۔ آخر عورت ذات ہیں ۔ یہ آپ کا کام تھا کہ اِدھر اُدھر سے پتہ کر لیتے ۔ شیخ صاحب بچے تو نہیں کہ لا پتہ ہو گئے ہوں گے یا کوئی انہیں اغوا کر کے لے گیا ہے ۔"

"مَیں نے تین جگہوں سے پتہ کرایا ہے" ـــ منیجر جمشید نے کہا ۔ "وہاں نہیں گئے ۔"

"کوئی اور ایسی جگہ نہیں جہاں سے اُن کا پتہ چل سکتا ہے؟" ـــ روبینہ نے پوچھا ۔

پہلی بیوی ، پُرانا مکان

میرے دل میں ایک شک اُٹھ رہا تھا ۔ یہ شک ان دونوں کے خلاف تھا ۔ میرا تجربہ ہے کہ بوڑھا خاوند ، جوان بیوی ، جوان منیجر کو جمع کرو تو حاصل جمع ایک جُرم ہوتا ہے جو اکثر قتل کی واردات ہوتی ہے ۔ ایسے ہی بوڑھا خاوند ، جوان بیوی اور بُوڑھے خاوند کا جوان بیٹا برابر ہوتے ہیں قتل کے ۔

مَیں نے روبینہ اور جمشید سے شیخ نثار کی فوٹو مانگی ۔ روبینہ نے پرس سے اُس کی ایک تصویر نکال دی جو وہ رپورٹ کے ساتھ پولیس کو دینے کے لئے لائی تھی ۔ شیخ نثار بُوڑھا تو تھا ، وہ بدصُورت بھی تھا ۔ حُلیے میں اُس کا رنگ سانولا یعنی کالا لکھا گیا تھا ۔ ایک بدصورت دوسرے بوڑھا ، مجھے راز کی بات نظر آنی شروع ہو گئی ۔ مَیں نے شیخ نثار کی مالی حیثیت اور کاروبار کی بابت سب کچھ پُوچھا ۔ پتہ چلا کہ وہ بہت امیر ہے اور اس کاروبار میں سے وہ لکھ پتی بنتا جا رہا ہے ۔

میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ جمشید اور روبینہ کی ناجائز دوستی ہے ۔ جمشید منیجر ہے اس واسطے کارخانہ اس کے ہاتھ میں ہے اور خاوند روبینہ کے ہاتھ میں ہے اس واسطے کہ بوڑھے لوگ جوان لڑکیوں کے ساتھ شادی کرتے ہیں تو ان کے غلام ہو جاتے ہیں ۔ قدرت کے خلاف کام کرنے کا یہی انجام ہوتا ہے ۔ اسی خیال کو دماغ میں گھما پھرا کر میں نے اپنا حساب کتاب اس طرح جوڑا کہ ان دونوں نے بوڑھے کو کہیں کنارے لگا دیا ہے اور یہ ثابت کرنے کے واسطے کہ انہیں کچھ پتہ نہیں کہ ان کے شیخ صاحب بتائے بغیر کہاں چلے گئے ہیں ، تھانے میں اُس کی گمشدگی کی رپورٹ دینے آ گئے ہیں ۔ اب کاروبار ان کا اپنا تھا ۔

مَیں نے جمشید سے پُوچھا کہ کارخانہ اور کاروبار کس طرح چلتا ہے ۔ اُس نے بتایا ۔ میرا شک پکا ہو گیا ۔ کارخانہ جمشید چلا رہا تھا ۔ مَیں ان سے یہ باتیں پُوچھ رہا تھا تو روبینہ نے تنگ آ کر افسروں کی طرح کہا ـــ "اتنی

باتیں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا خاوند لاپتہ ہو گیا ہے۔ آپ رپورٹ لکھیں اور اُس کی تلاش کریں۔ مَیں آپ کو انعام بھی دُوں گی۔"

مَیں نے غصّے کو اپنے اندر دبا لیا۔ اُس کے حکم نے اُس کے خلاف میرا شک اور زیادہ پکا کر دیا۔ مَیں نے اُسے کہا — "بیگم صاحبہ! آپ کے دماغ کو پیسہ چڑھا ہُوا ہے۔ اس پیسے نے آپ کے خاوند جیسے بہت سے خاوندوں کو لاپتہ کر دیا ہے۔ آپ کا دماغ میرے دماغ تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ تھانہ ہے، کھوکھوں اور چھولداریوں کا کارخانہ نہیں۔ مجھے اپنا حساب کتاب جوڑنا ہے کہ آپ کا خاوند کہاں جا سکتا ہے۔ وہ قتل ہو چکا ہو گا۔ وہ کسی اچانک ضرورت کی بابت شہر سے باہر چلا گیا ہو گا۔ وہ کسی حادثے میں رگڑا گیا ہو گا۔ وہ کسی ناچنے گانے والی کے کوٹھے پر شراب پی کر بے ہوش پڑا ہو گا" — مَیں نے آگے جھک کر آنکھیں اُس کی آنکھوں میں ڈال کر کہا — "اُس نے کہیں جا کر خودکشی کر لی ہو گی .... کس واسطے؟ .... آپ کو معلوم ہے کس واسطے۔ مجھے معلوم ہے کس واسطے۔"

اُس نے آنکھیں جھکا لیں۔ اس کا مُخبر تو چُپ بیٹھا تھا۔ وہ اُس وقت بولتا تھا جب میں اُس سے کچھ پوچھتا تھا۔

"آپ کا یا آپ کے خاوند کا دشمن کون کون ہے؟"

"کوئی بھی نہیں" — روبینہ نے جواب دیا۔

"کیا آپ کے خاوند کی پہلی بیوی اور اُس کے بھائی وغیرہ اُس کے اور آپ کے دشمن نہیں؟" — اس جوان بیوی کو دیکھ کر میرے دماغ میں یہ خیال آیا تھا کہ شیخ نثار کی پہلی بیوی ضرور ہو گی — "کیا شیخ نثار نے پہلی بیوی کو طلاق دے دی ہے؟"

"نہیں" — روبینہ نے جواب دیا۔ "وہ پُرانے مکان میں رہتی ہے۔ شیخ صاحب اُسے ماہوار خرچ دیتے ہیں۔"

روبینہ نے اس سے پہلے اپنے خاوند کی پہلی بیوی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ شاید اسے پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی۔ روبینہ اور جمشید پہ میرا شک اتنا پکا ہو چکا تھا کہ مَیں بہت خوش ہُوا کہ ایک بہت بڑی واردات کے مجرم خود میرے پاس آ گئے ہیں۔ مجھے یہ بھی نظر آنے لگا تھا کہ شیخ نثار زندہ نہیں۔ یہ بھی خیال میرے سامنے تھا کہ شیخ نثار نے اس شوباز بیوی کی کرتوت سے تنگ آ کر کہیں دُور جا کر خودکشی کر لی ہے۔ دریا قریب تھا۔

مَیں نے روبینہ کو کہا کہ وہ باہر بیٹھے۔ اُسے یہ اُمید تھی کہ مَیں فوراً اس کے خاوند کی گمشدگی کی رپورٹ درج کر لُوں گا۔ مَیں نے کچھ اور ہی چکر چلا دیا تو گھبرانے لگی اور اُسے غصّہ بھی آیا۔ اُس نے اپنے مینجر کی بابت مجھے کہا — "اسے زیادہ دیر نہ روکنا۔ کارخانے میں کام ہو رہا ہے۔"

"آپ زیادہ دیر کی بات کرتی ہیں روبینہ صاحبہ!" — مَیں نے مُسکراتے ہُوئے کہا — "انہیں تو شاید زیادہ دن میرے پاس رہنا پڑے گا۔"

"کیوں؟" — وہ بہت حیران ہُوئی۔

"آپ ذرا باہر چلیں" — مَیں نے کہا — "ابھی تو مَیں آپ سے انعام بھی لُوں گا۔"

اپنا خُفیہ خاوند بنا لیا

مَیں آپ کو اُس زمانے کی ایک خاص بات بتاتا ہُوں۔ مسلمان کے پاس جب دولت آتی ہے تو وہ مسجدوں اور یتیم خانوں کو چندہ دیتا ہے اور اپنی عمر کو بھول کر جوان لڑکی کے ساتھ شادی کر لیتا ہے۔ مَیں نے آپ کو بتایا ہے کہ جنگِ عظیم میں ٹھیکیداریوں نے ٹھیکیداروں کے گھر دولت سے بھر دیئے تھے۔ اس طرح کے بہت سارے واقعات ہوتے کہ نُود دیتے بوڑھوں نے نقد پیسہ لڑکیوں کے والدین کو دے کر جوان لڑکیوں کے ساتھ شادیاں رچا لیں اور پُرانی بیویوں کو چُھٹی دے دی۔ جوان بیویوں نے جو کارنامے کئے وہ اس طرح تھے کہ درپردہ دوستیاں پیدا کر لیں۔ بعض نے بوڑھے خاوندوں سے جائیدادیں اپنے نام لکھوا کر انہیں لاپتہ کر دیا۔ بعض بوڑھوں نے خودکشی کر لی۔ بعض نے اپنی جوان بیویوں کو قتل کر دیا، اور جو

جوان بیویاں بوڑھے خاوندوں کے ساتھ آباد رہیں اُن کے خاوندوں نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھے رکھی۔

شیخ نثار کا کیس بھی مجھے ایسا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ اُس نے خودکشی کی ہے یا روبینہ اور جمشید کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے۔

"جمشید بھائی!" — روبینہ باہر چلی گئی تو میں نے جمشید سے پوچھا — "جو بات تم کل پرسوں بتاؤ گے، وہ ابھی بتا دو۔ تم ان لوگوں کے ملازم ہو۔ اپنی زندگی برباد نہ کرو۔"

اُس نے انکار کیا تو میں نے ذرا ڈرایا۔ اُس نے پھر انکار کیا تو میں نے پوچھا — "تم مجھے اتنا بُدھو سمجھتے ہو کہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ روبینہ کے ساتھ تمہارے تعلقات کس قسم کے ہیں؟ تم ایک تھانیدار کو بیوقوف نہیں بنا سکو گے جمشید! مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے اور روبینہ کے تعلقات کی بابت شیخ نثار کو پتہ تھا؟"

"نہیں" — اُس نے آہستہ سے سر ہلایا کہ شیخ نثار کو پتہ نہیں تھا۔ اُس نے کہا — "لیکن آپ اس سے یہ شک نہ کریں کہ میں نے شیخ صاحب کو غائب کر دیا ہے۔ وہ واقعی لاپتہ ہوتے ہیں اور میں آپ کو ساری بات بتاتا ہوں کہ انہیں بیگم صاحبہ نے کیوں لاپتہ سمجھا ہے۔"

اُس کی زبانی یہ قصہ اِس طرح بنا کہ شیخ نثار نے کار کے لیے ڈرائیور رکھا ہوا تھا۔ وہی اُسے کارخانے لے جاتا اور واپس لاتا تھا۔ کل صبح شیخ نثار نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ کارخانے چلا جائے اس واسطے کہ کار وہ خود چلائے گا۔ اُس نے کسی کو نہیں بتایا کہ وہ کارخانے کی بجائے کہیں اور جا رہا ہے۔ وہ آدھا دن گزر جانے کے بعد بھی کارخانے نہ پہنچا۔ جمشید کو اُس کی ضرورت تھی۔ اُس نے شیخ نثار کے گھر ایک آدمی کو بھیجا کہ شیخ نثار کو گھر سے بلا لائے۔ روبینہ نے بتایا کہ شیخ نثار صبح سویرے چلا گیا تھا۔

وہ شام تک نہ آیا، پھر رات گزر گئی اور دن بھی گزر گیا۔ روبینہ پریشان ہو گئی۔ تین جگہ جمشید نے پتہ کیا۔ اُس کا اتا پتہ نہ ملا۔ جمشید نے مجھے بتایا کہ وہ ابھی پولیس کو رپورٹ نہیں دینا چاہتا تھا، اس واسطے کہ وہ ایک اور شہر سے بھی پتہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ شیخ نثار کاروبار کی بابت وہاں جایا کرتا تھا۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو شیخ نثار کے کارخانے سے ڈرائیور کو بلا لانے کے واسطے بھیج دیا۔ جمشید کو میں نے ایک مرتبہ پھر کہا کہ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپا سکتا، اس واسطے کہ میرے خفیہ ذریعے زمین کے نیچے سے بھی راز نکال کر لے آتے ہیں۔ میں اُس سے پوچھتا رہا اور وہ ہر سوال کا جواب دیتا رہا۔ روبینہ کی بابت اُس نے بتایا کہ آزاد خیال اور شوباز ہے۔ وہ اس شہر سے پچیس میل دُور ایک قصبے کی رہنے والی تھی۔ ۱۹۴۱ء میں شیخ نثار کی فوجی ٹھیکیداری چل پڑی۔ وہ معمولی سا دکاندار تھا۔ اُس نے روبینہ کے باپ کو تیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ نئی کوٹھی روبینہ کے نام پر بنوانی شروع کی۔ پہلی بیوی کو پرانے مکان میں رہنے دیا۔ روبینہ کے باپ نے یہ شرط منوائی کہ شیخ نثار پہلی بیوی کے ساتھ کوئی ملاقات نہیں کرے گا۔ اگر چاہے تو اُسے اور اولاد کو ماہوار خرچہ دے سکتا ہے۔

آپ ایسا سمجھیں کہ شیخ نثار نے روبینہ کو خریدا تھا۔ اُس کی پہلی بیوی سے ایک لڑکی عمر تیئس سال تھی۔ ایک لڑکا عمر بیس اکیس سال، دوسرا لڑکا سولہ سترہ سال۔ پھر ایک لڑکی بارہ تیرہ سال۔ شیخ نثار ان کو ماہوار خرچ دیتا تھا۔ روبینہ نے شیخ نثار کو اپنا غلام بنا لیا۔ جمشید نے اقبال کیا کہ وہ روبینہ کو پہلے سے جانتا تھا۔ دُور پار کی رشتہ داری تھی۔ ایسا ویسا تعلق نہیں تھا۔ ایک بار جمشید نے روبینہ سے کہا کہ اپنے خاوند سے کہے کہ کہیں نوکری دلا دے۔ روبینہ نے اُسے اپنے کارخانے میں رکھ لیا اور اس پہ مہربان ہو گئی۔ اسے منیجر روبینہ نے ہی بنوایا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ روبینہ نے اُسے اپنا خفیہ خاوند بنا لیا۔ جمشید نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ

روبینہ کے تعلقات اور کسی کے ساتھ نہیں لیکن وہ اچھے چال چلن کی لڑکی نہیں۔

حرام کی دولت، گھر کی غیرت

ڈرائیور آ گیا تھا۔ جمشید کو باہر بٹھا کر ڈرائیور کو اندر بلا لیا۔ وہ ادھیڑ عمر کا شریف آدمی تھا۔ اُس نے میرے سامنے آتے ہی ہاتھ جوڑ کر کہا کہ جنابِ عالی! مَیں ان لوگوں کی نوکری چھوڑ رہا ہوں۔ مَیں اسے بھی مشتبہ سمجھتا تھا۔ اسے بٹھا کر مَیں نے کہا کہ تم ان کی نوکری کرو چاہے چھوڑ دو، مَیں جو تم سے پوچھوں گا وہ مجھے سولہ آنے سچ معلوم ہونا چاہیئے۔ اُس نے مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہیں کی۔ مَیں نے اسے بہت ساری باتیں اِدھر اُدھر سے گھما پھرا کر آزمایا۔ وہ مجھے بیگناہ اور بھلے مانس نظر آیا۔ اُسے شیخ نثار نے کہا تھا کہ وہ کارخانے چلا جائے اور کار شیخ نثار خود چلائے گا۔ اُس نے ڈرائیور کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ کارخانے گیا ہی نہیں۔ ڈرائیور نے میرے سوال کے جواب میں کہا کہ منیجر جمشید سارا دن کارخانے میں رہا۔ روبینہ کی بات اُس کو پتہ نہیں تھا کہ گھر میں رہی یا کہیں چلی گئی۔ رات کو ڈرائیور اپنے گھر چلا جایا کرتا تھا۔

ڈرائیور نے اس طرح باتیں کیں جس طرح کوئی آدمی بہت تنگ آیا ہُوا ہوتا ہے، اس واسطے کہ وہ نمازی پرہیزگار بھی تھا اور مَیں نے اسے صاف ڈرا دیا تھا کہ بعد میں میرے مُخبروں کے ذریعے مجھے کوئی بات معلوم ہُوئی جو اُس نے چھپائی تھی تو مَیں اس جُرم میں اُس کو بھی شامل کر کے اندر کر دُوں گا۔

اُس نے کہا کہ حرام کی دولت نے اس گھر سے غیرت نکال دی ہے۔ وہاں یہ ہوتا تھا کہ روبینہ اُن افسروں کے پاس جاتی تھی جو سپلائی کے آرڈر دیتے تھے۔ وہاں تک اُسے ڈرائیور لے جایا کرتا تھا۔ ڈرائیور نے مجھے کہا ۔۔۔ "آپ نے اس کی خوبصورتی اور چال ڈھال دیکھی ہے۔ یہ اس کا

جادو ہے جو اس کا خاوند ہر کسی پر چلاتا ہے۔ سچی بات یہ ہے جی! اس کا نکاح شیخ نثار کے ساتھ پڑھا گیا ہے لیکن اس نے منیجر جمشید کو اپنا خاوند بنا رکھا ہے۔"

"تم نے کبھی محسوس کیا ہے کہ شیخ نثار نے جمشید کو روبینہ سے ملنے سے روکا ہو؟" ۔۔۔ مَیں نے پوچھا ۔۔۔ "وہ جمشید کے ساتھ خوش رہتا تھا یا ناراض؟"

"شیخ نثار اتنی جرأت نہیں کر سکتا جی!" ۔۔۔ ڈرائیور نے جواب دیا ۔۔۔ "وہ روبینہ کا غلام ہے اور جمشید کے بغیر وہ ایک قدم نہیں چل سکتا۔ شیخ نثار روبینہ کے ساتھ بھی خوش رہتا ہے اور روبینہ اُس کے ساتھ خوش ہے۔ اُس کی بہت خدمت کرتی ہے۔"

"کل صبح شیخ نثار نے تمہیں کہا کہ تم کارخانے چلے جاؤ، اُس وقت وہ ذرا پریشان نظر آتا تھا؟" ۔۔۔ مَیں نے پُوچھا۔

"نہیں" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "وہ روزانہ کی طرح نظر آتا تھا۔"

ڈرائیور اس سارے خاندان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اُس نے شیخ نثار کی پہلی بیوی کی تعریف کی اور اُس کی اولاد کے بارے میں بتایا کہ بڑا لڑکا شہر کی ہاکی اور فٹ بال ٹیم کا کھلاڑی ہے۔ اُس کا اُٹھنا بیٹھنا ایسے لڑکوں کے ساتھ ہے جو اچھی شہرت والے نہیں۔ ڈرائیور نے یہ بھی بتایا کہ اُس کی بڑی لڑکی کسی کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے جاتی ہے۔ ڈرائیور شیخ نثار کو پہلی بیوی کے گھر کبھی نہیں لے گیا تھا۔ ایسا ہُوا ہوگا کہ شیخ نثار ڈرائیور کے بغیر کبھی وہاں گیا ہو۔

ڈرائیور سے مَیں نے وہ ساری باتیں پُوچھ لیں جو میرے دماغ میں آئی تھیں۔ اسے باہر بھیج کر مَیں سوچنے لگا کہ گمشدگی کی رپورٹ درج کروں یا ان لوگوں سے کہوں کہ وہ انتظار کریں یا بتا دیں کہ انہوں نے اسے کہاں غائب کر دیا ہے۔ مَیں نے اس شک پر بھی غور کیا کہ شیخ نثار ایسی جگہ گیا ہے جو وہ اپنی بیوی کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ ایسا بھی ممکن تھا

کہ وہ پہلی بیوی یا اُس کی اولاد کے کسی کام سے گیا ہو اور یہ کام روبینہ سے خفیہ رکھنا چاہتا ہو۔ پھر یہ سوچ بھی آئی کہ وہ شہر سے باہر گیا ہے اور حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔ اُس زمانے میں سڑکوں کے حادثے ذرا زیادہ ہو گئے تھے۔ وجہ اس کی یہ ہو گئی تھی کہ جنگ کی وجہ سے فوجی ٹرک بہت چلتے تھے۔ فوجی ڈرائیور لاپرواہ تھے اور وہ تجربہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ وہ بہت حادثے کرتے تھے۔

نیلی کار

روبینہ کو میں نے اندر بلا لیا۔ اُس کا دماغ بہت خراب ہو گیا تھا۔ وہ انگریز اور ہندو افسروں کے پاس جانے والی عورت تھی اس واسطے دماغ اُس کا گڑبڑ کرنے لگا تھا۔ اُس نے مجھے ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دی۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ تم جیسے تھانیدار رشوت لینے کے واسطے ہم جیسی شریف عورتوں کو تنگ کرتے ہیں۔

"بیگم صاحبہ!" — میں نے اُسے کہا — "میں کھوکھے بنانے والے کارخانے کا منیجر نہیں ہوں۔ اس تھانے کا انچارج ہوں۔ ضرورت کے واسطے آپ کو ساری رات یہاں رکھ سکتا ہوں۔"

وہ بہت ہی کھلی عورت تھی اس واسطے اُس کی زبان سے بہت گھٹیا بات نکل گئی۔ اُس نے کہا — "میں تم جیسوں کے پاس ساری رات کبھی نہیں رہی" — اُس نے ایک اور ایسی بات کہہ دی کہ مجھے اپنا چپڑاسی یا ڈرائیور سمجھ لیا۔

میں نے بڑے آرام سے اُسے کہا — "تیس ہزار روپیہ بِکی ہوئی اور ٹھیکے لینے کے واسطے استعمال ہونے والی عورت پر ایک تھانیدار اعتبار نہیں کر سکتا۔ میں تمہارے فائدے کی بات کر رہا تھا۔ میں تمہیں خبردار کر دیتا ہوں کہ تمہارے خاوند کی گمشدگی کی رپورٹ میں نے لکھ لی تو تم بھی گرفتار

ہو سکتی ہو اور تمہارا منیجر بھی۔ تم پولیس سے کیا چھپا سکتی ہو۔ تمہاری کوئی حرکت کسی کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔"

میں ایسے ہی بکتا جھکتا رہا اور وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ کر میرے سامنے بیٹھ گئی اور اُس کا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے رونے پر آ جاتے گی۔ میں نے اُسے کہا — "تم نے مجھ سے بعض ضروری باتیں چھپائی ہیں۔ ابھی تو میں نے تمہارے منیجر اور ڈرائیور سے باتیں پوچھی ہیں۔ میں ہر اُس جگہ سے تمہاری رپورٹ لوں گا جہاں تم جاتی ہو۔"

وہ تڑپنے لگی اور پھر وہ رونے لگی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ خود ہی بتا دے کہ شیخ نثار زندہ یا مُردہ کہاں ہے۔ اس پر وہ بہت تڑپی۔ اُس کی ساری کلف اُتر گئی تھی۔ میں نے خیال کیا کہ یہ اپنے خاوند کی گمشدگی کی رپورٹ دینے آئی ہے۔ اس کا رسوخ اوپر بھی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جا کر میری رپورٹ کر دے اور ایسی عورت کا کیا جاتا ہے۔ میرے ڈی ایس پی یا کسی اور افسر سے کہہ دے کہ اس تھانیدار نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔

میں نے شیخ نثار احمد کی گمشدگی کی رپورٹ درج کر لی۔ اُس کا حُلیہ اور فوٹو ریکارڈ میں شامل کر لیا اور اس کام میں جو کاغذ پتر تیار کرنے پڑتے ہیں وہ کر لئے اور روبینہ، جمشید اور ان کے ڈرائیور کو رخصت کر دیا۔ رات بہت گزر گئی تھی۔ میں باہر جا کر بیٹھ گیا۔ اے۔ ایس۔ آئی دلونذر، ہیڈ کانسٹیبل اور تین چار کانسٹیبل بھی آ کر بیٹھ گئے اور اسی کیس کی بات چل پڑی۔ میں نے کہا کہ ہلکے نیلے رنگ کی ایک کار کا سراغ مل جاتے تو ہی اس کیس کا سرا پیر مل سکتا ہے۔

ہمارے پاس ایک کانسٹیبل بیٹھا ہوا تھا۔ وہ جنگ کا زمانہ تھا۔ شہر میں پولیس کی گشت ہوتی تھی۔ ریلوے سٹیشن کے اندر اور باہر ایک ایک کانسٹیبل ڈیوٹی پر رہتا تھا۔ یہ کانسٹیبل دن کو ریلوے سٹیشن کے باہر ڈیوٹی پر تھا۔ اُس نے میرے منہ سے نیلی کار کا نام سن کر کہا، کل صبح سے ایک کار سٹیشن کے باہر کھڑی ہے۔ روبینہ مجھے کار کا نمبر بتا گئی تھی۔ میں

نے اسی کانسٹیبل کو سائیکل دے کر ریلوے سٹیشن کو دوڑا دیا کہ کار کا نمبر دیکھ آئے۔

یہ واقعہ ۱۹۴۸ء کے شروع کا ہے۔ اُس وقت شہروں میں اتنی زیادہ کاریں نہیں ہوتی تھیں۔ سکوٹر اور ہونڈے وغیرہ تو بالکل نہیں تھے۔ کار کسی بہت ہی امیر آدمی کے پاس ہوتی تھی، اس واسطے کسی ایک خاص کار کا پتہ چلانا آسان ہوتا تھا۔ آپ ڈیوٹی کانسٹیبل کی رپورٹ سے خود حساب کر لیں کہ کاریں کتنی تھیں۔ اُس نے واپس آکر نیلی کار کا وہی نمبر بتایا جو روبینہ لکھا گئی تھی۔ یہ شیخ نثار کی کار تھی۔ وہ وقت دلّی کو جانے والی ایک ایکسپریس گاڑی کا تھا جس وقت کار وہاں کھڑی کی گئی تھی۔ کانسٹیبل نے بتایا کہ گاڑی کے وقت چار کاریں آئی تھیں تین واپس چلی گئیں اور یہ نیلی کار وہیں کھڑی رہی۔ آج کل تو چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بھی درجنوں کاریں اِدھر اُدھر کھڑی یا گھومتی پھرتی رہتی ہیں۔

کار غائب، کانسٹیبل معطل

یہ اللہ کی مہربانی ہوئی کہ مجھے کار کا سراغ مل گیا جو مطلوب کار تھی۔ مَیں اُسی وقت اس کانسٹیبل کو، اے۔ ایس۔ آئی اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ لے کر ریلوے سٹیشن کو چلا گیا۔ کار دیکھی۔ دروازے کا تالا لگا ہوا تھا۔ شیشوں میں سے اندر دیکھا۔ کار بالکل خالی تھی۔ کانسٹیبل نے اُس آدمی کو اچھی طرح نہیں دیکھا تھا جو کار یہاں چھوڑ گیا تھا۔ مَیں نے یہ خیال کیا کہ شیخ نثار کسی ایسی جگہ گیا ہے جو وہ اپنی بیوی کو نہیں بتانا چاہتا تھا، اس واسطے اُس نے ڈرائیور کو کہا تھا کہ وہ کارخانے چلا جائے اور وہ کار خود چلائے گا۔

شیخ نثار امیر آدمی تھا، اس واسطے وہ تھرڈ یا انٹر میں نہیں گیا ہو گا۔ میں ریزرویشن آفس میں گیا۔ سیکنڈ اور فرسٹ کلاس کی بکنگ دیکھی شیخ نثار کی سیٹ ریزرو نہیں تھی۔ اُس کا نام رجسٹر میں نہ مِلا۔ آپ نے دیکھا ہو گا

کہ جب کار، ٹیکسی، رکشا اور تانگہ ریلوے سٹیشن کے باہر سواریاں اتارنے کے لئے رکتا ہے تو قلی سامان اُٹھانے کے لئے دوڑتے ہوئے آجاتے ہیں۔ مَیں کار کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ رات کو بھی دو گاڑیاں گزرتی تھیں اس واسطے قلی باہر موجود تھے۔ مَیں نے اے۔ ایس۔ آئی اور ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ باہر جو قلی موجود ہیں ان سے پوچھ کر اس کار والے کو کسی نے دیکھا ہو گا۔

آدھے گھنٹے بعد دو قلی مل گئے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ کار آکر رُکی تو وہ دونوں سامان اُٹھانے کے لئے کار کے پاس گئے۔ کار میں صرف ایک آدمی تھا۔ اُس نے کہا کہ سامان نہیں ہے۔ قلی ذرا پرے ہٹ گئے۔ اس شخص نے کار کے شیشے اُوپر کئے اور دروازے میں چابی لگا کر سٹیشن کے اندر جانے کی بجائے شہر کی طرف چلا گیا۔

مَیں شیخ نثار کا فوٹو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ وہ قلیوں کو دکھایا تو دونوں نے اسے بہت غور سے دیکھا پھر دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ آپس میں صلاح مشورہ کر کے انہوں نے کہا کہ یہ شخص کار نہیں لایا تھا۔ اُس کا چہرہ اتنا پھُولا ہُوا نہیں تھا۔ مَیں نے یہ کارروائی کی کہ ایک کانسٹیبل مقرر کر دیا کہ وہ بغیر وردی یعنی پرائیویٹ کپڑوں میں سٹیشن کے باہر کار سے دُور دُور موجود رہے اور جو کوئی کار لے جانے لگے اُسے روک لے اور اُسے تھانے میں لے آئے۔ روکنے کے لئے باوردی کانسٹیبل ڈیوٹی پر موجود ہوتا تھا۔ مَیں نے روبینہ اور جمشید کو کار سے بے خبر رکھا۔ کانسٹیبل بغیر وردی رات کو ہی کھڑا کر دیا گیا۔

یہ رات گزر گئی۔ مَیں نے رات والے بغیر وردی کانسٹیبل کی بدلی کر دی۔ اگلے روز بھی کار وہیں کھڑی رہی۔ مَیں نے مخبروں سے اور کچھ معزز اشخاص سے شیخ نثار اور روبینہ کی بابت پوچھا۔ سب نے کہا کہ بے غیرت اور بے حیا لوگ ہیں۔ شیخ نثار برادری سے کٹ گیا ہے اور اُس کی نئی بیوی تین چار ہندو اور انگریز افسروں کی داشتہ بنی ہوئی ہے۔

شیخ نثار کی پہلی بیوی کی سب نے تعریف کی۔ اس کے بیٹوں کے خلاف کوئی الزام کسی نے نہیں لگایا لیکن انہیں ان لوگوں نے اچھا نہیں کہا۔

میرے دماغ میں دو خیال آتے رہے۔ ایک یہ کہ کوئی سنگین گڑبڑ ہوئی ہے اور دوسرا یہ کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں نے اس طرف تو دھیان ہی نہیں دیا کہ وہ اپنی پہلی بیوی کے پاس چلا گیا ہوگا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ بعد میں اس بیوی اور اس کے بیٹوں سے بھی ملوں گا۔

رات بھی گزر گئی۔ دو بغیر وردی کانسٹیبل باری باری سٹیشن کے باہر موجود رہے۔ صبح ہوئی تو بغیر وردی کانسٹیبل منہ لٹکائے ہوئے آیا اور رپورٹ دی کہ کار غائب ہوگئی ہے۔ رات تین بجے تک کار وہیں تھی۔ وقت ایک پسنجر ٹرین کا تھا۔ کانسٹیبل کہیں اِدھر اُدھر ہوگیا اور کار کوئی لے گیا۔ دونوں کانسٹیبل قلیوں وغیرہ سے پوچھتے رہے۔ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ کار کون لے گیا ہے۔ میں نے دونوں کانسٹیبلوں کو (ایک جو وردی میں ڈیوٹی دیتا تھا اور دوسرا بغیر وردی) کوتاہی کے جرم میں معطل کرا دیا۔ مجھے ان پر یہ شک ہوا تھا کہ انہوں نے اُس شخص سے رشوت لی ہے جو کار لے گیا ہے۔

میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ شیخ نثار کے گھر جا کر دیکھے کہ وہ آگیا ہے؟ اگر وہ نہ آیا ہو تو اُس کی بیوی کو کار کی بابت کچھ نہ بتائے بلکہ کوٹھی میں دیکھے کہ کار وہاں ہے یا نہیں۔

اے۔ ایس۔ آئی گیا اور یہ اطلاع لے کر آیا کہ شیخ نثار بھی نہیں آیا اور کار بھی نہیں آئی۔

کار دریا میں، لاشیں کار میں

میں چکرا گیا۔ اب یقین ہوگیا کہ کوئی سنگین گڑبڑ ہوئی ہے۔ دو اور خیال آئے۔ ایک یہ کہ کار کوئی کار چور لے گیا ہوگا۔ چور تجربہ کار ہوگا۔

اُسے معلوم ہوگا کہ یہاں باوردی کے علاوہ بغیر وردی کانسٹیبل بھی موجود ہے۔ اُس نے دونوں کو جونہی بے خبر اور لاپرواہ دیکھا وہ کار لے گیا۔ اُس نے کار چوری کا وقت بھی مناسب دیکھا۔ اُس وقت پسنجر ٹرین آئی تھی۔ سٹیشن کے باہر رش تھا۔ دوسرا خیال یہ آیا کہ شیخ نثار خود کار لے گیا ہے اور اس واسطے وہ روپوش ہے کہ اُس نے ٹھیکے اور سپلائی میں کسی افسر کے ساتھ مل کر گورنمنٹ کو دھوکہ دیا ہوگا جو کسی نے پکڑ لیا ہوگا۔

میں انہی چکروں میں پڑا سوچ رہا تھا۔ دو اڑھائی گھنٹے گزر گئے تھے۔ دو آدمی اطلاع دینے آئے کہ دریا میں ایک کار پڑی ہے۔ پانی میں سے پوری چھت نظر آرہی ہے۔ کسی نے کار کو باہر نکالنے کی کوشش نہیں کی نہ کسی ماہی گیر یا ملاح نے پانی میں اُتر کر دیکھا ہے کہ کار کے اندر کیا ہے۔ اگر کچھ ہوا بھی تو لاشیں ہی ہوں گی۔ کار کی چھت کا رنگ نیلا ہے۔

دریا شہر سے ایک میل کے لگ بھگ فاصلے پر تھا اور جہاں کار پڑی تھی وہ جگہ تین میل سے ذرا زیادہ دُور تھی۔ وہ علاقہ میرے تھانے میں نہیں تھا۔ میں نے اس علاقے کے تھانے کو اطلاع دی اور خود بھی وہاں چلا گیا۔ اُس علاقے کا تھانیدار بھی پہنچ گیا۔ ہم دونوں تھانیداروں نے سب سے پہلے ٹائروں کے نشان دیکھے۔ کار سڑک سے اُتر کر کچے میں آئی۔ آگے دریا کی ریت تھی۔ وہاں ذرا ڈھلان تھی۔ تین چار آدمیوں کے پاؤں کے نشان تھے۔ انہوں نے کار کو دھکا دیا۔ ان کا شاید یہ خیال تھا کہ کار دریا میں ڈوب جائے گی لیکن وہاں پانی اتنا گہرا نہیں تھا۔ کار اتنے پانی میں جا کر رُک گئی جہاں اس کی چھت پانی سے باہر رہی۔

ہم نے ملاحوں اور تماشائیوں کو اکٹھا کیا۔ رسّے منگوائے۔ دو ملاحوں نے پانی میں جا کر کار کے پچھلے بمپر کے ساتھ رسّے باندھے۔

وہاں کم از کم چالیس آدمی اکٹھے ہو گئے تھے۔ اتنے سارے آدمیوں نے زور لگایا تو کار باہر آگئی۔ اس کے شیشے اُترے ہوئے تھے۔ دروازے مقفل نہیں تھے۔ کار پانی سے بھری ہوئی تھی۔ پانی سے باہر آتے ہی اس میں سے پانی نکلنے لگا۔ دروازے کھولے تو پانی فوراً نکل گیا۔ پچھلی سیٹ پر ایک لاش پڑی تھی۔ اس کی ٹانگیں دُہری کی ہوئی تھیں، اس واسطے کہ لاش سیٹ پر آجاتے۔ یہ کار شیخ نثار کی تھی۔ وہی نمبر اور رنگ تھا۔

مَیں نے ایک کانسٹیبل کو اس کام پہ دوڑا دیا کہ روبینہ اور جمشید کو اپنے ساتھ لے آتے۔ لاش اور کار کی برآمدگی کی ہم نے کارروائی مکمل کی۔ روبینہ اور جمشید آگئے۔ انہوں نے لاش پہچان لی۔ لاش شیخ نثار کی تھی۔ روبینہ نے رونا چیخنا شروع کر دیا اور اُس نے کہا کہ اُس کے خاوند کو اُس کے بیٹوں نے قتل کیا ہے اور اُن کی ماں نے قتل کرایا ہے۔ مَیں نے اُسے کہا کہ جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ اب حوصلہ کرے اور یہ مجھے بتائے کہ اُس نے شیخ نثار کی پہلی بیوی اور بیٹوں پر کیوں شک کیا ہے مجھے دراصل روبینہ اور جمشید پہ شک تھا لیکن روبینہ کے اس شک پر بھی غور کرنا تھا جو اس نے ظاہر کیا تھا۔

لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دی۔

اتنا حسین چہرہ، اتنا قہر اور غضب

مَیں نے ہر اُس مرد اور عورت کو شاملِ تفتیش کر لیا جس پہ مجھے تھوڑا سا بھی شک تھا۔ سب سے بڑے مشتبہ دو تھے۔ روبینہ اور جمشید۔ ان کے بعد ان کا ڈرائیور اور اس کے بعد مقتول کی پہلی بیوی کے دونوں بیٹے۔ مَیں نے ان دونوں کو تھانے بلانے سے پہلے مخبروں اور قابلِ اعتبار محلے داروں سے مقتول کی پہلی بیوی کے گھر کے حالات معلوم کرنے کا انتظام کیا اور یہ کام اے۔ ایس۔ آئی کے سپرد کیا۔ یہ کام ہو جانے

تک مَیں نے روبینہ کو الگ بٹھا کر جمشید کو رگڑنا شروع کر دیا۔ اسے مارا پیٹا نہیں اور کوئی زیادتی نہ کی۔ صرف باتیں پوچھتا رہا اور اُسے چکر آنے لگے۔ اتنا جوانمرد اور خوبصورت جوان بچوں کی طرح رو پڑا۔

دوپہر کے بعد مجھے پہلی بیوی کے گھر کی رپورٹ مل گئی۔ اس میں میرے مطلب کی ایک دو باتیں تھیں۔ ضروری بات یہ پتہ چلی کہ شیخ نثار تین چار دن پہلے پہلی بیوی کے گھر گیا تھا۔ یہ کسی کو پتہ نہیں تھا کہ کیوں گیا تھا۔ بڑے بیٹے کی بابت پتہ چلا کہ باپ کے خلاف بولتا رہتا ہے اور غصے میں آجاتا ہے۔ چھوٹا بڑے سے زیادہ تیز ہے۔ ان کی بڑی بہن کسی کے گھر بچوں کو پڑھانے جاتی ہے۔ برقعے کے بغیر باہر نہیں نکلتی۔ لڑکی طبیعت کی تیز طرار بتائی گئی۔ چال چلن کی بابت کوئی ایسی ویسی رپورٹ نہ ملی۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی آگئی۔ مقتول کے گلے میں رسّی کا پھندا ڈال کر مارا گیا تھا۔

مَیں نے دونوں بھائیوں کو بلا لیا۔ پہلے بڑے کو اپنے پاس بٹھایا اور اُس سے پوچھا ــــ "تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا باپ قتل ہو گیا ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں" ــــ اُس نے بڑے آرام سے جواب دیا ــــ "قاتل نے میرا سینہ ٹھنڈا کر دیا ہے" ــــ پھر اُس نے پوچھا ــــ "کس نے قتل کیا ہے؟ اُس کی بیوی اور جمشید نے کیا ہوگا۔"

"تم نے ان پر کیوں شک کیا ہے؟" ــــ مَیں نے پوچھا۔

اُس نے ایک لمبی کہانی شروع کر دی جو مَیں نے آپ کو پہلے ہی سُنا دی ہے۔ میں سُنتا رہا کہ شاید وہ کوئی نئی بات سُنا دے لیکن وہ شک کی باتیں کر رہا تھا۔ میرے خیال میں یہ آ رہا تھا کہ یہ نوجوان اپنے باپ کا قاتل نہیں۔ وہ اپنے باپ کے خلاف نفرت ظاہر کر رہا تھا، پھر بھی میں اُسے بے گناہ سمجھنے لگا۔ میں سوچ چکا تھا کہ اس کے ساتھ میرے کم از کم تین

گھنٹے لگ جائیں گے لیکن اچانک خدا نے میرا کام فوراً ختم کر دیا۔ ہوا اس طرح کہ باہر مجھے کچھ شور شرابہ سُنائی دیا۔ ایک عورت کی آواز آئی — "میرے بھائی کہاں ہیں؟"

اُسے میرے کانسٹیبل روک رہے تھے کہ اندر نہ جانا۔ وہ کہہ رہی تھی — "کہاں ہے تمہارا تھانیدار" — مقتول کے بڑے بیٹے نے کہا — "یہ میری بہن کی آواز معلوم ہوتی ہے" پھر ایک اور عورت کی آواز آئی — "یہ بدبخت پاگل ہوگئی ہے بھائیو! یہ پاگل ہوگئی ہے۔"

مَیں باہر نکلا۔ ایک عورت تھی جس پر سفید پُرانے ٹاٹ کا برقعہ تھا۔ دوسری جوان لڑکی تھی جس کا کالا برقعہ تھا۔ وہ بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ مقتول کا بڑا بیٹا بھی باہر آگیا اور اس کا چھوٹا بھائی جسے میں نے الگ بٹھایا تھا، وہ بھی آگیا۔ ان سے پتہ چلا کہ عورت ان کی ماں ہے، شیخ نثار کی پہلی بیوی اور لڑکی ان کی بہن ہے۔ بہن تو کسی کے ہاتھ نہیں آرہی تھی۔ مَیں نے اُسے تسلی سے کہا — "بی بی! کیا بات ہے۔ آؤ، اندر آجاؤ" — اُسے اپنے دفتر میں لے گیا اور اُسے بتایا کہ مَیں تھانیدار ہوں۔ بتاؤ، کیا بات ہے۔

"میرے بھائیوں کو کیوں یہاں بُلایا ہے؟" — اُس نے غصے سے پوچھا۔

"تمہیں شاید پتہ نہیں چلا" — مَیں نے کہا — "تمہارا باپ قتل ہوگیا ہے۔"

"آپ کو آج پتہ چلا ہے" — اُس نے کہا — "مجھے دو روز پہلے کا پتہ ہے کہ وہ بدکار مردُود قتل ہوگیا ہے۔"

"تمہیں کس طرح پتہ چلا تھا؟"

اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں شیر کے پنجوں کی طرح کرکے ہاتھ میری طرف کیے جیسے وہ میرا منہ نوچ ڈالے گی۔ اُس کا اتنا حسین چہرہ اتنا لال ہوگیا جیسے خون پھوٹ کر باہر آجائے گا۔ اُس کے اُوپر

نیچے کے دانت آپس میں مل گئے۔ اُس نے قہر اور غضب کی آواز میں کہا۔ "مجھے اس طرح پتہ چلا تھا کہ اُسے مَیں نے قتل کیا ہے۔ اِن ہاتھوں سے... اگر تم میرے بھائیوں کو نہیں چھوڑو گے تو انہی ہاتھوں سے تمہاری آنکھیں نکال دُوں گی۔"

"چھوڑ دیا" — مَیں نے کہا — "دونوں کو چھوڑ دیا۔"

اُس کی ماں اندر آگئی اور کہنے لگی کہ میری بیٹی پاگل ہوگئی ہے۔ دو تین دنوں سے کہہ رہی ہے — "امی جان! آپ بیوہ ہوگئی ہیں، فکر نہ کریں۔ آپ کے بیٹے جوان ہوگئے ہیں۔"

دولت نے باپ چھین لیا

بڑی مشکل سے میں نے اس لڑکی پر قابو پایا۔ تسلی تشفی اور شفقت کے اثر سے وہ قابو میں تو آگئی لیکن ذہنی طور پر وہ صحیح نہیں تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس لڑکی نے قتل کیا ہوگا لیکن میں نے اس کہانی کے شروع میں آپ کو قتل کا جو فلسفہ بتایا ہے، اس کے مطابق یہ لڑکی تھوڑی دیر کے واسطے پاگل ہوگئی تھی اور اب وہ اس خونی واردات سے بھاگ رہی تھی۔ وہ اپنے بھائیوں کو چھڑانے کے واسطے آئی تھی لیکن معاملہ اصل میں یہ تھا کہ اُس کا ضمیر اُسے مجبور کر رہا تھا کہ اس خونی راز کو کہیں اُگل دو، نہیں تو پاگل ہوجاؤ گی۔

یہ تو اِدھر اُدھر کی باتیں ہیں۔ میں آپ کو وہ بات سُناتا ہوں جس میں آپ کو دلچسپی ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہوگیا ہے کہ یہ لڑکی غیر شادی شدہ عمر بائیس تیئس سال مقتول شیخ نثار کی بڑی بیٹی تھی اور نام آسیہ تھا۔ اس نے اقبالِ جُرم کر لیا تھا لیکن اس واسطے کہ مجھے شہادت مکمل کرا کے مقدمہ حاصل کرنی تھی، اس کا مکمل بیان اقبالی زیرِ دفعہ ۱۶۴ لازمی تھا۔ اُس کی ذہنی حالت دُرست نہیں تھی۔ اُس کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ کیا کہے اور بات

کدھر سے شروع کرے۔ میں نے اُستادی سے اس کا دل مضبوط کیا۔ اس کو حوصلہ دیا اور کہا کہ وہ بات وہاں سے شروع کرے جہاں سے اس کے باپ کے دماغ میں گڑبڑ ہوئی تھی۔

اُس نے بتایا کہ جب ان کی آمدنی اتنی تھی کہ عزت سے روٹی کپڑا پورا ہوجاتا اور بچوں کی فیسیں کتابیں بھی پوری ہوجاتی تھیں، اُس وقت گھر میں خوشی اور محبت تھی۔ جب آسیہ جوان ہوگئی اور بڑا لڑکا کالج میں داخل ہوگیا تو باپ نے کہنا شروع کردیا کہ آمدنی تھوڑی اور خرچے زیادہ ہیں۔ غربت تو پھر بھی نہیں تھی۔ ہاتھ ذرا تنگ ہوگیا تھا۔ شیخ نثار چالاک اور ہوشیار آدمی تھا۔ اُس کے دماغ میں پیسہ گھُس گیا تھا۔ جنگ شروع ہوگئی تو ایک ڈیڑھ سال بعد شیخ نثار نے اپنی بیوی کا سارا زیور بیچ دیا اس واسطے کہ وہ کوئی نیا کاروبار شروع کر رہا تھا۔ اُس نے دکان مع سامان بیچ دی اور قرض بھی اُٹھا لیا اور کھدّے سلائی کرنے کا کاروبار شروع کر دیا۔ آسیہ کو معلوم نہیں تھا کہ اُس کا باپ سلائی کے آرڈر کس طرح حاصل کرتا ہے۔

ایک سال کے اندر اندر آرا مشین لگ گئی، پھر ایک اور آرا مشین لگی اور پھر خیموں کا بھی آرڈر مل گیا۔ پیسہ پانی کی طرح آرہا تھا۔ شیخ نثار کا دماغ پھر گیا۔ وہ راتوں کو بھی گھر سے باہر رہنے لگا اور شاید اُس نے شراب بھی پینی شروع کر دی تھی۔ اپنی بیوی کے ساتھ اُس کی بول چال بند ہوگئی۔ اولاد میں دلچسپی کم ہوگئی۔ باپ کا لباس بدل گیا اور بول چال کا طریقہ بھی بدل گیا۔ وہ اردو بول سکتا تھا۔ اب اِدھر اُدھر سے سُن کر کوئی لفظ انگریزی کا بھی بولتا تھا۔ روپیہ پیسہ جتنی تیزی سے آرہا تھا اس سے دوگنا تیزی سے گھر سے پیار محبت اور خوشیاں نکلتی جا رہی تھیں۔

گھر میں ایسی نحوست آئی کہ باپ بھی اپنا نہ رہا۔ عورتیں کہتی تھیں کہ کسی کی نظرِ بد لگ گئی ہے اس واسطے کہ اس گھر میں محبت اور خوشی زیادہ تھی اور اب رزق بھی چھاجوں میں آرہا ہے۔ شیخ نثار کی بیوی نے تعویذ لا لا کر دروازوں کے ساتھ باندھے۔ چوری چوری تعویذ گھول کر خاوند کو پلاتے لیکن حالت گھر کی خراب ہوتی گئی۔ ایک روز پتہ چلا کہ باپ شہر سے باہر کوٹھی بنا رہا ہے۔ اُس نے گھر میں ذکر نہیں کیا اور پھر ایک روز پتہ چلا کہ باپ نے دوسری شادی کرلی ہے۔ اُس نے اپنی پُرانی بیوی سے کہا کہ اُسے خرچ ملتا رہے گا اور اگر اُس نے دعویٰ مقدمہ کیا تو اُس کو طلاق مل جائے گی پھر خرچ بھی نہیں ملے گا۔ بیوی رو پیٹ کر چُپ ہوگئی۔ اس کو خرچ ملنا شروع ہوگیا۔

اولاد کے سر سے باپ اُٹھ گیا تو سب بہن بھائی بہت روتے۔ وقت گزرتا گیا اور اولاد باپ کی صورت کو ترس گئی۔ آہستہ آہستہ باپ کا غم نفرت کی شکل اختیار کر گیا۔ بیٹے ہمیشہ کہتے کہ باپ کو قتل کر دیں گے۔ آسیہ اور اس کی چھوٹی بہن باپ کو یاد بھی کرتی تھیں اور بُرا بھلا بھی کہتی تھیں۔ آسیہ نے اپنا حال یہ بتایا کہ وہ اپنا خون پیتی رہتی اور اس کے اندر غصہ کھولتا رہتا تھا۔ اس حالت میں اُس نے دو سال گزار دیئے۔ ماں کی حالت دیکھ دیکھ کر اُس کے اندر زہر بھر گیا۔ اُسے پتہ چلتا رہتا تھا کہ اُس کے باپ کی نئی بیوی کیسی ہے اور اس کے کرتوت کیسے ہیں۔ آسیہ اپنی سہیلیوں سے کہا کرتی تھی کہ عورت کو اتنا مجبور نہیں ہونا چاہیئے کہ مرد جب چاہے طلاق دے دے اور چاہے تو اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی کو خرید کر بیوی بنا لے۔ وہ کہتی تھی کہ وہ باپ اور بھائی کتنے ظالم ہیں جو اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو بوڑھے مردوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔

گناہ کے بعد وہ روتی رہی

اس واردات سے چھ مہینے پہلے آسیہ نے اپنا فرض سمجھا کہ وہ گھر میں قید نہ رہے اور ہاتھ پاؤں ہلا کر کچھ کمائے، اس واسطے کہ گھر میں زیادہ آمدنی کی ضرورت تھی۔ اُس کی ایک سہیلی نے اُسے ایک گھر کا راستہ دکھایا جہاں دو بچوں کو گھر میں اردو اور انگریزی پڑھانی تھی۔ بچے ابھی سکول میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ ایک سال گھر میں انگریزی پڑھا کر انہیں انگریزی سکول میں داخل کرانا تھا۔ آسیہ دس جماعت پاس تھی۔ وہ اس گھر چلی گئی۔ بچوں

کا باپ عمر تیس پینتیس سال خوبصورت جوان تھا اور کوٹھی کی طرح کے مکان میں رہتا تھا۔ اُس نے آسیہ کو دیکھا اور اُسے بچوں کو پڑھانے کے لئے رکھ لیا۔ آسیہ کو پچاس روپے ماہوار سے زیادہ کی اُمید نہیں تھی۔ اُس زمانے کے پچاس روپے کو آج دس سے ضرب دے لو تو پتہ چلے گا وہ رقم کتنی تھی، مگر بچوں کے باپ انوار نے آسیہ کو ایک سو روپیہ تنخواہ پیش کر دی۔

آسیہ صبح جاتی تھی اور تین گھنٹے پڑھا کر آجاتی تھی۔ آسیہ نے بتایا کہ انوار اُس کو بہت اچھا لگا اس واسطے کہ باتیں ہمدردی اور محبت کی کرتا تھا۔ آسیہ نے اُس کو اپنا حال سُنا دیا۔ ہمدردی انوار کے دل میں اور زیادہ ہوگئی اور وہ ایسی باتیں کرنے لگا کہ عورت کو اپنی آزادی اور مرضی استعمال کرنی چاہیئے۔ عورت کی غلامی کو مذہبِ اسلام نے بھی منع کیا ہے۔ ایسی باتیں سُنتے سُنتے آسیہ کے اندر جو جھجک تھی وہ ختم ہوگئی۔ انوار اس کو کبھی دس پندرہ روپے ویسے ہی دے دیتا۔ انوار کسی بڑے زمیندار کا بیٹا تھا۔ بغرض کاروبار شہر میں کوٹھی بناتی تھی۔ اُس کی بیوی دیہات کی اَن پڑھ عورت تھی۔

انوار نے ایک روز آسیہ کو سینما دکھا دیا۔ پھر ایک امیرانہ ہوٹل میں کھانا کھلا دیا۔ وہ تانگے پر اِدھر اُدھر آتے جاتے تھے۔ ابھی انوار کی کوئی حرکت ناپاک نہیں تھی۔ پھر ناپاک حرکت کا موقع بھی آگیا۔ آسیہ اس کو گناہ سمجھتی تھی لیکن (جیسا کہ اُس نے بیان دیا) اُس کے دماغ میں یہ فتور آ گیا کہ اُس کا باپ عیش و عشرت کر سکتا ہے تو وہ کیوں نہ کرے۔ بیچاری یہ نہ سمجھ سکی کہ اُس کے دل میں جن مردوں کی نفرت ہے، اس واسطے کہ وہ عورت کو خرید لیتے ہیں اور عورت کو اجاڑ بھی دیتے ہیں، انوار بھی انہی مردوں جیسا مرد ہے جو اُس کی عصمت خرید رہا ہے۔

ایک روز آسیہ روز کی طرح بچوں کو پڑھانے گئی تو انوار نے اُس کو بتایا کہ اُس نے بیوی اور بچوں کو سات آٹھ دنوں کے لئے گاؤں بھیج دیا ہے۔ اُس نے آسیہ کو یہ بھی بتا دیا کہ بیوی بچوں کو اس واسطے بھیجا ہے کہ وہ آسیہ کے ساتھ آزادی سے سات آٹھ دن گزار سکے۔ آسیہ شریف لڑکی تھی لیکن باپ نے اُس کے اندر انتقام کی آگ جلائی اور انوار نے اُسے فرار کا راستہ دکھا دیا اور اُسے عیش کا سبق دے دیا۔

آسیہ راستہ گُم کر بیٹھی مگر گناہ کے بعد اُس کے اندر سے ایسی ظالم آوازیں اُٹھنے لگیں کہ وہ پریشان ہوگئی۔ وہ عصمت کے موتی اس طرح گندگی میں نہیں پھینکنا چاہتی تھی۔ اُس کے دماغ میں ایسا بُرا خیال کبھی آیا ہی نہیں تھا مگر انوار کا جادو کام کر گیا۔ آسیہ اتنی پچھتائی کہ اکیلے بیٹھ کر روتی رہی اور ایک ہی خیال اُسے تنگ کرتا رہا کہ باپ کا ہاتھ اُس کے سر پر رہتا تو وہ اس طرح خراب نہ ہوتی۔ اُس نے ارادہ بہت پُختہ کر لیا کہ انوار کو کہہ دے گی کہ وہ ایسا غلط تعلق اُس کے ساتھ نہیں رکھے گی۔

دوسرے دِن آسیہ ابھی اپنے گھر میں تھی کہ اُس کا باپ شیخ نثار آ گیا۔ سب بہت حیران ہوئے کہ دو سال بعد یہ پُرانی بیوی کے ہاں اور پُرانے گھر میں کیوں آیا ہے۔ آسیہ نے اُسے اتنی مدت بعد دیکھا تھا۔ اُس نے بڑا قیمتی سُوٹ (کوٹ پتلون) پہن رکھا تھا۔ ٹائی بھی باندھی ہوئی تھی۔ اُس نے صحن میں کھڑے ہو کر آسیہ کو بلایا اور اُسے کہا — "مجھے بہت دِنوں سے لوگ بتا رہے ہیں کہ تم کسی آدمی کے ساتھ سینما جاتی ہو۔ تمہیں اُس کے ساتھ ہوٹل میں بھی دیکھا گیا ہے اور تم اُس کے ساتھ دریا پر بھی گئی تھیں۔ تم ٹیوشن پڑھانے کے بہانے اُس کے ساتھ عیش موج کر رہی ہو۔"

"آپ کون ہیں مجھے روکنے والے؟" — آسیہ نے طعنے کے لہجے میں کہا — "کیا آپ کسی مسجد میں امامت کرتے ہیں؟ .... کیا حق ہے آپ کو مجھے روکنے کا! آپ نے جو سُنا ہے وہ سب جھوٹ ہے۔"

"میں تمہارا باپ ہوں آسیہ!" — شیخ نثار نے کہا — "میں عزت دار آدمی ہوں۔ افسروں میں میری عزّت ہے۔ لوگ مجھے سلام کرتے ہیں۔ تم میرا نام ڈبو رہی ہو۔"

بڑا بیٹا بھی موجود تھا۔ اُس نے باپ کو آپ کہنا بھی پسند نہ کیا۔ غصّے میں باپ کو کہا — "تم یہی کر سکتے ہو کہ ہمیں خرچ دینا بند کر دو گے۔ ہم کوڑھی نہیں ہو گئے۔ ہم تمہاری بیوی کی آمدنی سے خرچ نہیں لیں گے۔ ہم جانتے ہیں تم ٹھیکے کس طرح حاصل کرتے ہو۔"

آسیہ اور اُس کے بھائی نے اپنے باپ کی بہت بے عزتی کی۔ باپ نے آسیہ سے کہا — "اگر اب تم وہاں ٹیوشن پڑھانے گئی تو وہیں جا کر تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔ تم میری بیٹی ہو۔ میں قانون کی رُو سے بھی تمہیں روک سکتا ہوں۔"

"تو پھر کل وہاں آجانا" — آسیہ نے کہا — "یہاں تمہارا حکم نہیں چلے گا۔ میں کل آٹھ بجے اُس گھر میں ہوں گی۔"

شیخ نثار غصّے سے پھنکارتا ہوا چلا گیا۔ اُس کی بیوی خاموشی سے دیکھتی رہی اور اُس کے آنسو بہتے رہے۔ آسیہ نے اپنے بیان میں کہا کہ اُسے تھوڑا سا بھی شک نہیں تھا کہ اُس کا باپ الوار کے گھر پہنچ جائے گا لیکن اُس کے باپ کے دن پورے ہو چکے تھے۔

خون جو دماغ کو چڑھ گیا

اگلی صبح آسیہ روز کے وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے الوار کے گھر پہنچ گئی۔ الوار گھر میں اکیلا تھا۔ اُس نے آسیہ کو بازوؤں میں لے لیا اور بالکل اُس وقت کوٹھی کے سامنے ایک کار رُکی۔ الوار باہر گیا۔ آسیہ کمرے میں کھڑی رہی۔ اُسے اپنے باپ کی آواز سُنائی دی — "میری بیٹی آسیہ یہاں ہے؟" — الوار نے جواب دیا کہ یہیں ہے۔ وہ دونوں اندر آگئے۔ باپ کو دیکھ کر آسیہ کو آگ لگ گئی۔ الوار نے شیخ نثار کو کُرسی پر بٹھا لیا۔ شیخ نثار نے کل کی طرح آسیہ کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ آسیہ نے بھی کل کی طرح اُس کی بے عزتی کی۔ الوار شیخ نثار کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ گرم ہوتا چلا گیا۔

جب کوئی واقعہ یا حادثہ ہونا ہوتا ہے تو سارے حالات اپنے آپ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ آسیہ نے بیان دیا کہ جس صوفے پر اُس کا باپ بیٹھا ہُوا تھا اُس کے پیچھے فرش پر بجلی کی تار کا گز بھر کا ٹکڑا جو ٹیبل لیمپ کے ساتھ ہوتی ہے، فرش پر پڑا تھا۔ بجلی والے کسی کام کے واسطے آتے تھے۔ کام کر کے تار کا یہ ٹکڑا پھینک گئے تھے۔ آسیہ اور الوار کو شیخ نثار نے آخر میں کہا کہ تم دونوں بدکار ہو۔ آسیہ پاگل ہو گئی۔ وہ آہستہ آہستہ کچھ بولتی ہوئی باپ کے پیچھے چلی گئی اور تار کا ٹکڑا اُٹھا کر بہت تیزی سے باپ کی گردن پر لپیٹ دیا اور اُس میں غصّے اور پاگل پن نے اتنی طاقت پیدا کر دی کہ پھندا تنگ کر کے اُس نے بہت زور سے تار کو دونوں طرف سے کھینچا۔ باپ تڑپنے لگا۔

الوار نے آسیہ سے کہا اور زور سے کھینچو۔ پھانسی دے دو اسے۔ الوار بھی غصّے میں تھا۔ تار کا ایک سرا اُس نے پکڑ لیا۔ دوسرا آسیہ کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں نے زور لگایا تو شیخ نثار مر گیا۔ آسیہ نے مجھ کو بتایا کہ الوار نے اُس کو ایک انگریزی پکچر دکھائی تھی۔ اس میں ایک آدمی کو اس کی بیوی اسی طرح قتل کرتی ہے۔

جب شیخ نثار مر گیا تو دونوں قاتل گھبرا گئے کہ لاش کو کہاں پھینکیں۔ آسیہ نے الوار سے کہا کہ میں نے اپنی عصمت تمہاری محبت اور مہربانی پر قربان کر دی ہے۔ اب تم قربانی دو اور لاش کو گُم کر دو۔ الوار نے ذرا سوچا اور لاش سٹور میں رکھ آیا۔ دونوں پیشہ ور قاتل نہیں تھے۔ قتل کر کے ان کے دماغ خراب ہو گئے۔ الوار کار چلانا جانتا تھا۔ اُس نے لاش کی جیب سے کار کی چابی نکالی اور کار ریلوے سٹیشن کے باہر کھڑی کر آیا۔ اُس نے آسیہ کو گھر بھیج دیا۔ گھر جا کر آسیہ نے ماں کو کہنا شروع کر دیا کہ امّی آپ بیوہ ہو گئی ہیں۔ وہ خون ہضم نہیں کر سکتی تھی۔ رات خواب میں بھی کچھ نہ کچھ بولتی رہی۔

صبح الوار کے گھر چلی گئی۔ وہ بھی ذہنی طور پر اچھی حالت میں نہیں تھا۔ اُس نے آسیہ کو بتایا کہ اُس نے تین آدمیوں کا انتظام کر لیا ہے۔ رات کو

وہ شیخ نثار کی کار ریلوے سٹیشن سے لے آئیں گے اور لاش اس میں رکھ کر کار دریا میں پھینک دیں گے۔

آسیہ کو یہ تسلی ہوگئی کہ لاش غائب ہو جائے گی لیکن خون اس کے دماغ پر ایسا چڑھا کہ اُس کے بھائیوں اور ماں نے مجھے بیان دیا کہ واہی تباہی بولتی تھی اور پتہ نہیں چلتا تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ آسیہ اُس صبح بھی الوار کے گھر گئی جس صبح مجھے اطلاع ملی کہ دریا میں ایک کار پڑی ہوئی ہے۔ ہم کار نکلوا رہے تھے اور الوار آسیہ کو بتا رہا تھا کہ اب قتل کا کوئی سراغ نہیں رہا۔ اُس نے آسیہ کو بتایا کہ صبح کی آذان سے ذرا پہلے وہ ریلوے سٹیشن گیا اور کار لے آیا۔ کرائے کے آدمیوں نے لاش کو کار کی پچھلی سیٹ پر ڈالا۔ لاش اکڑ گئی تھی، اس واسطے بہت مشکل سے ٹانگیں دوہری کی گئیں اور کار دریا میں پھینک آئے۔ آسیہ کو معلوم نہیں تھا کہ وہ آدمی کون تھے۔ الوار اور آسیہ نے خوشی منائی اور ایک بار پھر بدی کا ارتکاب کیا۔

آسیہ اپنے گھر گئی تو اُس کے بھائیوں کو تھانے بلایا جا چکا تھا۔ جو کانسٹیبل انہیں بلانے گیا تھا، اُس نے ان کو بتا دیا تھا کہ ان کے باپ کی لاش دریا سے برآمد ہوئی ہے۔ ان کی ماں کو بھی پتہ چل گیا۔ آسیہ گھر آئی تو ماں نے اُس کو بھی بتا دیا۔ وہ تھانے کی طرف دوڑ پڑی۔ خون اس کے دماغ پر چڑھا ہوا تھا۔ وہ برداشت نہ کر سکی کہ اس کے بھائیوں کو تھانے میں رکھا جائے۔

اُس نے بھائیوں کو بچانے کے لئے اقبالِ جرم کر لیا۔ اسے میں نے حوالات میں بند کر دیا۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں اُسے سر آنکھوں پر بٹھا کر گھر چھوڑ آتا لیکن میں قانون کے ہاتھوں مجبور تھا۔

الوار کو گرفتار کرنے گئے تو اُس کی کوٹھی کو تالہ لگا ہوا تھا۔ آسیہ نے اُس کے گاؤں کا نام بتا دیا۔ وہاں جا چھاپہ مارا۔ بڑا امیر خاندان تھا اس واسطے ان لوگوں نے بہت رشوت میرے آگے رکھی۔ میں الوار کو گرفتار کر کے لے آیا۔ اُس کی کوٹھی کی تلاشی لی۔ اُسے کہا کہ وہ اقبالِ جرم کر لے لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ اُسے حوالات میں رکھا۔ حوالات کا دوسرا کمرہ عورتوں کے

لئے تھا۔ اس میں آسیہ بند تھی۔ اُس کا بیان اقبالی مجسٹریٹ کے پاس ریکارڈ کرانا تھا۔ مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ ایسا کس طرح ہو گیا کہ آسیہ نے مجسٹریٹ کے سامنے جا کر کہہ دیا کہ تھانیدار نے مجھ پر بہت زیادتی کر کے بیان دینے پر مجبور کیا ہے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ الوار نے میرے کسی کانسٹیبل کو رشوت باہر سے دلا کر آسیہ کو پیغام دے دیا تھا کہ اقبالی بیان نہ دینا۔

اُن تین آدمیوں کا کوئی سراغ نہ ملا جنہوں نے کار دریا میں پھینکی تھی۔

آسیہ مجھے ہر ایک بات بتا چکی تھی کہ اُس نے الوار کے ساتھ مل کر یہ جرم کس طرح کیا ہے۔ میں نے شہادتیں اس کے مطابق اکٹھی کر لیں۔ خانے جو خالی تھے وہ اِدھر اُدھر سے پُر کر لئے۔ مجرموں کو سزا دلانے کے واسطے تھانیداروں کو خالی خانے کسی نہ کسی طرح پُورے کرنے پڑتے ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ میں اس میں خوش نہیں تھا کہ آسیہ کو سزا ملے لیکن مجھے اپنی نوکری کا بھی خیال تھا۔ الوار نے اپنے لئے اور آسیہ کے لئے ایک ہی وکیل کیا۔ میں اس کو جانتا تھا۔ لالہ چرن داس قتل کے کیسوں کا بہت قابل وکیل تھا۔

میں اس وکیل کو چوری چوری اُس کے گھر جا کر ملا اور اُسے بتایا کہ میں نے سارا کیس آسیہ کے اقبالی بیان پر تیار کیا ہے جس سے وہ اب منحرف ہے۔ آپ اُس کو انتہائی سزا سے اس طرح بچا سکتے ہیں کہ اُس سے پورا اقبالی بیان کورٹ کے سامنے دلا دیں۔ شاید سیشن جج (جو انگریز تھا) اس پر رحم کر جائے، ورنہ اسے عمر قید مل جائے گی۔ وکیل میری نیت سمجھ گیا۔ اُس نے میرا تیار کیا ہوا کیس دیکھا تو میری بات مان گیا۔ الوار اقبال کرتا نہ کرتا، وہ نہیں بچ سکتا تھا۔ میرا کیس زیادہ مضبوط تھا اور سرکاری وکیل (پی پی) ایک اینگلو انڈین لالہ چرن داس جیسا قابل اور محنتی آدمی تھا۔

لالہ چرن داس وکیل صفائی نے الوار کو بچانے کی پوری کوشش کی لیکن اُس نے کورٹ میں یہ اعلان کر کے سب کو حیران کر دیا کہ ملزم نمبر ۲ مسماۃ آسیہ اقبالی بیان دینا چاہتی ہے۔ چرن داس نے آسیہ اور الوار کو منوا

لیا تھا کہ آسیہ اقبالی بیان دے دے۔ انوار سمجھ گیا تھا کہ وہ نہیں بچ سکتا۔ میں آج بھی انوار کی تعریف کرتا ہوں کہ اُس نے آسیہ کو بچانے کے واسطے اُسے کہا کہ وہ اقبالی بیان دے دے۔

آسیہ کا بیان لالہ چرن داس نے بہت قابلیت سے دلوایا۔ کورٹ میں بیان وکیل اپنے سوالوں کے ذریعے اور اپنی ہدایات دے کر دلوایا کرتے ہیں۔ سیشن جج نے انوار کو سزائے عمر قید سُنا دی اور آسیہ کو صرف پانچ سال سزائے قید دی۔ اُس نے بہت لمبا فیصلہ لکھا تھا جس میں یہ الفاظ تحریر کئے جو انگریزی میں میرے پاس محفوظ ہیں۔ میں ان کا ترجمہ پیش کرتا ہوں:

"ملزمہ مسماۃ آسیہ کا ردِ عمل، بدکردار اور ظالم ہندوستانی سوسائٹی کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ اس کے باپ نے اس سے دست بردار ہو کر اسے انوار جیسے بے اصول اور بداخلاق آدمی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ملزم نمبر ۱ مسمی انوار نے محبت اور ہمدردی کے دھوکے میں اس کی عصمت دری اس کی مرضی سے کی۔ مسماۃ آسیہ قتل نہ کرتی تو خودکشی کر لیتی۔ بڑی آسانی سے ثابت کیا جا سکتا تھا کہ ملزمہ قتل سے پہلے اور قتل کے وقت پاگل پن کی کیفیت میں تھی اور مقتول کی طرف سے فوری اشتعال نے اسے قاتل بنایا، مگر اس کورٹ کے سامنے ایسی کوئی شہادت پیش نہیں کی گئی۔ اس کے باوجود کافی شہادت موجود ہے جو ملزمہ کو تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۳۰۲ کی انتہائی سزا سے بچا سکتی ہے .... اسے پانچ سال سزائے قید با مشقت دی جاتی ہے۔"

اپیل ہوئی تو ہائیکورٹ نے انوار کی سزا بحال رکھی اور آسیہ کی سزا ایک سال اور کم کر دی۔



ایک خاوند دو بائیں

عورت کی بابت آپ صاحبان کیا جانتے ہیں؟ ـــــ مجھ کو یقین ہے کہ وہ باتیں عورت کی بابت آپ نہیں جانتے جو ہم پولیس کے لوگ جانتے ہیں۔ ناول اور افسانے لکھنے والے صاحبان ہر کہانی عورت کی بابت لکھتے ہیں مگر اُن کو معلوم نہیں ہوتا کہ عورت اصل میں کیا ہے۔ وہ عورت کو صرف محبت کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اُن کو معلوم نہیں کہ عورت کے دل میں جب نفرت اور غصہ پیدا ہو جاتا ہے تو فلموں اور افسانوں کے ہیرو اُس کے پاؤں کے نیچے کیڑے بن جاتے ہیں۔

مذہب کے علماء حضرات کہتے ہیں کہ تم لوگ گھر میں ایک سے زیادہ عورتیں نکاح پڑھا کر رکھ سکتے ہو۔ ان کو معلوم نہیں کہ عورت لونڈی اور قیدی نہیں۔ وہ اگر احتجاج کی کارروائی پر اُتر آئے تو مذہب والوں کو ایسے چکر دیتی ہے کہ وہ ساری سورتیں بھول جاتے ہیں۔

کوئی کہتا ہے کہ عورت پردہ کرے اور بعض کہتے ہیں کہ پردے کا کوئی مطلب نہیں، اس واسطے کھلی پھرے جس طرح مرد پھرتا ہے اور وہ اپنے گھر کا اور اپنے بچوں کا ویسے ہی خیال رکھے جس طرح مرد رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بات یہ بھی ٹھیک ہے لیکن ہم لوگوں نے جو پولیس میں سروس کرتے ہیں یا جو میری طرح سروس پوری کر کے گھر آ گئے ہیں، عورت کو اُس کے اصلی روپ میں دیکھا ہے، اس واسطے میں آپ کو یقین کے ساتھ بتا رہا ہوں کہ عورت کو پردے میں رکھو چاہے اُس کو پردے سے آزاد کر دو، عورت ایک ایسی طاقت کا نام ہے جو مردوں کے مُنہ پھیر سکتی ہے یہ طاقت بدی میں بھی استعمال ہو سکتی ہے اور نیکی میں بھی۔

عورت کی بابت میرا عقیدہ ہے کہ عورت کا ہمیشہ احترام کرو اس واسطے کہ عورت ماں ہے اور بہن ہے اور بیٹی ہے۔ تم جب شادی کرتے ہو تو بیوی کی اس واسطے عزت کرو کہ یہ کسی کی بہن اور کسی کی بیٹی ہے، ایسے ہی جیسے تمہاری بہن اور تمہاری بیٹی کسی کی بیوی ہے یا بیوی بنے گی ـــ اور اس واسطے بھی اس کی عزت کرو کہ تمہارے بچوں کی ماں بنے گی۔ اگر وہ بچوں کی ماں نہ بن سکے تو فردِ جرم اس پر نہ لگاؤ۔ خود اقبالِ جرم کرو اور کسی قابل ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔

آپ صاحبان عورت کے کپڑے اُتار کر خوش ہوتے ہو کہ آپ نے عورت کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے مگر آپ کو غلطی لگی ہے۔ آپ کو وہ بھید پھر بھی نظر نہیں آتا جو میں نے پرانے زمانے کے بارہ گز لٹھے کے برقعے میں لپٹی ہوئی عورت میں دیکھا ہے۔

پاکستان بننے سے کچھ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ میں ایک قصبے کے تھانے کا انچارج تھا۔ اس قصبے میں ہندو زیادہ تھے۔ مسلمان کم تھے۔ ان میں تین چار خاندان بہت امیر تھے۔

ایک خاندان جو ایک مسلمان "خان بہادر" کا تھا، زیادہ امیر تھا۔ خان بہادر اس شخص کا نام نہیں خطاب تھا جو انگریزوں نے اُس کو سرکارِ برطانیہ کی خدمت کرنے کے صلے میں دیا تھا۔ یہ انگریزوں کا اپنا آدمی تھا۔ اُس کی اپنی اراضی بھی تھی اور بہت سی انگریزوں نے انعام میں دی تھی۔ خان بہادر کا اسی شہر میں دیسی چینی کے برتن بنانے کا کارخانہ بھی تھا۔ دُور دُور تک ایسا اور کوئی کارخانہ نہیں تھا اس واسطے خان بہادر کا یہ کارخانہ بہت چلتا تھا۔

ایک روز ایسے ہوا کہ میں تھانے میں اپنے کام میں لگا ہوا تھا کہ ایک عورت آئی۔ وہ سر سے پاؤں تک سفید برقعے میں چھپی ہوئی تھی۔ اُس زمانے میں سفید برقعے کا ہی رواج تھا جو لٹھے کا ہوتا تھا۔ آج کل اُس کو شٹل کاک بھی کہتے ہیں اور نئے زمانے کے لوگ اس برقعے کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ اُس زمانے میں کالا برقعہ شہروں میں امیر گھرانوں کی خواتین لیتی تھیں اور اُس کو فیشنی برقعہ کہا جاتا تھا۔

یہ عورت ڈرتے ڈرتے قدم اُٹھاتی اور کانسٹیبلوں سے پوچھتی پوچھتی میرے دفتر کے دروازے میں آکر رُک گئی۔ سفید برقعہ ایسا ہوتا تھا کہ اس سے ہاتھ بھی نظر نہیں آتے تھے، اس واسطے میں معلوم نہ کر سکا کہ عورت کیسی ہے اور اس کی عمر کتنی ہے۔ میں نے اُس کو عزت سے کہا کہ اندر آ جاؤ۔ وہ اندر آئی تو میں نے اُس کو بٹھایا اور پوچھا کہ وہ کس واسطے آئی ہے۔

"میرے گھر چوری ہو گئی ہے" اُس نے کہا ـــ "آپ میری مدد کریں گے؟"

"یہی ہمارا کام ہے" ـــ میں نے کہا ـــ "مجھے بتائیں چوری کب ہوئی اور کیا کیا گیا ہے۔ میں پوری مدد کروں گا۔"

اُس نے برقعے کا نقاب اُوپر اُٹھا دیا۔ اُس کی عمر ایک سال کم یا ایک سال زیادہ پینتیس سال تھی۔ چہرے پر جوانی کا رنگ روغن ابھی موجود تھا۔ نقش بہت اچھے تھے۔ آنکھوں میں کشش زیادہ تھی لیکن چہرہ اُداس تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مال زیادہ چوری ہو گیا ہے۔ اس کے گھر میں کوئی مرد نہیں ہوگا اس واسطے خود آئی تھی۔ اُس نے کپڑے اچھے پہنے ہوتے تھے۔ کانوں اور اُنگلیوں میں زیور تھا، اس واسطے میں نے دل میں کہا کہ خوشحال گھر کی عورت ہے۔

عورت چکر چلا رہی تھی

اُس نے بتایا کہ مکان اُس کا بڑا ہے۔ گھر میں وہ ہے اور اُس کا صرف ایک بیٹا ہے جس کی عمر اُس نے دس سال بتائی۔ میں نے پوچھا خاوند کہاں ہے۔ اُس نے بتایا وہ مر گیا ہے۔ کوئی بھائی اور عزیز رشتہ دار بھی نہیں۔ ماں بیٹا ایک کمرے میں سوتے تھے۔ اُس روز صبح اُٹھ کر وہ اُس کمرے میں گئی جس میں ٹرنک رکھے ہوتے تھے۔ اُس کو سارے ٹرنک کُھلے

ہوئے نظر آتے۔ ٹرنک اور سُوٹ کیس اِدھر اُدھر پڑے ہوئے تھے اور اُن میں جو کپڑے وغیرہ تھے، وہ ان میں سے نکلے ہوئے اور سارے کمرے میں بکھرے ہوئے تھے۔

"مال کیا گیا ہے؟" — میں نے پوچھا — "زیور تو سارا نکل گیا ہوگا۔"

"نہ جی!" — اُس نے کہا — "زیور بالکل نہیں گیا۔ سب زیور فرش پر پڑا تھا۔"

"نقد رقم گئی ہوگی۔"

"نہ جی!" — اُس نے کہا — "نقد رقم بھی سامنے پڑی تھی۔ وہ وہیں پڑی ہے۔ وہ چوروں نے ضرور دیکھی ہوگی مگر چھوڑ گئے ہیں۔"

میں بہت حیران ہُوا۔ زیور بھی چور چھوڑ گئے اور نقدی بھی، پھر وہ کیا لینے آئے تھے؟ میں نے اس خاتون سے کہا کہ وہ سامان بکھیرنے کے واسطے آئے تھے۔ بکھیر کر چلے گئے۔

"نہ جی!" — اُس نے کہا — "وہ جو چیز لے جانا چاہتے تھے لے گئے ہیں۔"

"گائے بھینس یا گھوڑی کھول کر لے گئے ہیں؟" — میں نے پُوچھا۔

"بڑے قیمتی کاغذ تھے" — اُس نے کہا۔

"جائیداد کے؟"

"جائیداد کے تو نہیں تھے" — اُس نے جواب دیا — "لیکن ان کا تعلق جائیداد کے ساتھ ہی تھا" — اُس نے بے چین ہو کر کہا — "میرے خاوند کے بہت سارے خط تھے جو وہ مجھ کو لکھتا رہتا تھا۔ میں نے یہ سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ میرا نکاح نامہ تھا۔ یہ خط اور نکاح نامہ چوری ہوگئے ہیں۔ ان کے بغیر میں اپنے خاوند کی جائیداد میں سے حصہ نہیں لے سکتی۔"

"آپ کو جائیداد کے حصے سے کوئی محروم نہیں کر سکتا" — میں نے اُسے کہا — "آپ کے اپنے رشتہ دار اور آپ کے سُسرال یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ آپ مرنے والے کی بیوی نہیں تھیں۔ یہ کوئی راز کی بات تو نہیں تھی۔ آپ بتاتی ہیں کہ آپ کا ایک بیٹا بھی ہے۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ اگر آپ کا کوئی قیمتی مال نہیں گیا تو تھانے میں رپورٹ درج کرانے کے جھنجھٹ میں نہ پڑیں۔ خطوں اور نکاح نامے کو بھول جائیں۔"

اُس کی باتوں میں شائستگی تھی اور وہ عقل والی عورت معلوم ہوتی تھی۔

"ان خطوں اور نکاح نامے کے بغیر کوئی نہیں مانے گا کہ مرنے والا میرا خاوند تھا" — اُس نے کہا — "مجھ کو کچھ پتہ نہیں کہ تھانے میں رپورٹ درج کرائی جاتی ہے یا کیا کیا جاتا ہے۔ میں آپ کے پاس مدد حاصل کرنے کے لئے آئی ہوں۔ اگر آپ مُسلمان نہ ہوتے تو تھانے میں آنے کی ہمت نہ کرتی۔ میں ان رستوں سے واقف نہیں ہوں۔ کسی نے بتایا تھا کہ آپ مُسلمان ہیں اور بڑے نیک آدمی ہیں۔"

"آپ کا خاوند کون تھا؟" — میں نے پوچھا — "اُس کی جائیداد کتنی کچھ ہے؟"

اُس نے خان بہادر کا نام لیا جس کا میں اُوپر ذکر کر آیا ہوں کہ سب سے زیادہ امیر خاندان تھا اور انگریزوں نے اُسے خان بہادر کا خطاب اور اراضی بطور انعام دی تھی۔ میں اس کا نام نہیں لکھوں گا۔ اسے خان بہادر ہی کہوں گا۔

اِس عورت نے جب کہا کہ خان بہادر اُس کا خاوند تھا تو مجھے اِس عورت پر شک ہونے لگا۔ یہ کوئی چکر چلا رہی تھی۔ میں نے اُس سے اُس کا نام پوچھا تو اُس نے اپنا نام رضیہ بتایا۔ اس سے میرا شک پکا ہوگیا، اس واسطے کہ خان بہادر کی بیوی کا نام زینب تھا۔ (میں ان دونوں عورتوں کے اصل نام نہیں لکھ رہا)۔

خان بہادر کی دوسری بیوی

میں خان بہادر کے پورے خاندان سے اور اُس کے گھر کے حالات سے واقف تھا۔ اُس کے ساتھ میری دوستی تھی۔ اُس کی بیوی جس کا نام زینب تھا، پردہ نہیں کرتی تھی۔ میں ان لوگوں کے ہاں جب کبھی جاتا تھا تو زینب باہر آکر میرا حال احوال پوچھا کرتی تھی۔ خان بہادر تو بس خان بہادر ہی تھا، زینب اچھی عورت تھی۔ خان بہادر کو مرے ڈیڑھ مہینہ ہو گیا تھا۔ اُس وقت اُس کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ نہ ہوئی تو کم بھی نہیں تھی۔ میرے سامنے جو عورت بیٹھی ہوئی تھی اُس کی عمر پینتیس سال سے ذرا کم یا ذرا ہی زیادہ لگتی تھی۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں کہ نکاح نامے کے بغیر کوئی نہیں مانے گا کہ آپ خان بہادر کی بیوہ ہیں" — میں نے کہا — "میں بھی نکاح نامہ دیکھ کر ہی یقین کر سکتا ہوں کہ وہ آپ کے خاوند تھے.... میری ایک بات کان کھول کر سُن لیں۔ پولیس کے پاس جھوٹی رپورٹ لے کر آنا بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ اگر آپ کی رپورٹ جھوٹی نکلی تو میں آپ کو خبردار کر دیتا ہوں کہ مقدمہ آپ کے خلاف کھڑا ہو جائے گا۔"

اُس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آگئی جس میں خوشی کا رنگ نہیں تھا۔ میں اب اس کو بہت غور سے اور شک و شبہے کی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"میں خان بہادر کی دوسری بیوی تھی" — رضیہ نے کہا — "میں آپ کو اپنا یہی مسئلہ بتانے آئی ہوں۔ آپ رپورٹ درج نہ کریں۔ میں ایک مشکل میں پھنس گئی ہوں۔ مجھے اس کا حل بتائیں۔"

"مجھے آپ پہلے یہ بتائیں کہ آپ خان بہادر کی بیوی کب بنی تھیں؟" میں نے کہا — "اگر یہ راز کی کوئی بات ہے تو یہ مجھ سے نہ چھپائیں، اس واسطے کہ آپ غلط بات کریں گی تو میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔"

اُس نے مجھے اپنی شادی کی ساری کہانی سنا دی۔ کہنے لگی —

"میرے اباجان خان بہادر کے کارخانے میں منیجر تھے۔ اُن کی دراصل گہری دوستی تھی۔ اباجان (ایک اور شہر میں) کسی کمپنی میں ملازم تھے۔ مجھ کو معلوم نہیں کہ خان بہادر کے ساتھ اُن کی دوستی کس طرح ہو گئی تھی۔ میں اور میری امی اباجان کے ساتھ رہتے تھے۔ میں ابھی چھوٹی عمر میں تھی۔ مجھ کو یاد ہے کہ خان بہادر کے بچے بھی تھے۔ خان بہادر نے یہاں یہ کارخانہ کھول لیا اور میرے اباجان کو وہ نوکری چھڑا کر یہاں لے آیا۔"

"آپ کے اباجان کسی پرائیویٹ کمپنی میں ملازم نہیں ہوں گے" — میں نے کہا — "وہ کسی ایسے سرکاری دفتر میں ملازم ہوں گے جہاں خان بہادر انگریز افسروں کی چاپلوسی کے لئے جاتا ہوگا اور آپ کے اباجان کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا ہوگا۔ یہ خان بہادر کسی کے دوست نہیں ہوا کرتے۔"

"وہ میری چھوٹی عمر کی باتیں ہیں" — رضیہ نے کہا — "آپ شاید ٹھیک کہتے ہوں گے۔ میں یہی جانتی ہوں کہ اباجان یہاں خان بہادر کے پاس آگئے۔ شاید کارخانے میں ان کی حصہ داری بھی تھی لیکن کارخانہ اباجان چلا رہے تھے۔ میں بڑی ہوئی۔ کارخانہ بھی بڑا ہو گیا۔ میں یہاں سکول میں پڑھتی تھی۔ میرے دو بھائی پیدا ہوئے اور مر گئے۔ میری امی بیمار رہنے لگی۔ میں نے آٹھ جماعتیں پاس کر کے سکول چھوڑ دیا، اس واسطے کہ گھر میں امی کو میری ضرورت تھی، اور دوسرا اس واسطے کہ یہاں ہائی سکول نہیں تھا....

"خان بہادر کارخانے میں کبھی کبھی آیا کرتے تھے۔ اگر وہ آپ کے دوست ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اپنی زمین پر زیادہ رہتے تھے۔ میرے ساتھ بہت پیار کرتے تھے۔ دو سال بعد میری امی فوت ہو گئی۔ اب تو میں جوان ہو چکی تھی۔ میں نے گھر سنبھال لیا۔ خان بہادر نے کارخانے کے قریب ہمیں یہ مکان بنا دیا تھا۔ میں اسی میں رہتی ہوں۔ اسی میں چوری ہوئی ہے۔"

اکیلی رہتی تھی

اس عورت نے بڑی لمبی کہانی سُنائی۔ میں اُس کے ساتھ اچھی طرح بول رہا تھا، اس واسطے کہ اس کے ساتھ ہمدردی ہوگئی تھی اور پھر اس واسطے بھی کہ میرے دل میں کچھ اس کے خلاف شک بھی تھا۔ میں آپ کو باریکیاں نہیں سُناتا، اس واسطے کہ یہ آپ کو بور کریں گی اور کہانی خراب ہو جائے گی۔ اس عورت کی تھوڑی سی بات میری زبانی سُن لیں۔ وہ جب سولہ سترہ سال کی ہوئی تو جوانی نے اس کی خوبصورتی کو چاند کی طرح چمکا دیا۔ قد اونچا نکلا اور آنکھیں مستانی ہوگئیں۔ میں اس کو پینتیس سال کی عمر میں دیکھ رہا تھا۔ اُس وقت بھی اُس کی خوبصورتی قائم تھی۔

خان بہادر نے اس پر پیار اور محبت کے جال پھینکنے شروع کر دیئے۔ وہ اس کو پیسے اور تحفے دیتے تھے اور رضیہ اس واسطے خوش ہوتی تھی کہ خان بہادر اس کو اپنی بیٹی سمجھتے ہیں، اس واسطے وہ محبت کا جواب محبت سے دیتی رہی۔

"اباجان نے مجھ کو کہنا شروع کر دیا کہ بیٹی تمہاری شادی کا وقت آگیا ہے" — رضیہ نے مجھ کو بات سُناتے ہوئے کہا — "میں نے اباجان سے کہا کہ امی فوت ہوگئی ہیں اور میں اس گھر سے نہیں جاؤں گی اس واسطے کہ آپ اکیلے رہ جائیں گے .... میں نے یہ ارادہ اپنے دل میں پکا کر لیا تھا کہ اباجان کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گی اور شادی نہیں کروں گی۔ شادی کرنی ہے تو ایسے شخص کے ساتھ کروں گی جو گھر جوائی بن کے رہے۔ میرے دل میں اباجان کا اتنا پیار تھا کہ میں نے اپنی زندگی اُن پر قربان کرنے کا ارادہ کر لیا تھا....

"آپ کو معلوم ہے کہ والدین اپنی بیٹیوں کو گھر نہیں بٹھایا کرتے۔ اباجان کو میری شادی کا غم لگ گیا۔ ہماری کوئی برادری نہیں ہے اس واسطے رشتے کی مشکل تھی۔ غیر لوگوں کو رشتہ دینا بھی مشکل تھا۔ اباجان سے میری یہ شرط مان لی کہ رشتہ اُسے دیں گے جو ہمارے پاس رہے۔ آپ کو معلوم ہے ایسا رشتہ کہاں سے ملتا ہے .... خان بہادر میرے اوپر اور زیادہ مہربان ہوگئے۔ اُن کا ایک بیٹا جوان تھا۔ میں نے اُس کو نہیں دیکھا تھا۔ پھر ایسے ہُوا کہ اباجان کی صحت خراب ہونی شروع ہوگئی۔ وہ کام کرتے تھے مگر جلدی تھک جاتے، اس واسطے کہ بوڑھے ہوگئے تھے"

اُس کے آنسو بہنے لگے اور وہ چُپ ہوگئی۔ دوپٹے سے آنسو پونچھتی رہی اور روتی رہی۔ میں نے اُس کو تسلی دلاسہ نہ دیا اس واسطے کہ مجھ کو ایک بات یاد آگئی۔ اس تھانے میں مجھ کو دو سال سے اُوپر عرصہ ہوگیا تھا۔ تھانیدار کو اپنے علاقے سے اور علاقے کے لوگوں سے واقف ہونا پڑتا ہے۔ کہیں جوئے اور کہیں بدمعاشی کے خفیہ اڈے ہوتے ہیں۔ سزا یافتہ لوگ ہوتے ہیں۔ اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ اچھے اور معزز لوگوں میں کون انگریزوں کا اپنا آدمی ہے اور کون کس کا آدمی ہے۔ ان معزز لوگوں میں سے ہم کو مخبر بھی مل جاتے تھے۔

مجھ کو بتایا گیا تھا کہ خان بہادر کے کارخانے کے قریب ایک مکان ہے جس میں ایک بڑی خوبصورت عورت اکیلی رہتی ہے۔ یہ تو میں نے معلوم کر لیا تھا کہ وہ عورت کارخانے کے منیجر کی بیٹی ہے اور منیجر مر گیا ہے مگر یہ پتہ نہ چلا کہ اُس کا کوئی خاوند ہے یا نہیں۔ میں نے پتہ چلایا ہی نہیں تھا اس واسطے کہ اس عورت کی کوئی ایسی رپورٹ نہیں ملی تھی کہ بدکاری کرتی ہے یا کوئی اور گڑبڑ کرتی ہے۔ یہ معلوم ہوگیا تھا کہ خان بہادر اس کے گھر میں جاتا ہے۔

خان بہادر میرا دوست تھا۔ میں نے ایک بار اس سے اس عورت کی بابت پوچھا تو اُس نے بتایا کہ اُس کا باپ بھی مر گیا ہے اور خاوند بھی مر گیا ہے اور دونوں خان بہادر کے کارخانے میں ملازم تھے۔ خان بہادر نے یہ بھی بتایا کہ وہ اس عورت کی مالی امداد کرتا ہے اس واسطے کہ اس کے باپ اور خاوند نے خان بہادر کی بہت خدمت کی ہے۔

میں نے خان بہادر کی بات مان لی تھی اس واسطے کہ وہ بہت امیر آدمی تھا۔ ایسے سمجھیں کہ اپنی جاگیر کا مہاراجہ تھا؛ وہ مدد کرنے کے قابل تھا۔ اس کے بعد میں نے اُس عورت کا جو ایک مکان میں اکیلی رہتی تھی، خیال دماغ سے نکال دیا تھا۔ اب رضیہ نے مجھ کو اتنی لمبی آپ بیتی سُنانی شروع کر دی تو اُس نے اُس مکان کا ذکر کیا تو مجھ کو شک ہُوا کہ یہ وہی عورت ہوگی اور شاید یہ اُسی مکان کا قصہ سُنا رہی ہے جس میں یہ اکیلی رہتی تھی۔

ایسی بات کہہ دی، میں کانپنے لگی

وہ تھوڑا وقت روتی رہی اور آنسو پونچھ کر اُس نے مجھ کو دیکھا اور کہنے لگی کہ میں بہت پریشان ہوں اور مصیبت میں ہوں اِس واسطے آپ کو پریشان کر رہی ہوں۔ آپ کے سوا میری مدد کوئی نہیں کر سکتا۔ اگر میں اکیلی ہوتی تو کچھ کھا کر مر جاتی لیکن اس واسطے زندہ ہوں کہ ایک بچہ ہے۔ اُس کا مستقبل بنانا ہے۔

میں نے اُس کو تسلی دی کہ وہ مجھ سے مدد لینے آئی ہے اس واسطے ہر طرح کی مدد کروں گا اور یہ میری ڈیوٹی ہے۔ میں نے اُس سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کیا اُسی مکان میں اکیلی رہتی ہے اور خان بہادر کبھی کبھی اُس کے گھر آتا ہے؟ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس کو پتہ چلنے دوں کہ اُس کی بابت مجھ کو کچھ خبر ہے، اس واسطے کہ کچھ گڑبڑ ہوتی تو وہ اپنی زبان کو کسی اور طرف لے جاتی اور میں گمراہ ہو جاتا۔

وہ یہ بات کر رہی تھی کہ اُس کا باپ بوڑھا ہو گیا تو جلدی تھک جاتا تھا۔ آگے اُس نے کہا ـــ "اب تو میں نے شادی کا خیال دماغ سے نکال ہی دیا۔ اباجان کو ہر وقت میری ضرورت ہوتی تھی۔ میں نے ایسا بھی دیکھا کہ اُن کو میری شادی کا روگ لگ گیا تھا۔ میں اُن کو ہنس ہنس کر تسلیاں دیتی

تھی۔ خان بہادر آتے تھے تو میں نے اُن کو بھی کہا کہ ابا جان کو کچھ سمجھائیں کہ میرا اتنا غم نہ کریں۔ آپ کو معلوم ہے کہ لڑکی اپنے باپ کے ساتھ اور نہ اپنے بزرگوں کے ساتھ اپنی شادی کرنے یا نہ کرنے کی بات نہیں کر سکتی۔ آپ کہتے ہوں گے کہ یہ عورت بے حیا ہے اِس واسطے کہ بزرگوں کے ساتھ اپنی شادی کی باتیں کرتی تھی لیکن آپ اپنے دماغ میں یہ سوچیں کہ گھر میں اباجان تھے اور میں تھی۔ میرا کسی عورت کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا نہیں تھا۔ میں تو اباجان کی خاطر گھر میں قید ہو گئی تھی، پھر اباجان کی صحت کو دیکھتی تھی تو دل جلتا تھا۔ اُن کے دل کو خوش کرنے کے واسطے میں ہر ایک بات زبان سے کہہ دیتی تھی....

"اس حال میں چار سال گزر گئے۔ میری عمر اکیس سال ہو گئی۔ اس عمر تک کون اپنی بیٹی کو گھر بٹھاتا ہے۔ اتنی جوانی میں کوئی بیٹی گھر بیٹھی بھی نہیں مگر میں نے اپنا دل مار دیا۔ اباجان کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ خان بہادر نے اُن کو کہا کہ تم ٹھیک ہوتے ہو تو کارخانے میں جایا کرو ٹھیک نہیں ہوتے تو مت جاؤ۔ اِس واسطے خان بہادر مجھ کو اچھے لگتے تھے کہ میرے اباجان کا اتنا زیادہ خیال کرتے تھے۔ مجھ کو اب وہ قیمتی تحفے دیتے تھے....

"ایک روز خان بہادر ایسے وقت میرے گھر آ گئے جس وقت اباجان کارخانے میں تھے۔ میں اُن کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اس واسطے کہ مجھ کو بیٹی سمجھ کر پیار کرتے تھے۔ انہوں نے ایسی بات کہہ دی جس واسطے میں کانپنے لگ گئی۔ پہلے تو کہنے لگے کہ تمہارے اباجان تمہاری فکر کر کر کے بیمار اور بوڑھے ہو گئے ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی ہے کہ کوئی گھر جوائی مل جائے لیکن نہیں ملا۔ پھر خان بہادر نے کہا ـــ 'تمہارے اباجان کو میں اپنے بھائیوں سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں۔ اس کا غم مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ میں یہی کر سکتا ہوں کہ میں ہی تمہارے ساتھ شادی کر لوں۔ مجھ کو بہت امید ہے کہ تم اِس بات کو پسند کرو گی'....

"میں آپ کو کس طرح بتاؤں کہ میری کیا حالت ہوتی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرے اباجان نے مجھ کو کہا ہے کہ بیٹی! آج سے تم میری

بیوی ہو..... مجھ کو تو پتہ نہیں چل رہا تھا کہ خان بہادر کو کیا کہوں۔ دل میں ان کا بہت لحاظ تھا۔ میں نے کہا کہ آپ خود سوچ لیں۔ میں تو کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ انہوں نے مجھ کو اَبا جان کے واسطے دیئے پھر محبت کی بات شروع کر دی کہ میں تمہاری محبت میں مرا جا رہا ہوں ....

"وہ اپنی طرف سے بات پکی کر کے چلے گئے مگر میری حالت ایسی ہو گئی کہ جسم کے اندر چیونٹیاں چلنے لگیں۔ میں روتی بھی رہی۔ آخر اَبا جان آ گئے۔ میں نے اُن کو بتایا کہ خان بہادر مجھ کو کیا کہہ گئے ہیں۔ مجھ کو ڈر تھا کہ اَبا جان پر بہت بُرا اثر ہوگا اور شاید وہ بے ہوش ہو جائیں گے اور اُن کو بہت غصہ آئے گا جو اُن کی صحت کو تباہ کر دے گا مگر انہوں نے میری بات آرام سے سُنی۔ اُن پر کوئی خطرناک اثر نہ ہُوا....

"میں نے اُن کو بتایا کہ خان بہادر کی اس بات کی بابت میرے دماغ میں کیسے کیسے خیال آتے ہیں اور میں نے اس بات کو بہت بُرا سمجھا ہے۔ اَبا جان نے میری ساری بات اور میرے خیال سُن کر کہا —— 'ہاں رضیہ بیٹی! انہوں نے اس بابت میرے ساتھ بات کر لی تھی۔ تمہارے ساتھ وہ بات نہ کرتے تو بھی اس کی کیا ضرورت تھی۔ میں خان بہادر کا یہ احسان اور اُن کی یہ قربانی بھول نہیں سکوں گا اور اس کی قیمت نہیں دے سکوں گا' —— اُن کی ساری باتیں میں آپ کو نہیں سُناؤں تو مناسب ہے اس واسطے کہ آپ اُکتا جائیں گے۔"

آج کل تھانیدار اور سرکاری ہسپتالوں کے ڈاکٹر کسی کی اتنی لمبی بات نہیں سُنا کرتے۔ اُن کے آگے 'فیس' رکھ دو تو کچھ توجہ دیں گے۔ ہمارے وقتوں میں کچھ اور معاملہ تھا۔ فیس تو اُس وقت بھی چلتی تھی لیکن اس طرح نہیں کہ فیس کے بغیر کام ہی رُکے رہیں۔ اُس وقت ڈر یہ ہوتا تھا کہ کسی نے اُوپر والوں کو درخواست دے دی تو انگریز افسر دوڑے آئیں گے اور کوئی رُو رعایت نہیں کریں گے۔ اس عورت کا معاملہ مجھ کو کچھ اور نظر آتا تھا عورت ذات تھی اور اس کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا، اس واسطے میں نے اُس کو جو پہلے تسلی دی تھی اسی طرح پھر تسلی دی کہ وہ پُوری بپتا سُنائے لیکن خیال ایسا دماغ میں نہ رکھے کہ جھوٹ بولے گی تو میں اس کو سچ مان جاؤں گا۔

جوانی اور جذبات کی قربانی

اُس نے آگے بات اس طرح سُنائی —— "خان بہادر نے صرف میرے ساتھ نہیں بلکہ میرے اَبا جان کے ساتھ بھی بات پکی کر لی تھی اور اَبا جان کہتے تھے کہ اُس نے ہمارا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ میں نے اَبا جان سے کہا کہ خان بہادر کی عمر کی بابت اُن کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے کہا کہ بیٹی، مرد کی عمر اور شکل نہیں دیکھنی چاہیئے۔ یہ دیکھو کہ خاوند تندرست اور خوشحال ہے اور اُس کے دل میں تمہاری محبت موجود ہے۔ تم دیکھ لو۔ خان بہادر میں یہ ساری چیزیں موجود ہیں .... میں اس رشتے کو قبول نہ کرتی لیکن اَبا جان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے کہا —— 'اگر تم مجھ کو زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو خان بہادر کو قبول کر لو۔ اگر مجھ کو اس حال میں چھوڑ کر جانا چاہتی ہو تو ایسے رشتے بہت ملتے ہیں'....

"میں نے کہا کہ خان بہادر گھر جوائی تو نہیں بنیں گے۔ اُن کی بیوی بھی ہے، بچے بھی ہیں اور سُنا ہے کہ ایک لڑکا میری عمر کا یا سال ڈیڑھ سال مجھ سے بڑا ہے۔ اَبا جان نے بتایا کہ یہی تو خان بہادر نے مجھ پر مہربانی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں تم یہیں گھر میں رہو گی۔ خان بہادر یہیں آ جایا کریں گے اور اس شادی کو وہ راز میں رکھنا چاہتے ہیں.... کبھی مجھ کو ایسے صبر آ جاتا کہ میں خواب دیکھ رہی ہوں اور جاگ جاؤں گی تو یہ معاملہ غائب ہو جائے گا۔ اَبا جان نے اس بات کو پکا کر دیا تھا۔ انہوں نے مجھ کو بتایا کہ معاملہ کس طرح طے ہُوا ہے۔"

میں اس تفصیل کو مختصر کر دیتا ہوں۔ ہمارے معاشرے میں اُس وقت بھی جب ہم ہندوستانی کہلاتے تھے اور بعد میں بھی جب ہم پاکستانی

کہلاتے ہیں، ایسے واقعات کسی کو حیران نہیں کرتے۔ دولت ہو تو مرد بڑھاپے میں بھی اپنے آپ کو جوان سمجھتا ہے اور جوان لڑکی کو بیوی بنا لیتا ہے۔ اس کے بعد اُس کو مجبوراً یہ کرنا پڑتا ہے کہ بیوی کا غلام ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو دھوکہ دے لیتا ہے کہ یہ نوجوان بیوی اُس کو بہت چاہتی ہے۔ اس قسم کی شادیوں کے بعد جو چاند چڑھتے ہیں وہ صرف خاوند کو نظر نہیں آتے۔ ان کو ساری دنیا دیکھتی ہے۔ ان کے کچھ نتیجے پولیس کے پاس بھی آتے ہیں۔ کوئی نوجوان بیوی اپنے آشنا کے ساتھ مل کر اپنے بوڑھے خاوند کو زہر دے دیتی ہے۔ بعض بیویاں اپنے آشناؤں کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں۔ بعض کچھ کھا کر مر جاتی ہیں اور میں نے ایسی تین لڑکیوں کو اپنی سروس میں سزا دلائی ہے جن میں سے ایک نے اپنی ماں کو اور دو نے اپنے باپوں کو زہر دے کر مار دیا تھا، اس واسطے کہ انہیں ماں باپ نے رقم لے کر بوڑھوں کے ساتھ بیاہ دیا تھا۔

میں نے یہ بات اس واسطے کی ہے کہ رضیہ جو واقعہ مجھ کو سنا رہی تھی اس سے میں حیران نہیں ہوا۔ پاکستان اور ہندوستان میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ رضیہ کے باپ اور خان بہادر نے یہ طے کیا تھا کہ اس شادی کو خفیہ رکھیں گے۔ مجھ کو بعد میں پتہ چلا تھا کہ خان بہادر کے پہلے سسرال میں مرد بہت تھے اور وہ سب ڈانگ باز تھے۔ خان بہادر ان سے ڈرتا تھا، اسی واسطے وہ شادی کو خفیہ رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن ظاہر کرتا تھا کہ رضیہ کے باپ پر اُس نے احسان کیا ہے کہ اُس کی بیٹی اُس کی دیکھ بھال کے واسطے اُسی کے پاس اپنے گھر میں رہے گی۔

رضیہ نے بتایا کہ نکاح نامے میں حق مہر پچیس ہزار لکھا تھا جو اُس زمانے میں بہت ہی زیادہ رقم تھی اور یہ مکان اُس نے رضیہ کے نام کر دیا تھا۔ رضیہ نہیں مان رہی تھی۔ اُس کا باپ اُس کے سامنے رو پڑا اور اُس کو کہا کہ میری صحت اور اس کو لگا ہوا روگ دیکھ لو۔ تم نے کہا تھا کہ تم مجھ پر اپنی زندگی قربان کر دو گی مگر تم اپنے بوڑھے باپ کو اور روگ لگا رہی ہو۔ رضیہ بہت اچھے خیالوں والی عورت تھی۔ اُس نے باپ کے آنسو دیکھے تو

اس نے اپنی جوانی اور جذبات کی قربانی دے دی۔

ایک رات خان بہادر آیا۔ اُس کے ساتھ ایک مولوی بمع نکاح رجسٹر تھا اور ایک گواہ تھا جس کو رضیہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کون ہے۔ لڑکی کا باپ موجود تھا جس کی رضامندی ضروری تھی اس واسطے نکاح غیر شرعی اور غیر قانونی نہیں تھا۔ نکاح ہو گیا۔ نکاح رجسٹر سے لڑکی والوں کا حصہ پھاڑ کر رضیہ کے باپ کو دیا گیا اور دوسرا حصہ خان بہادر کو اور تیسرا حصہ رجسٹر میں لگا رہا۔ لڑکی اور "لڑکے" کے نام، باپ کا نام اور نکاح خواں کا نام، یہ سب نام ٹھیک لکھے گئے تھے۔ میں نے رضیہ کو بتایا کہ اُسے نکاح نامے کا غم نہیں کرنا چاہیئے اس واسطے کہ نکاح رجسٹر موجود ہے جو میں ڈھونڈ کر حاضر کر دوں گا۔ یہ بات سن کر رضیہ خوش ہو گئی اور ہاتھ اُٹھا کر اُس نے مجھ کو دعا دی۔

"میرے بیٹے کا مستقبل محفوظ کر دیں" — اُس نے کہا — "اللہ آپ کی اولاد کو سُکھی اور خوشحال رکھے گا۔"

تھانیدار اکثر اپنی فیس وصول کر لیا کرتے ہیں۔ میں اُن کو بتاتا ہوں کہ کبھی فیس کے طور پر کسی مظلوم کی دعا وصول کر کے دیکھیں کہ یہ نقد رقم سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ میں نے بہت سے مظلوموں کی دعائیں رشوت کے طور پر لی ہیں۔ گواہ اللہ ہے کہ میری اولاد سُکھی اور خوشحال ہے۔

اتنی خوبصورت لڑکی ایسے آدمی کی بیوی بن گئی جو اُس سے پچیس چھبیس سال بڑا تھا اور اُس کے بیٹے کی عمر رضیہ جتنی تھی۔

بوڑھا خاوند
گرم سرد دوائیاں کھانے لگا

رضیہ کی عجیب سی ازدواجی زندگی شروع ہو گئی۔ خان بہادر ہفتے میں کبھی ایک کبھی دو راتیں رضیہ کے گھر گزارتا تھا۔ ایک دو دفعہ ہفتے میں دن کو آتا تھا۔ دو سال بعد رضیہ کے ہاں یہ بیٹا پیدا ہوا۔ اب یہ بچہ دس سال

کا ہوگیا تھا۔ خان بہادر بیمار ہوگیا اور پورا ایک مہینہ رضیہ کے پاس نہ آیا۔ میں نے آپ کو شاید یہ نہیں بتایا کہ خان بہادر کا گاؤں جہاں اُس کی اراضی تھی، قصبے سے چودہ پندرہ میل دُور تھا۔ وہ جگہ دوسرے تھانے کے علاقے میں تھی۔ میں اُس علاقے میں رہ چکا تھا اور خان بہادر کے ساتھ میری دوستی وہیں ہوئی تھی۔ اب اُس کا کارخانہ میرے تھانے کے علاقے میں تھا۔ اُس کے ساتھ ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔

خان بہادر بیمار ہوگیا تو اُس نے رضیہ کے نام اپنے ایک ملازم یٰسین کے ہاتھ رُقعہ بھیجا۔ اس میں اُس نے اپنی بیماری کا حال لکھا اور یٰسین کی بابت لکھا کہ یہ اُس کا خاص ملازم ہے اور اسے اس شادی کا علم ہے۔ خان بہادر نے لکھا کہ یٰسین کے ساتھ رضیہ ہر طرح کی بات کر سکتی ہے اور یہ پوری طرح اعتبار کے قابل ہے۔

بیماری لمبی ہوگئی۔ خان بہادر نے یٰسین کے ہاتھ تین چار رُقعے بھیجے۔ رضیہ ان رُقعوں کو سنبھال کر رکھتی رہی۔ رضیہ کو اپنے باپ نے بتایا کہ خان بہادر کی غیر حاضری میں اُس کا بیٹا حامد کبھی کبھی کارخانے میں آتا ہے۔ (حامد اصلی نام نہیں)۔ خان بہادر اور اُس کے بیٹے کو رضیہ کے باپ پر بھروسہ تھا، اس واسطے اُن کو کارخانے کا کوئی غم نہیں تھا۔

اس سے آگے میں اس قصّے کو اور زیادہ مختصر کر دیتا ہوں۔ رضیہ پہلے ہی گھر میں ایک قیدی کی طرح زندگی گزار رہی تھی۔ شادی کے بعد وہ بالکل قیدی بن گئی۔ شادی کا راز اُس کو پریشان رکھتا تھا اور اس واسطے وہ اور زیادہ اُداس رہتی تھی کہ اُس کو اپنی عمر سے دُگنی سے بھی زیادہ عمر کا خاوند ملا تھا۔ ایسے سمجھ لیں جیسے افسانے لکھنے والے لکھا کرتے ہیں کہ اُس کی جوانی کے جذبات کو گھُن لگ گیا۔ وہ کسی سے بھی نہیں ملتی تھی۔

خان بہادر امیر آدمی تھا اور دیہات میں رہتا تھا اور خالص غذا کھاتا تھا اس واسطے وہ تندرست رہا مگر وہ شراب پیتا تھا۔ رضیہ کو شاید معلوم نہیں تھا۔ شراب نے اُس کو بیمار کرنا شروع کر دیا۔ بڑھاپا پہلے ہی تھا۔ وہ ڈاکٹروں اور حکیموں کی گرم سرد دوائیاں کھانے لگا۔ ان سے اُس کا جسم کمزور

ہوگیا۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو مجھ کو رضیہ نے نہیں بتائی تھیں۔ کچھ مجھ کو معلوم تھیں اس واسطے کہ میں اُس کو بیماری کے دوران کئی مرتبہ ملا تھا۔ میں نے اُس کو کہا تھا کہ وہ اب شراب چھوڑ دے لیکن اس واسطے کہ عادت بہت پُرانی تھی وہ شراب نہیں چھوڑتا تھا۔ میں اُس کے گھر کے سارے حالات جانتا تھا لیکن اس دوسری شادی کا مجھ کو ذرا سا بھی شک نہیں ہُوا۔

شادی کے پانچ چھ سال بعد رضیہ کا باپ مر گیا۔ اسی کے واسطے رضیہ نے یہ قربانی دی تھی کہ اپنی جوانی کو برف میں دبا دیا تھا۔ وہ بھی نہ رہا۔ رضیہ نے مجھ کو کہا — "اگر پتہ چل جاتا کہ ابّا جان میری شادی کے اتنی جلدی بعد مر جائیں گے تو میں خان بہادر کے ساتھ شادی نہ کرتی۔ پانچ چھ سال انتظار کر کے اپنی عمر کا کوئی آدمی ڈھونڈ لیتی" — یہ کہہ کر اُس نے پھر رونا شروع کر دیا۔

خان بہادر نے کارخانے کے کسی مزدور کی بیوی کو رضیہ کے گھر ملازم رکھوا دیا۔ یہ عورت بھی یٰسین کی طرح قابلِ اعتبار تھی اور اس کی اُس کو الگ تنخواہ ملتی تھی۔

رضیہ نے کئی مرتبہ خان بہادر سے کہا کہ اس طرح کیسے زندگی گزرے گی۔ مناسب یہ ہے کہ اس بھید سے پردہ اٹھا دیں لیکن خان بہادر اتنا بزدل نکلا کہ پردہ اُٹھاتے ڈرتا تھا۔ ویسے وہ بُزدل نہیں تھا۔ پیشہ ور قاتل اور ڈاکو اُس کے ہاتھ میں تھے۔ سارا علاقہ اُس سے ڈرتا تھا۔ جابر اور رُعب والا آدمی تھا مگر دوسری شادی کے معاملے میں اُس نے بہت بُزدلی دکھائی۔ یہ اُس کی بڑی سخت غلطی تھی۔

"جس طرح میرے ابّا جان کو میرا غم کھا رہا تھا بالکل اسی طرح خان بہادر کو دوسری شادی کیڑوں کی طرح کھانے لگی" — رضیہ نے کہا — "وہ میرے بیٹے کے ساتھ بہت پیار کرتے تھے مگر کبھی کبھی یکلخت وہ خاموش ہو جاتے اور پھر بے چین سا ہو کر باہر نکل جاتے۔"

یہ تو میں نے بھی دیکھا۔ جن دنوں کی بات رضیہ کر رہی تھی، اُن دنوں اور آخری دنوں وہ بہت اُداس اور پریشان رہتا تھا۔ اُس کی موت کی مجھے

اطلاع ملی تو میں فوراً اُس کے گاؤں گیا اور جنازے میں شامل ہُوا تھا۔ اب رضیہ نے بات سُنائی تو میں خان بہادر کی اُداسی اور پریشانی کی وجہ سمجھا۔

پھر وہ بیوہ ہوگئی

رضیہ کا بیٹا دس سال کا ہوگیا۔ وہ سکول پڑھتا تھا۔ اس بچے کے بعد رضیہ کو کوئی بچّہ نہ ہُوا۔ خان بہادر بیمار رہنے لگا تھا اور وہ بہت تیزی سے بوڑھا ضعیف نظر آنے لگا۔ میرے دماغ میں یہ خیال آیا کہ رضیہ کی خوبصورتی اور اُس کے قدبت نے خان بہادر کی عقل پھیر دی تھی۔ اُس نے پھری ہُوئی عقل سے شادی کر لی لیکن جب اُس کا جسم اور جذبات ٹھنڈے ہونے لگے تو اُس کو احساس ہُوا کہ وہ کیا غلطی کر بیٹھا ہے۔ مجھ کو ایک خیال یہ بھی آیا کہ وہ اپنے بڑے بیٹے سے دبتا تھا۔ میرے اس خیال کی تصدیق بعد میں ہوگئی تھی۔ خان بہادر رضیہ کے پاس آنے کی بجائے اپنے ملازم لیئین کے ہاتھ خفیہ طور پر پیسے اور رُقعے بھیجا کرتا تھا۔ رضیہ رُقعے سنبھال کر رکھتی رہی۔ یہ اب چوری ہو گئے تھے۔ رہے پیسے پیسے کی اُسے کوئی تنگی نہیں تھی۔

ایک روز لیئین رضیہ کو یہ خبر سُنانے آیا کہ خان بہادر مر گئے ہیں۔ اُسے مرے دو روز گزر گئے تھے۔ لیئین گھر میں ماتم کی وجہ سے مصروف تھا اس واسطے وقت پر نہ آسکا۔ اب بھی وہ چوری چھپے آیا تھا۔ رضیہ کو خان بہادر کے مرنے کا غم یہ نہیں تھا کہ اُس کا خاوند مر گیا ہے بلکہ یہ غم تھا کہ اب اخراجات کا کیا بندوبست ہوگا۔ یہ ڈر بھی لگا کہ اب خان بہادر کا بیٹا حامد کارخانے میں آجائے گا اور وہ مکان سے نکال دے گا۔ خان بہادر نے اُسے کسی وقت بتایا تھا کہ اپنے بیٹے کو اُس نے اراضی کے معاملات میں ایسا مصروف رکھا ہُوا ہے کہ وہ کارخانے میں نہیں آسکتا۔

خان بہادر کے مرنے کے بعد رضیہ کو پہلا خیال یہ آیا کہ اب پیسے

کہاں سے آئیں گے اور اُس کے دماغ میں دوسرا خیال جائیداد میں سے اپنے بچّے کے حصّے کا آیا۔ اُس نے اپنے باپ کے کاغذوں میں سے نکاح نامہ ڈھونڈ لیا اور اُس کو یہ خوشی ہوئی کہ اُس نے کسی خیال کے بغیر خان بہادر کے سارے رقعے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ اُس نے سارے رُقعے اکٹھے کر لئے اور نکاح نامہ اُن کے ساتھ رکھ کر ایک کپڑے میں باندھ دیئے۔ اُس کو بڑا عقل والا خیال آیا تھا کہ وہ جب کہے گی کہ وہ بھی خان بہادر کی بیوہ ہے اور اُس کا بیٹا خالد خان بہادر کا بیٹا ہے تو کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔ سب کہیں گے یہ عورت پاگل ہے یا دھوکہ باز ہے۔

"اب بتاؤ یہ راز کس طرح کھُلا" — میں نے رضیہ سے پُوچھا — "راز کھُلا ہے تو ہی کسی نے یہ کاغذات چوری کر لئے ہیں۔ چور میرے دماغ میں ہے۔ وہ خان بہادر کا بیٹا حامد ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ اگر آپ کو معلوم ہے تو مجھ کو بتائیں کہ یہ راز کس طرح ظاہر ہُوا۔"

رضیہ نے سر جھکا لیا۔ میں اُسے دیکھتا رہا۔ اُس نے سر اُٹھایا اور پھر سر جھکا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس میں بھی کوئی راز ہے اس واسطے کہ اُس نے نظریں چھپا لی ہیں۔ میں نے بڑے آرام اور ہمدردی سے اُسے بولنے کو کہا۔ اُس نے سر اُٹھایا اور آہستہ سے بولی — "یہ بھی بتانا پڑے گا؟"

"آپ نے جہاں اتنی لمبی بات سُنا دی ہے وہاں یہ بات چھپانے کی کوئی تُک نہیں" — میں نے کہا — "اگر آپ چور پکڑنا چاہتی ہیں تو مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔ یہ نہ بھُولیں کہ آپ مجھ سے مدد لینے آئی ہیں۔"

تیسرا مرد اور جذبات

اُس نے ایک اور کہانی سُنا دی۔ اُس نے ارادہ کیا تھا کہ نہیں سُنائے گی اس واسطے کہ یہ بات ہی کچھ ایسی تھی۔

"خان بہادر کے مرنے کے سات آٹھ روز بعد میرے دروازے پر دستک ہُوئی" — رضیہ نے سُنایا — "نوکرانی نے دروازہ کھولا اور مجھ کو

آکر بتایا کہ خان بہادر کا بیٹا حامد آیا ہے۔ میں اتنی جلدی کچھ نہ سوچ سکی کہ اُس کو اندر بلاؤں یا نوکرانی سے کہوں کہ اُس سے پوچھ آئے کہ وہ کیوں آیا ہے۔ نوکرانی نے کہا تھا کہ خان بہادر کا بیٹا آیا ہے اس واسطے میرے مُنہ سے نکل گیا کہ اُسے اندر بُلا لو۔ میں پردہ کرتی تھی لیکن اُس سے پردہ نہ کیا۔ ایک بڑا خوبصورت جوان میرے سامنے آگیا۔ یہ تھا حامد جس کی بابت میں سُنتی رہی تھی کہ خان بہادر کا بڑا بیٹا ہے۔ اُس کی عمر مجھ سے سال دو سال زیادہ ہے۔ میرے دل میں ڈر تھا کہ کیوں آیا ہے لیکن میں بیان نہیں کر سکتی کہ اُس کو دیکھ کر میرے دل سے ڈر کس واسطے نکل گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر قدرتی مسکراہٹ تھی۔ اُس نے مجھ کو سلام کیا۔ میں نے اُس کو کمرے میں بٹھایا اور پوچھا کہ وہ کیوں آیا ہے۔

"اُس نے پہلے میرے اباجان کو یاد کیا اور اُن کی بہت تعریف کی۔ مجھے تسلی ہوگئی کہ اُسے یہ نہیں چلا کہ میں اُس کے باپ کی بیوہ ہوں۔ میں نے خان بہادر کے مرنے کا افسوس کیا۔ اُس نے کہا ۔۔۔ 'اب کارخانہ مجھ کو چلانا ہے۔ مجھ کو کسی نے بتایا تھا کہ یہ مکان کارخانے کا ہے اور میرے اباجان نے آپ کے والد صاحب کو دیا تھا۔ آپ فکر نہ کریں، میں آپ کو یہاں سے نکالوں گا نہیں۔ آپ کے والد صاحب میرے اباجان کے بھائی بنے ہوئے تھے۔ میں صرف یہ معلوم کر رہا ہوں کہ ہماری جائیداد کہاں کہاں بکھری ہوئی ہے'....

"میں نے مکان کی رجسٹری سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ حامد کے کہنے کے بغیر میں نے دوسرے کمرے میں جا کر رجسٹری نکالی اور اُس کو دکھا کر کہا کہ یہ مکان میرے اباجان نے بنوایا تھا۔ اُس نے رجسٹری کو ہاتھ نہ لگایا۔ کہنے لگا کہ مجھے آپ پر بے اعتباری تو نہیں۔ وہ مجھے ہمدردی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جانے کے لئے کہنے لگا تو میں نے کہا کہ اتنی جلدی کیا ہے، ذرا بیٹھو۔ وہ شاید یہی چاہتا تھا کہ میں اُس کو بیٹھنے کے واسطے کہوں۔ وہ بیٹھا رہا....

"آپ شاید میری اس بات کو پسند نہیں کریں گے۔ میں نہیں چاہتی

تھی کہ وہ چلا جائے۔ اپنے باپ اور اس کے باپ کے بعد یہ تیسرا مرد تھا جس کے ساتھ میں نے باتیں کی تھیں۔ ان تینوں میں یہ پہلا مرد تھا جو میری عمر کا تھا۔"

رضیہ نے اپنے جذبات کی باتیں اپنے الفاظ میں کی تھیں۔ بعض باتیں اُس نے صاف کر دیں اور بعض باتیں گول گول کہیں۔ میں اُس کا مطلب سمجھتا رہا۔ میں نے اُس پر کچھ سوال بھی کئے تھے جن کے اُس نے جواب دیئے۔ حامد کو اپنے پاس دیکھ کر اُس کے دل میں جو گڑبڑ پیدا ہوگئی تھی وہ میں اپنے الفاظ میں بیان کر دیتا ہوں اس واسطے کہ بات بہت لمبی نہ ہو جائے۔

رضیہ گھر میں ایک قسم کی قید تھی۔ اُس کا تعلق دو بوڑھے آدمیوں کے ساتھ رہا۔ اُس نے اپنے باپ کو کہہ دیا تھا کہ اُس کے آرام اور خدمت کے واسطے وہ شادی نہیں کرے گی مگر خان بہادر نے اُس کا خاوند بن کر اُس کے جذبات کو جگا دیا اور جذبات کو کچل بھی دیا۔ وہ فرشتوں کی سیرت والی عورت نہیں تھی۔ وہ تو اپنے باپ کی محبت کے واسطے پھنس گئی تھی۔ اب حامد اُس کے پاس آیا تو اُس کے اندر جو عورت قید تھی وہ آزاد ہونے کے واسطے تڑپنے لگی اور اُس کے جذبات جاگ پڑے۔ اُس کے دماغ میں یہ احساس جاگ پڑا کہ وہ ابھی جوان ہے اور اُس نے اپنی جوانی کو دبایا ہوا تھا اور اُس کا خاوند حامد جیسا آدمی ہونا چاہیئے تھا، اس واسطے اُس کو اپنے اُوپر قابو نہ رہا۔ حامد کے دل میں بھی شاید ایسے ہی خیال آ گئے تھے۔ رضیہ ابھی تک خوبصورت تھی۔ حامد نے اُس کے ساتھ ہمدردی اور بے تکلفی کی باتیں شروع کر دیں۔ ایسی باتیں رضیہ کو بہت اچھی لگیں۔

حامد جب جانے لگا تو رضیہ کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا کہ آپ پھر آئیں گے؟ اور خود ہی کہا ۔۔۔ "ضرور آنا۔ میں انتظار کروں گی"۔۔۔ حامد نے پکا وعدہ کیا کہ کل آؤں گا۔ رضیہ نے مجھے بغیر شرم کے بتا دیا کہ حامد چلا گیا تو رضیہ کو بہت افسوس ہوا۔ اُس نے دل میں لذت محسوس کی کہ اُس کی عمر کا ایک آدمی اُس کے پاس آتا ہے۔

قربانی — جان کی آسان جوانی کی مشکل

حامد دوسرے دن آگیا۔ رضیہ اُس کے انتظار میں بے حال ہو چکی تھی۔ آپ انسان کی فطرت کو سمجھتے ہوں گے اس واسطے کہ آپ خود بھی انسان ہیں۔ اگر آپ پیاس سے مر رہے ہوں یا اگر آپ اس واسطے پیاس کو برداشت کر رہے ہوں کہ پانی ملنے کی کوئی امید نہیں تو اُس طریقے سے پیاس مر نہیں جاتی۔ آپ کو جہاں پانی نظر آئے گا وہاں آپ پانی کے اُوپر گر پڑیں گے اور کہیں گے کہ میں تو یہ سارا تالاب پی لُوں گا۔ اگر آپ سے کوئی کہے کہ اگر تم مسلمان ہو تو یہ پانی نہ پیو۔ آپ کہیں گے کہ پہلے پانی پی لوں، پھر بتاؤں گا کہ میں مسلمان ہوں یا نہیں۔

رضیہ کی حالت یہی تھی۔ میں نے اُس کی باتوں سے حساب لگایا کہ اُس نے ایک ایسی قدرتی پیاس کو دبایا ہُوا تھا جس کا تعلق جذبات کے ساتھ تھا۔ اُسے پانی نظر آگیا تو پیاسے جذبات نے اُس کو دبا لیا اور اُس کی عقل پھر گئی۔ جذبات میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ یہ عقل کو مار دیتے ہیں پھر انسان سے گناہ اور جرم سرزد ہوتے ہیں۔

حامد دوسرے دن آیا تو رضیہ کو دل میں ایسے لگا جیسے وہ اس عمر تک اسی خوبصورت شخص کا انتظار کرتی رہی ہے۔ حامد کو میں جانتا تھا۔ وہ شریف آدمی نہیں تھا۔ اُس نے رضیہ کے ساتھ بے تکلفی پیدا کر لی لیکن رضیہ میں ابھی کچھ شرم اور جھجک باقی رہ گئی تھی۔ اُس نے حامد پر یہ تو ظاہر کر دیا کہ وہ اسے بہت اچھا لگتا ہے لیکن یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ کیوں اچھا لگتا ہے۔

حامد نے اُس سے پوچھا کہ اُس کا خاوند کہاں ہے؟ رضیہ کو یقین ہو چکا تھا کہ حامد کو اُس کی شادی کا کچھ بھی علم نہیں اس واسطے اُس نے جھوٹ بولا۔

"اس بچے کے پیدا ہونے کے ایک سال بعد میرا خاوند مر گیا تھا" —— رضیہ نے کہا —— "میں نے پھر اس واسطے دوسری شادی نہیں کی کہ

ابا جان اکیلے تھے اور بیمار رہتے تھے۔ میں نے اپنی جوانی اُن پر اور اپنے بچے پر قربان کر دی۔"

"تم کو پتہ چل گیا ہو گا کہ جان کی قربانی دینا آسان ہے" — حامد نے کہا — "جوانی کی قربانی دینا بڑا مشکل کام ہے۔"

رضیہ کے مُنہ سے یہ الفاظ اپنے آپ نکل گئے — "ہاں، یہ تو بہت ہی مشکل ہے۔"

اُس دن دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا کہ دلوں میں کیا ہے اور انہوں نے ایک دوسرے کو بتا بھی دیا۔ رضیہ کی حرکتوں کی وجہ سے حامد کو پتہ چل گیا کہ یہ عورت اب اُس کی اپنی ہے۔ رضیہ کا ہاتھ حامد نے اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے اپنے ساتھ لگایا تھا تو رضیہ اُس کے قریب ہو گئی تھی۔ اُسی دن حامد کو گاؤں جانا تھا۔ اُس کے باپ کا ابھی چالیسواں بھی نہیں ہُوا تھا۔ اُس کو گھر سے پیغام ملا تھا کہ وہ فوراً گاؤں آجائے۔ وہ رضیہ کو یہ کہہ کر چلا گیا کہ جلدی آؤں گا۔

سوتیلی ماں، جوان بیٹا، باپ کی رُوح

وہ جلدی نہ آسکا۔ تقریباً بیس دن گزر گئے۔ وہ شام کے وقت آیا۔ رضیہ نے اُس کو کہا کہ وہ کھانا یہیں کھائے۔ حامد یہیں رہنے کے لئے آیا تھا۔ وہ رُک گیا۔ کھانے کے بعد رضیہ نے نوکرانی کو گھر بھیج دیا۔ یہ دونوں اکٹھے بیٹھ گئے۔ حامد نے رضیہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی طرف کھینچا اور وہ مسکرایا۔ رضیہ سمجھ گئی وہ بھی مسکرائی اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے بڑی دھیمی آواز میں کہا — "آؤ" — حامد اُس کے ساتھ چل پڑا۔

رضیہ جب سونے والے کمرے میں حامد کے ساتھ داخل ہوئی تو آگے جو ہُوا وہ اُس کے الفاظ میں سُنیں۔ کوئی تھانیدار ہر مجرم کی باتیں یاد نہیں رکھ سکتا اس واسطے کہ اتنے لمبے عرصے میں ہزاروں مجرم سامنے

آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں لیکن بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کی عمر دو سو سال ہو جائے تو بھی وہ ان باتوں کو نہیں بھول سکتا۔ رضیہ کی یہ بات مجھ کو ابھی تک یاد ہے۔

"میں تو آدھی ہو گئی تھی جی!" — اُس نے بڑے صاف لہجے میں کہا۔ "میں کہتی تھی کہ بس مجھ کو حامد کی ضرورت ہے۔ یہ مل گیا ہے تو مجھ کو دُنیا میں کچھ اور نہیں چاہیے۔ میرا بچہ سو گیا تھا۔ میں کہتی تھی کہ اس وقت مجھ کو بچہ بھی نہیں چاہیے۔ میں حامد کو ساتھ لے کر سونے کے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ میرے سامنے دو پلنگ ایک دوسرے کے ساتھ بچھے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں وہ کیا چیز تھی جس نے میرے دل کو مٹھی میں پکڑ لیا اور اتنے زور سے دبایا کہ میں نے دل میں اور سر میں سخت درد محسوس کیا۔ میرا پسینہ بھی نکل آیا۔۔۔۔

"کون کہتا ہے کہ جو مر جاتے ہیں اُن کی رُوحیں واپس نہیں آتیں؟ میں نے پہلے خان بہادر کو دیکھا۔ وہ پلنگ پر بیٹھے تھے اور مجھ کو دیکھ رہے تھے۔ اُن کا چہرہ بہت اُداس تھا۔ اسی پلنگ پر میرے ابا جان بھی لیٹا کرتے تھے۔ اُن کی وفات اسی پلنگ پر ہوئی تھی۔ یہیں سے اُن کی میت اُٹھائی گئی تھی۔ خان بہادر کو میں نے اسی پلنگ پر اُداس بیٹھے دیکھا تو اُن کا چہرہ میرے ابا جان کا چہرہ بن گیا۔ انہوں نے کہا — تم تو کہتی تھیں کہ اپنی جوانی میرے واسطے قربان کر دو گی۔۔۔ کیا کر رہی ہو رضیہ؟ پھر ابا جان بھی غائب ہو گئے اور کمرے میں مجھ کو کسی مرد کے رونے کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ مجھ کو اپنے باپ اور حامد کے باپ کی آوازیں جو سسکیوں کی طرح تھیں سُنائی دے رہی تھیں۔ معلوم نہیں وہ کیا کہہ رہے تھے۔ میں اتنا ہی جانتی تھی کہ وہ اس گھر میں موجود ہیں۔۔۔۔

"میں نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا — 'نہیں، حامد! نہیں۔۔۔۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں۔ میں یہ کام۔۔۔۔'

"حامد ہنسا اور اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اُس کا جسم تپ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے میں بھی اسی طرح تپ رہی تھی اور یہی تپش مجھے سونے والے کمرے میں لے گئی مگر پلنگوں کے قریب جا کر میرا جسم بالکل سرد ہو گیا۔ میں حامد کے بازوؤں سے نکل آئی اور پھر سونے والے کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں چارپائی پر جا بیٹھی۔ حامد نے آکر میرے دونوں ہاتھ پکڑے اور مجھے اٹھانے لگا۔۔۔۔

"اُس نے کہا — 'تم ڈرتی کیوں ہو رضیہ؟۔۔۔۔ یہاں اور کوئی نہیں۔۔۔۔ چلو اُٹھو' — لیکن میں نہ اُٹھی۔۔۔۔

"حامد نے جب دیکھا کہ میں سونے کے کمرے میں نہیں جا رہی تو اُس نے مجھ کو اسی چارپائی پر گرا دیا جس پر میں آکر بیٹھی تھی اور اُس نے مجھ کو اُٹھایا تھا۔ میں جوش سے اُٹھی اور اُس کے مُنہ پر بڑی زور سے تھپڑ مار کر کہا — 'بدکار، پاپی! تجھ کو اپنے باپ کی بھی آواز نہیں سُنائی دیتی؟ میں تیری ماں ہوں، سوتیلی ماں۔ میں تیرے باپ کی بیوہ ہوں۔ تیرا باپ اس گھر میں موجود ہے'۔۔۔۔

"معلوم نہیں میں نے کیا کیا واہی تباہی بک ڈالی۔ اُس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُس کا مُنہ بھی کھل گیا۔ اُس نے بڑی دھیمی آواز میں کہا — 'تم تو پاگل ہو گئی ہو۔ میں نے کارخانے میں اپنے کمرے میں شراب رکھی ہوئی ہے۔ میں لے آتا ہوں۔ تھوڑی سی پی لو۔ خدا کی قسم، فوراً ٹھیک ہو جاؤ گی' — میں نے یہی رٹ لگائے رکھی کہ میں اُس کے باپ کی بیوہ ہوں۔۔۔

"بہت ساری بک بک کے بعد اُس کو ہوش آنے لگا کہ میں پاگل نہیں۔ میں نے اُس کو کہا کہ تم سمجھ نہیں سکے کہ میں اتنا عرصہ اکیلی کس طرح رہی ہوں اور خان بہادر جب کارخانے میں آتے تھے تو راتوں کو کہاں رہتے تھے۔۔۔۔ اُس نے پوچھا کہ اس کا ثبوت کیا ہے۔ میں اُس وقت کسی اور حالت میں تھی۔ وہ بڑا تندرست اور طاقتور مرد تھا۔ جذبات کی گرمی سے اُس کی آنکھیں لال ہو گئی تھیں اور وہ وحشی بنا ہوا تھا۔ میں اُس سے اپنی عزت بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں طاقت سے اُس سے نہیں بچ سکتی تھی۔ اُس نے ثبوت مانگا تو میں نے ٹرنک میں سے نکاح نامہ نکال

کر اُسے دکھا دیا، اور پھر اُس کو خط بھی دکھائے جو خان بہادر اپنے ملازم یٰسین کے ہاتھ مجھے بھیجا کرتے تھے ....

"اُس نے جب نکاح نامہ دیکھ لیا تو میں نے جھپٹا مار کر اُس کے ہاتھ سے نکاح نامہ لے لیا۔ اُس نے اپنے باپ کا ایک ہی خط دیکھا اور خود ہی مجھ کو دے دیا۔ وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔ اُس کی زبان بند ہو گئی۔ وہ آہستہ سے گھوما اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ پہلے تو اُس نے سر کو جھکائے رکھا، پھر مجھ کو دیکھ کر بولا — 'تو یہ خفیہ شادی تھی۔ میرے ابّا جان دو زندگیاں گزار کر مرے ہیں' — میں نے پیار سے اُس کے گلے میں باہیں ڈال کر اور اُس کے سامنے فرش پر بیٹھ کر کہا — 'وہ مر گئے ہیں۔ جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ تم نے دیکھ لیا ہے میرے دل میں تمہاری کتنی محبت ہے۔ اسے قائم رہنے دو۔ میرا بیٹا خالد تمہارا بھائی ہے۔ اس کی آنے والی زندگی سنوار دو۔ دیکھو، میں نے تمہیں کتنے بڑے گناہ سے بچایا ہے' ....

گناہ کا ارادہ، خدا کی آواز

"اُس نے مجھ کو اس طرح چونک کر دیکھا جیسے سویا ہوا تھا اور میری آواز پر جاگ اُٹھا ہے۔ اُس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے — 'تمہارا بیٹا میرے باپ کا بیٹا ہے۔ تم کہتی ہو کہ اس کی آنے والی زندگی کو میں سنواروں.... ہوں .... میں تمہارا مطلب سمجھتا ہوں' — معلوم نہیں وہ کیا سمجھا۔ اُس نے پھر سر جھکا لیا اور پھر اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اُس نے رُک کر کہا — 'زبانی تو کوئی نہیں مانے گا کہ تم خان بہادر کی دوسری بیوی تھیں۔ یہ نکاح نامہ اور اُن کے خط مجھ کو دے دو۔ میں اپنی ماں کو دکھا کر جائیداد میں سے تمہارے بیٹے کا حصّہ الگ کر دوں گا' ....

"اُس کا لہجہ بدل گیا تھا۔ پہلے تو صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس پر میرا بھوت سوار ہے مگر اب ایسے لگا جیسے وہ نکاح نامہ اور خط ہی لینے آیا ہے۔ اُس کی آنکھیں رُوکھی ہو گئی تھیں۔ میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ جس نے میری عقل کو جگا دیا اور یہ خیال آیا کہ شادی کا ثبوت یہی کاغذ ہیں۔ اگر میں نے یہ دے دیئے تو کس کو کہوں گی کہ میں خان بہادر کی دوسری بیوی تھی اور میرا بیٹا جائیداد کے حصّے کا حق دار ہے۔ میں نے حامد کو یہ کاغذ دینے سے انکار کر دیا ....

"اُس نے کہا — 'اگر نکاح نامہ اور یہ خط مجھ کو نہیں دو گی تو بہت نقصان اُٹھاؤ گی' — میں نے اُس کو کہا کہ یہی ایک ثبوت ہے۔ یہ میں کسی قیمت پر نہیں دوں گی۔ اُس نے کہا — 'دیکھو رضیہ! میرے دل میں تمہاری محبت پیدا ہو گئی ہے۔ میں تم کو صاف صاف بتا دیتا ہوں۔ تمہارا بیٹا ہمارا حصّہ دار نہیں بنے گا۔ میں تم کو کچھ رقم دے دوں گا.... کہو، دس ہزار منظور ہے؟' — میں نے اُس کو کہا کہ مجھ کو ایسا شوق بالکل نہیں ہے کہ نقد رقم حاصل کر لوں یا اپنے بیٹے کو جائیداد کا حصّہ دار بناؤں اور اس کا پورا حصّہ وصول کر لوں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میرے بچّے کے مستقبل کا کوئی بندوبست ہو جائے۔ میں نے اُس کو یہ بھی کہا کہ حامد! میرے بچّے کو تم لے جاؤ اور اپنے بھائیوں کی طرح اس کی پرورش کرو۔ مجھ کو اسی مکان میں پڑا رہنے دو۔"

میں نے آپ کو بتایا ہے کہ خان بہادر کے ساتھ میری دوستی تھی اور اس کے گھر میں میرا آنا جانا تھا۔ میں خان بہادر کی پہلی بیوی یعنی حامد کی ماں کو بھی جانتا تھا۔ وہ اچھی عورت تھی لیکن طبیعت کی بہت سخت تھی۔ حامد شریف آدمی نہیں تھا لیکن ماں سے ڈرتا تھا۔ خان بہادر بھی حامد کی ماں سے دبا دبا رہتا تھا۔ حامد شریف آدمی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ انگریزوں کے بنائے ہوئے خان بہادروں کے گھروں میں تعلیم و تربیت کا کوئی رواج نہیں تھا۔ وہ انگریز حاکموں کی خوشامد اور اپنے گاؤں اور ارد گرد کے لوگوں پر حکومت کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ رضیہ کے معاملے میں آپ کو خان بہادر کے کردار کا پتہ چل چکا ہے۔

رضیہ حامد سے کچھ اور کہہ رہی تھی لیکن اس شخص کے دماغ میں صرف

جائیداد تھی۔ دیہات میں اور شہروں کے پسماندہ لوگوں میں ابھی تک یہ عقیدہ ہے کہ جائیداد کی حصہ داری میں ڈنڈی مارنا ضروری ہے اور کوشش یہ کرنی چاہیئے کہ دوسروں کا حق دبایا جائے اور جائیداد کے معاملے میں تنازعہ ضرور کھڑا کیا جائے۔ حامد کے ہاتھ میں طاقت اور دولت تھی اس واسطے وہ کسی حصہ دار کو کیسے برداشت کر لیتا۔ رضیہ اور اُس کے بچے کو تو وہ حصہ دار تسلیم کر ہی نہیں سکتا تھا۔ دماغ میں یہی خیال تھا اس واسطے وہ رضیہ کی بات سمجھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا اس واسطے وہ یہی کہتا رہا کہ نکاح نامہ اور خان بہادر کے خط دے دو اور نقد رقم لے لو۔ اُس نے دس ہزار روپیہ رضیہ کو پیش کیا جو آج کل کے ایک لاکھ روپے سے زیادہ تھا۔

حامد نے رضیہ کو یہ بھی کہا کہ وہ نکاح نامہ ثبوت کے طور پر اپنی ماں کو دکھائے گا اس واسطے کہ جائیداد ماں کے ہاتھ میں ہے اور اُس کی منظوری کے بغیر کوئی ایک تنکا بھی نہیں لے سکتا۔ اُس نے بار بار ان کاغذوں پہ زور دیا تو رضیہ کو اُس کی نیت پر شک ہو گیا۔ اُس نے یہ کاغذ دینے سے انکار کر دیا۔ حامد اُس کو کچھ کہے بغیر چلا گیا۔

رضیہ بہت پریشان ہو گئی۔ ایک تو گناہ کا ارادہ تھا جو اُس نے کیا تھا۔ وہ اِس ارادے سے باز تو آ گئی تھی۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ اُس کے باپ اور خان بہادر کی رُوحیں آتی تھیں اور اُس کو اِس گناہ سے انہوں نے روکا تھا۔ وہ گھر میں اکیلی تھی اس واسطے ڈرنے لگی۔ یہ نفسیات کا علم جاننے والے صاحبان بتا سکتے ہیں کہ رضیہ کو کس جذبے یا کس خیال نے رُوحوں کی شکل میں آکر گناہ سے روک دیا تھا۔ اُس کے دل میں حامد کا ڈر بھی بیٹھ گیا۔ وہ رونے لگی اور اُس نے وضو کر کے کچھ نفل پڑھے اور رو رو کر خُدا سے معافی اور مدد مانگی۔ اُس نے اپنے باپ اور خُدا کی رُوحوں کو بھی پکارا۔ اُسے کمرے میں پھر سرسر کی آوازیں سُنائی دیں۔ وہ اور زیادہ ڈری۔

"لیکن میں نے ایسے سُنا جیسے اس سرسر سے ایک دبی دبی آواز

آ رہی ہے کہ ڈرو مت۔ اللہ کو یاد کرتی رہو"۔ رضیہ نے مجھ کو سُنایا ——
"میرے دل کو ذرا سکون آنے لگا۔ میں نے خُدا کی اور زیادہ عبادت کی۔ اس سے مجھ کو اطمینان تو مل گیا لیکن رات جاگتے گزر گئی"۔

نکاح نامہ اور خط غائب

اس کے ایک ہفتہ بعد کا ذکر ہے کہ وہ صبح ٹرنکوں والے کمرے میں گئی اور سارے ٹرنک اور سُوٹ کیس کھُلے ہوئے اور ان میں سے کپڑے وغیرہ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے دیکھے۔ مکان کی رجسٹری موجود تھی۔ نکاح نامہ اور رُقعے جنہیں وہ خط کہتی تھی، غائب تھے۔ وہ فوراً سمجھ گئی کہ یہ چوری حامد نے کرائی ہے اور اب اُس کو جائیداد میں سے حصہ نہیں مل سکتا۔ حامد کے ساتھ آخری ملاقات کے بعد جو سات آٹھ دن گزرے، اِن دِنوں وہ بہت پریشان رہی۔ وہ اکیلی تھی۔ اُس عمر تک وہ اپنے گھر میں قید رہی تھی۔ اُسے اپنے آس پاس کی دُنیا کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ کسی سے وہ مشورہ بھی نہیں لے سکتی تھی۔ اُس نے یہ بھی نہ سوچا کہ ان کاغذوں کو کہیں ایسی جگہ رکھ دے جہاں سے چوری نہ ہو سکیں لیکن اُس کے دماغ میں یہ خیال آیا ہی نہیں تھا کہ حامد یہ حرکت بھی کرے گا۔

میں نے اُس کو بتایا کہ یہ اچھا ہی ہوا ہے کہ حامد کو یہ کاغذ مل گئے ہیں۔ یہ واپس ہو سکتے ہیں۔ اگر اُسے کاغذ نہ ملتے تو وہ رضیہ یا اُس کے بچے کو غائب کرا دیتا۔ اِن لوگوں کو پولیس والے اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ ہر طرح کا جُرم کرانے پر کرانے کی ہمّت رکھتے تھے۔

اب رضیہ کو ایسی چوٹ پڑی جس نے اُس کو گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اُس کو تھانے کا مشورہ نوکرانی نے دیا تھا اور تھانے کا راستہ بھی اُسی نے سمجھایا تھا۔ میں نے اُس کو تسلّی دی کہ وہ اتنا زیادہ پریشان نہ ہو اور میں اُس کی مدد کروں گا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا اُس کے گھر چل کر بکھرا

ہُوا سامان نہیں دیکھوں گا؟

مجھے وہاں جانا چاہیئے تھا۔ میں نے اپنے دماغ پر بہت زور دیا۔ میں مجرموں اور گناہگاروں اور اُن کے استادوں کی دُنیا کا آدمی تھا۔ مجھے سوچ کر فیصلہ کرنا تھا کہ کیا کروں۔ میرے دماغ میں ایک اور خیال آ رہا تھا۔ معاملہ سیدھا تھا۔ جیسا کہ عورت کہہ رہی تھی کہ اُس کے گھر چوری ہوئی ہے۔ چوری کاغذوں کی ہوتی ہو یا کرنسی نوٹوں کی، جُرم برابر ہوتا ہے مگر میرے دماغ میں خیال یہ آ گیا تھا کہ اس عورت کی مدد بھی ہو جائے اور حامد میرے ہاتھوں گرفتار نہ ہو۔ اس خاندان کے ساتھ میرے دوستانہ تعلقات تھے، اِس واسطے میں ان لوگوں کی عزّت کو محفوظ رکھنے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ پولیس کا کام ہوتا ہے مجرم کو پکڑنا اور اُسے سزا دلانا لیکن یہاں معاملہ کچھ اور تھا۔

مجھ کو معلوم تھا کہ چوری ثابت نہ ہوئی تو اس عورت کی کوئی نہیں مانے گا کہ وہ خان بہادر کی بیوہ ہے اس واسطے کہ اس کے پاس نکاح نامہ نہیں تھا۔ اسے نہ نکاح خواں کا نام معلوم تھا نہ گواہ کو وہ جانتی تھی۔ میں نکاح رجسٹر سے شادی ثابت کر سکتا تھا بشرطیکہ شادی ہوئی ہو مگر ایک خطرہ تھا کہ حامد رضیہ اور اس کے بچے کو غائب کرا دے گا، اس واسطے میں نے اس بات کو خفیہ رکھنے کا فیصلہ کیا کہ رضیہ میرے پاس آئی تھی۔ میں نے حامد اور اُس کی ماں کو ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

رضیہ کو میں نے کہا کہ وہ اپنے گھر چلی جائے اور اُس کمرے میں ٹرنک اور سامان اسی طرح بکھرا رہنے دے اور دروازہ بند کر دے۔ اُسے میں نے اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ رپورٹ لکھوانے کی ضد نہ کرے، میں اُس کا کام کرا دوں گا۔ وہ مان گئی اور چلی گئی۔ میں نے اپنے فیصلے پر غور کیا تو میرے دماغ میں خیال آیا کہ میں اپنے لئے ایک خطرہ مول لے رہا ہوں۔ اگر حامد نہیں مانتا کہ اُس نے کاغذ چوری کرائے ہیں تو میں کیا کروں گا۔ میں کیس باقاعدہ رجسٹر کروں گا اور ایف۔ آئی۔ آر لکھوں گا تو کون سے دن کا

وقوعہ لکھوں گا؟ پولیس کی ایسی کچھ اور کارروائیاں ہوتی ہیں۔ صفائی کے وکیل ان کو سامنے رکھ کر گواہوں پر ایسی جرح کرتے ہیں کہ کیس چوپٹ کر دیتے ہیں۔

ان خطروں کے باوجود میں نے مناسب سمجھا کہ کیس رجسٹر نہ کروں۔ میری اور رضیہ کی بدقسمتی سمجھیں کہ رضیہ کے جانے کے بعد ہیڈ کوارٹر سے مجھے بلاوا آ گیا۔ میں اُسی روز بذریعہ ریل گاڑی چلا گیا۔ اگلے روز ڈی ایس پی کے پیش ہُوا۔ ایک پرانے کیس کی بابت مجھ کو بلایا گیا تھا۔ وہ دن بھی اُدھر ہی گزر گیا۔ میں جب واپس آیا تو ایسا کام میرے ساتھ تھا کہ میں سارے کیس بھول گیا۔ ایک دن اور گزر گیا۔

بچّہ اغوا ہو گیا

سُورج کو ڈوبنے میں ابھی بہت وقت تھا۔ رضیہ سخت گھبرائی ہوئی آئی۔ اُس کے ہونٹ خشک تھے اور اُس کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں۔ وہ بہت روتی رہی تھی۔ اُس نے بتایا کہ اُس کا بیٹا خالد لاپتہ ہو گیا ہے۔ وہ سکول گیا تھا۔ ایک بجے تک گھر پہنچ جایا کرتا تھا۔ وہ ڈیڑھ دو بجے تک نہ آیا تو رضیہ اُس کے دو ہم جماعتوں کے گھروں میں گئی جن کے ساتھ وہ ہر روز سکول جاتا اور واپس آیا کرتا تھا۔ دونوں بچوں نے بتایا کہ چھٹی ہوئی تو وہ سکول سے نکلے۔ آگے ایک میدان تھا۔ وہ اس میں سے گزر کر آتے تھے۔ اس میدان میں ایک دیہاتی سے آدمی نے آواز دی "خالد"۔ خالد نے اُدھر دیکھا تو اُس آدمی نے اُسے اپنے پاس بلایا۔ خالد دوڑا گیا۔ وہ آدمی خالد کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ کچھ دُور ایک تانگہ کھڑا تھا۔ خالد اس آدمی کے ساتھ چلا گیا اور دونوں تانگے میں بیٹھ گئے۔ تانگہ چلا گیا۔ رضیہ نے اُن سے پُوچھا کہ تانگہ شہر کی طرف آیا تھا یا کدھر گیا تھا؟ بچوں نے بتایا کہ وہ اُس کچے راستے پر چلا گیا تھا جو دیہاتی

علاقے کو جاتا ہے۔

"میرا بچہ وہی لے گیا ہے" — رضیہ نے روتے ہوئے کہا اور میرے سامنے بیٹھ کر میری ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گئی — "مجھ کو میرا بچہ واپس لا دو۔ وہ بدمعاش میرے بچے کو قتل کر دے گا۔ اُسے کہو کہ میرے کا خدا اپنے پاس رکھ لو میرا بچہ مجھ کو دے دو۔ مجھ کو جائیداد نہیں چاہیئے یہ مکان بھی مجھ سے لے لو۔"

مجھ کو غصہ تو آیا لیکن میں نے یہ معاملہ پردے میں طے کرنے کی ایک کوشش کا ارادہ کر لیا۔ مجھ کو ڈر یہ تھا کہ حامد نکاح نامہ اور رُقعے جلا چکا ہوگا اور اب بچے کو قتل کر کے لاش غائب کر دے گا۔ ویسے ہی مجھ کو خیال آ رہا تھا کہ بچے کو وہ رات ہی کو قتل کرے گا۔ مجھ کو اس سے پہلے اُس کے پاس پہنچنا چاہیئے تھا۔

میں نے رضیہ کو کہا کہ وہ گھر چلی جائے، میں اُس کا بچہ لے آؤں گا۔ وہ نہیں جاتی تھی۔ وہ تو پاگل ہو رہی تھی۔ کہتی تھی مجھ کو وہاں لے چلو۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے منایا اور وہ روتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے گھر جا کر وردی اُتاری اور پرائیویٹ کپڑے پہنے۔ دو کانسٹیبل ساتھ لئے۔ اپنا ریوالور بھی ساتھ لے لیا۔ ایک یکہ منگوایا اور حامد کے گاؤں کو روانہ ہو گیا۔

راستہ کچا تھا۔ چودہ پندرہ میل کا فاصلہ تھا۔ گھوڑا تیز نہیں چل سکتا تھا۔ حامد کے گاؤں تک پہنچتے رات ہو گئی۔ حامد گھر میں مل گیا۔ اُس کی ماں کو پتہ چلا تو وہ آ گئی۔ اپنے خاوند کو یاد کر کے روتی رہی، پھر میرے واسطے کھانے کا انتظام کرنے اندر چلی گئی۔ میرے ساتھ جو کانسٹیبل تھے انہیں میں نے یکے میں بیٹھا رہنے دیا تھا۔

"کہیں سے واپس آ رہے ہیں یا میرے ہی پاس آئے ہیں؟" — حامد نے پوچھا۔

"تمہارے ہی پاس آیا ہوں یار!" — میں نے کہا — "میرا ایک

کام کر دو۔"

"حکم کرو جی!" — اُس نے کہا — "ایک نہیں سو کام کہو۔"

"نہیں، ایک ہی کر دو" — میں نے کہا — "وہ بچہ مجھے دے دو۔ کسی دُکھیاری ماں کی بددعائیں نہ لو۔"

"کونسا بچہ؟" — اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"حامد!" — میں نے دوستی والے پیار سے کہا — "تمہارے ہاں کس چیز کی کمی ہے۔ کس چکر میں پڑ گئے ہو۔ میری جگہ کوئی اور تھانیدار ہوتا۔"

"تو وہ میرا کیا کر لیتا؟" — اُس نے میری بات بھی پوری نہ ہونے دی۔ کہنے لگا — "میں تو کسی چکر میں نہیں پڑا۔ آپ کسی اور کے چکر میں آ گئے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میں لوگوں کے بچے اغوا کرتا پھرتا ہوں؟ آپ تو ہمارے خاندان کو جانتے ہیں۔"

"نہ یار!" — میں نے کہا — "تم بچوں کو اغوا کرنے والوں میں سے نہیں۔ تم نے پہلا اور آخری بچہ اغوا کیا ہے اور میں جانتا ہوں کیوں اغوا کیا ہے۔"

"کیوں کیا ہے؟" — اُس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"مجھ سے سوال نہ پوچھو حامد! مجھ کو جواب دو" — میں نے کہا — "تم دیکھ رہے ہو کہ میں وردی پہن کر نہیں آیا۔ اپنے ساتھ پولیس گارد لایا ہوں۔ اسے گاؤں سے باہر چھوڑ آیا ہوں۔ یہ سب تمہاری عزت کے واسطے کیا ہے۔ تم میری عزت کا خیال کرو اور اندر خانے معاملہ ختم کر لو۔ میں نے ابھی پرچہ چاک نہیں کیا۔"

"پرچہ چاک کر لو جی!" — اُس نے کہا — "مجھ پر یہ احسان نہ کرو۔"

میں واقعی اُس پر احسان کر رہا تھا۔ کوئی تھانیدار اس طرح کی دھونس کسی مشتبہ یا ملزم کی برداشت نہیں کرتا لیکن میں نے کسی خاص خیال کے واسطے برداشت کیا۔ ایک خیال یہ تھا کہ بچہ قتل نہ ہو اور دوسرا یہ کہ رضیہ کو اس کا حق مل جائے۔ بچہ قتل ہو جاتا تو یہ

ممکن تھا کہ قتل ثابت نہ ہو سکتا۔ حامد کے باز و ویسے بھی بڑے لمبے تھے۔ یہ ایک خان بہادر کی نسل تھی۔ اپنے گاؤں پر اس خاندان کی حکومت تھی لیکن مجھ کو ایسی کوئی مجبوری نہیں تھی کہ حامد کے آگے سر جھکا لیتا اور کوئی کارروائی نہ کرتا۔ میں اپنی اصلی کارروائی کرنے کے واسطے بھی تیار تھا۔

"حامد!" میں نے اُسے بڑے آرام سے کہا ۔۔۔ "تم پر دو الزام ہیں۔ پہلے چوری پھر اغوا۔ معلوم نہیں تم کس لئے بس ہو۔ نکاح نامہ اپنے باپ کے خدا میرے حوالے کر دو۔ میں کیس یہیں ختم کر دوں گا۔"

تمہاری ماں تمہارے لئے تڑپے گی

حامد اور زیادہ غصّے سے بولنے لگا۔ کسی پر جھوٹا الزام تھوپ دو تو وہ غصّے میں آتا ہے لیکن اُس کا غصّہ کسی اور طرح کا ہوتا ہے۔ جس کے خلاف الزام صحیح ہو وہ بھی یہ ظاہر کرنے کے واسطے کہ الزام جھوٹا ہے، غصّہ کرتا ہے مگر یہ غصّہ بناوٹی ہوتا ہے۔ تھانیدار تجربہ کار ہو تو وہ بھانپ لیتا ہے۔ حامد کا غصّہ ایسا ہی تھا۔ اُس کے بناوٹی غصّے پر مجھ کو اصلی غصّہ آ گیا۔ ابھی میں نے غصّہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ اُٹھا اور دروازے کی طرف مُڑا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا اور اُٹھ کر اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا ۔۔۔ "میں تمہاری منت کرنے نہیں آیا۔ دوستی کا حق ادا کر چکا ہوں۔ پوری گارد لے کر آیا ہوں۔"

"جانا کہاں ہے؟" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "آپ کے واسطے کھانا ابھی تک نہیں آیا۔ اندر جا رہا ہوں۔"

"مجھ کو کھانا نہیں چاہیئے دوست!" ۔۔۔ میں نے اُسے بٹھا لیا ۔۔۔ "پہلے ضروری باتیں کر لیں۔"

میرا دماغ حاضر تھا۔ مجھ کو بہت احتیاط کرنی تھی۔ وہ میرے واسطے کھانا لانے نہیں جا رہا تھا۔ مجھ کو شک ہُوا کہ وہ اپنے آدمیوں سے کہنے

جا رہا ہے کہ بچے کو غائب کر دو۔ مجھ کو کاغذوں کا بھی خیال تھا۔ شاید اُس نے یہ کاغذ ابھی ضائع نہیں کئے تھے۔

میرے اِس طرح روکنے پر وہ مجھ پر غصّہ جھاڑنے لگا۔ میں نے پھر بھی برداشت کیا مگر وہ شاید سمجھتا تھا کہ میں اُس سے ڈرتا ہوں۔ اُس نے ایک ایسا لفظ کہہ دیا کہ میں نے دوستی اور نیک نیتی کو الگ پھینک دیا اور میں کھڑا ہو گیا پھر میں نے ریوالور نکال لیا۔

"تم ملزم ہو" ۔۔۔ میں نے اتنی اونچی آواز میں کہا کہ سارے گاؤں نے سُن لیا ہو گا ۔۔۔ "تم نے ایک گھر سے دھوکہ دہی کی نیت سے کاغذ چوری کئے پھر تم نے ایک بچے کو اغوا کیا" ۔۔۔ وہ بولنے لگا تو میں اور اُونچا بولا ۔۔۔ "زبان بند رکھو۔ دوستی کا حق ادا ہو گیا ہے۔ اب میں تھانیدار ہوں اور تم ملزم ہو۔ میں تم کو عزت دار آدمی سمجھ کر سمجھا رہا تھا کہ ایک ماں کی بددعائیں نہ لو اور اُس کا بچہ واپس کر دو۔ یاد رکھو حامد! جس طرح وہ ماں اپنے بچے کے لئے تڑپ رہی ہے اسی طرح تمہاری ماں تمہارے لئے تڑپے گی۔ خُدا کی قسم، عمر قید دلاؤں گا۔ تم بے دید ہو، طوطا چشم ہو۔"

اُس نے میری آواز سے زیادہ اُونچی آواز میں کہا ۔۔۔ "میں تمہیں تھانیداری سے اُتروا دوں گا۔ اس خاندان کو خان بہادری مِلی ہوئی ہے۔"

میں نے اُس کی بڑکوں کی پرواہ نہ کی۔ میں اور زیادہ گرج کر بولا کہ وہ یہاں سے ہلے نہیں۔ میں باہر نکلا۔ اتفاق سے چوکیدار باہر کھڑا تھا۔ اُسے پتہ چل گیا تھا کہ ایک تھانیدار آیا ہُوا ہے۔ آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ یہ تھانہ میرا نہیں تھا۔ دوسرے تھانے سے کسی ملزم کو لانے کے لئے ایک طریقہ ہوتا ہے لیکن اتنا انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ بعض کیس بڑی تیزی سے پیچھا کرنے والے ہوتے ہیں اس واسطے کارروائی پہلے کر کے اس کے بعد "طریقہ" پورا کر لیا جاتا ہے۔ علاقوں کے تھانیدار ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا کرتے ہیں۔

اس قصّے کو آپ چھوڑیں کہ سرکاری اور قانونی کارروائیاں کیا ہوتی ہیں اور کس طرح ہوتی ہیں۔ مجرم کو پکڑنے اور سزا دلانے کے واسطے پولیس کو کچھ غیر سرکاری حرکتیں بھی کرنی پڑتی ہیں۔

میں نے چوکیدار سے کہا کہ میرے دونوں کانسٹیبلوں کو بلا لائے۔ اس کا اثر یہ ہُوا کہ حامد اپنی بے عزتی سے ڈر گیا۔ اُس نے مجھ کو بڑی آہستہ سے کہا— "مت بلاؤ انہیں۔ میری بات سُن لیں۔"

میں نے اپنا غصّہ ٹھنڈا نہ کیا۔ اُس کو کہا کہ اُس کو اب ہر حال میں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔ میں کانسٹیبلوں کو نہیں بلاؤں گا تم خاموشی سے ساتھ چلو۔

اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرو

میں نے اُس کو اپنے تانگے میں بٹھانے سے پہلے کہا— "دیکھو حامد! یہ انتظام کر لو کہ بچہ اگر ابھی تک زندہ ہے تو زندہ رہے۔ اگر تمہارے آدمیوں نے اُسے قتل کر دیا اور اگر نکاح نامہ اور خط جلا دیئے گئے تو دماغ میں یہ خیال بٹھا لو کہ عمر قید دلاؤں گا.... اور یہ خیال رکھنا کہ تانگے میں کانسٹیبلوں اور کوچوان کے سامنے میرے ساتھ کوئی بات نہ کرنا۔"

"نہ بچہ میرے پاس ہے نہ کوئی کاغذ میں نے چوری کیا ہے"— اُس نے کہا— "تمہارا حکم مان رہا ہوں۔ تم بھی سوچ لو۔"

مجھ کو پورا یقین تھا کہ مجرم یہی ہے اور یہ سارا چکر جائیداد کا ہے۔ میں اُسے تانگے میں اس علاقے کے تھانے میں لے گیا۔ وہاں کے تھانیدار سے سرکاری یا قانونی طریقے کی بات ہوتی اور میں اپنے تھانے کو روانہ ہو گیا۔ ہم آدھی رات کے قریب اپنے تھانے پہنچے۔ دیکھا کہ رضیہ وہاں موجود ہے۔ میں تانگے سے اُتر رہا تھا تو وہ دوڑی آئی اور میرے ساتھ لپٹ گئی۔

"میرا بچہ کہاں ہے؟ میرا بچہ کہاں ہے؟"— وہ پاگلوں کی طرح چلّانے لگی— "تم کہتے تھے تمہارا بچہ لے آؤں گا۔"

میں اُسے تسلی دینے لگا تھا لیکن اُس نے حامد کو دیکھ لیا اور حامد کی گردن کو اُس نے اپنے ہاتھوں میں دبا لیا— "میرا بچہ مجھے دے دو۔ پاپی!.... بدکار!.... ظالم کے بچے....!" اور اُس نے حامد کو بہت سی گالیاں دے ڈالیں۔

میں نے رضیہ کو حامد سے الگ کیا اور اُسے اپنے دفتر میں بٹھا کر جھوٹی سچی تسلیاں دیں اور ٹھنڈا کیا۔ باہر آ کر میں نے حامد کو کہا کہ وہ رضیہ کے ساتھ میرے سامنے سودا بازی کرے۔ میں بھی کچھ کوشش کروں گا کہ وہ اپنا حق کم کر دے اور تم اس کا بچہ اور کاغذ واپس کر دو۔

"میں اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کروں گا"— اُس نے رُعب سے کہا۔

"تم جانتے ہو نا یہ کون ہے؟"— میں نے پُوچھا۔

حامد چونکا اور کہنے لگا— "میں اس کو نہیں جانتا یہ کون ہے۔"

اُس کے لہجے میں بناوٹ تھی۔ میں یہی دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اُس کا جواب سُن کر ہنس پڑا اور اُس کو کہا کہ تم آج رات سوچ سمجھ کر اپنی قسمت کا فیصلہ کر لو۔

میں نے کیس کو درج کیا ہی نہیں تھا۔ ابھی تک مجھے اُمید تھی کہ وہ مان جائے گا اور میں تصفیہ کرا لوں گا۔ اس کو ابھی میں حوالات میں بند نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اُسے ایک کمرے میں پہرے میں بٹھا دیا۔ اس کے لئے چارپائی کا انتظام بھی کر دیا۔ رضیہ کو گھر جانے کو کہا تو وہ ڈھیر ہو گئی۔ بہت مشکل سے اُس کو گھر بھیجا اور ایک کانسٹیبل اُس کے ساتھ کر دیا اس واسطے کہ اکیلی گھر جاتے ڈرے گی۔

میں اپنے گھر چلا گیا۔ جسم تھکن سے ٹوٹ گیا تھا۔ کھانا کھا کر میں سو گیا۔

یہ بھی ماں تھی

ایک کانسٹیبل نے آکر مجھ کو جگایا۔ سورج نکل آیا تھا۔ کانسٹیبل نے یہ خوشخبری سُنائی کہ جو بچہ لاپتہ ہوگیا تھا، وہ آگیا ہے۔

"کون لایا ہے؟"— میں نے پُوچھا۔

"ایک معزز عورت گھوڑی پر آئی ہے۔ وہ لائی ہے"— کانسٹیبل نے جواب دیا— "کہتے ہیں کہ خان بہادر کی بیوی ہے۔"

فوراً جو میرے دماغ میں خیال آیا وہ یہ تھا کہ یہ عورت یعنی حامد کی ماں بھی اس جُرم میں شریک ہے اور وہ اس واسطے بچہ واپس لے آئی ہے کہ میں نے اس کے بیٹے کو پکڑ لیا ہے۔

میں نے جو کپڑے پہنے ہوئے تھا انہی میں دوڑتا ہُوا اپنے دفتر میں گیا۔ آگے دیکھا۔ حامد کی ماں بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھ کو شک تو تھا کہ ماں بھی بیٹے کے جُرم میں شامل ہوگی لیکن امید نہیں تھی کہ اتنی اچھی عورت ایسے ذلیل جُرم کی مجرم بنے گی۔ مجھ کو دیکھ کر اُس نے پُوچھا کہ حامد کہاں ہے؟

"جہاں اُسے ہونا چاہیئے تھا"— میں نے کہا۔

"یہ ہے وہ بچہ"— اُس نے بچے کو میری طرف دھکیل کر کہا اور ایک چھوٹا سا بنڈل مجھ کو دے کر کہا— "دیکھ لو، وہ کاغذ یہی ہیں؟"

"کیا میں یقین کر لوں خالہ! کہ آپ بھی اس جُرم میں شریک ہیں؟"

"کیا بکتے ہو محبوب!"— اُس نے مجھ کو اُسی پیار سے کہا جس پیار سے وہ مجھ کو بُلایا کرتی تھی— "مجھ کو تو رات کو پتہ چلا ہے کہ ہمارے خان بہادر صاحب کوئی نہ کوئی تماشا کر کے مرے ہیں۔"

اس بھلی خاتون نے جو بات سُنائی وہ یہ تھی کہ رات کو جب میں اُس کے گھر گیا تو وہ میرے واسطے کھانے کا بندوبست کرنے اندر آگئی۔ کھانا وہ خود اُٹھا کر لائی لیکن باہر ہی رُک گئی اس واسطے کہ میں اور حامد غصّے میں باتیں کر رہے تھے۔ میں حامد کو کہہ رہا تھا کہ اُس نے کاغذ چوری کئے ہیں

اور ایک بچہ اغوا کیا ہے اور میں اسے عمر قید دلاؤں گا۔ حامد کی ماں سمجھ گئی کہ اُس کے بیٹے نے کوئی گڑبڑ کی ہے۔ وہ اندر نہ آئی۔

"تمہاری باتوں سے مجھ کو پتہ چل گیا کہ کیا ہُوا ہے"— اُس نے مجھ کو سُنایا— "تم جانتے ہو کہ حامد میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ تم نے جب اُس کو کہا کہ ایک ماں کی بد دعائیں نہ لو، اُس کا بچہ واپس کر دو، اور تم نے کہا کہ جس طرح وہ ماں اپنے بچے کے لئے تڑپ رہی ہے اسی طرح تمہاری ماں تمہارے لئے تڑپے گی، تو اُسی وقت میرا دل تڑپنے لگا۔ میں بھی ماں ہوں محبوب! میں کسی ماں کی بد دعائیں نہیں لے سکتی۔ پہلے خاوند مر گیا، اب تم مجھ سے میرا اکلوتا بچہ چھین رہے تھے.....

"میں اس واسطے اندر نہ آئی کہ حامد تمہارے آگے جھوٹ بول رہا ہے تو یہ میرے آگے بھی جھوٹ بول لے گا۔ مجھ کو معلوم ہے کہ یہ خود تو ایسا جُرم نہیں کر سکتا، اپنے باپ کی طرح اس کی یاری جُرم کرنے والے لوگوں کے ساتھ ہے۔ اس کے باپ کے دو نوکر ہیں جو ایسے ہی خفیہ کام کرتے تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا اُن سے یہی کام کراتا ہے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ حامد سے پوچھنے کی بجائے ان نوکروں سے پوچھوں۔ ان میں ایک کا نام یٰسین ہے۔ اسے میں ساتھ لے آئی ہوں۔"

میں نے آپ کو سُنایا ہے کہ یٰسین خان بہادر کا نوکر تھا جو اُس کے رُقعے رضیہ کو دے جاتا تھا۔ وہ خان بہادر کا راز دار اور خاص آدمی تھا۔ خان بہادر کی بیوی نے مجھ کو بتایا کہ اُس نے کھانا اندر رکھ دیا اور یٰسین کو بُلایا۔ آپ ذرا غور کریں کہ یہ عورت کتنی عقل والی اور اخلاق والی تھی۔ بڑی سخت طبیعت کی عورت تھی۔ اُس نے یٰسین کو بُلا کر ایک ڈنڈا ہاتھ میں لے لیا۔ اُسے معلوم تھا کہ حامد نے کوئی گڑبڑ کی ہے تو اسی نوکر کے ہاتھوں کرائی ہوگی یا اسے سب کچھ معلوم ہوگا۔

اس خاتون نے یٰسین کو فرش پر بٹھا لیا اور ڈنڈا ہاتھ میں لے کر اُس کے سر پر کھڑی ہوگئی۔ اُس کو اس نے کہا کہ ڈنڈے مار مار کر جان سے

مار دوں گی اور لاش غائب کرا دوں گی۔ سچ بتاؤ کہ تم لوگوں نے کیا کرتوت کی ہے۔ یٰسین اس عورت کو جانتا تھا۔ اس سے خان بہادر اور حامد بھی ڈرتے تھے۔ یٰسین نے اُسے ٹالنے کی کوشش کی۔ حامد کی ماں نے اُس کی پیٹھ پر اس قدر زور سے دو ڈنڈے مارے کہ وہ چلا اُٹھا۔ ماں نے اُس کو کہا کہ بیٹھک میں پولیس اُتری ہوئی ہے۔ وہ اُس کو پولیس کے حوالے کر دے گی۔

اِدھر بیٹھک میں حامد اور میں ایک دوسرے کو دھمکیاں دے رہے تھے۔ اُدھر حامد کی ماں اپنی تفتیش کر رہی تھی۔ اُس نے یٰسین کو بولنے پر مجبور کر دیا۔ یٰسین نے اُس کو جب بتایا کہ خان بہادر نے شہر میں ایک خفیہ شادی کی ہوئی تھی جس میں سے ایک لڑکا ہے تو اس عورت کو چکر آ گیا۔ یٰسین نے اُس کو ساری بات سُنا دی، پھر یہ سُنایا کہ اب جب کہ یہ لڑکا دس گیارہ سال کا ہو گیا ہے حامد کو یہ راز معلوم ہوا ہے۔ حامد نے یٰسین کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اُس کو یہ راز کس طرح معلوم ہوا ہے۔

یٰسین نے بتایا کہ اُس کو حامد نے کہا تھا کہ خان بہادر کی دوسری بیوی کے گھر سے نکاح نامہ اور خط چوری کرنے ہیں۔ یٰسین رضیہ کے گھر جاتا رہتا تھا اس واسطے اس گھر کے اندر سے کچھ کچھ واقف تھا۔ وہ ایک آدمی کو ساتھ لے گیا اور کاغذ چوری کر کے لے آیا۔ دو دنوں بعد حامد نے اس کو کہا کہ رضیہ نے تھانے میں رپورٹ کر دی ہے۔ اس کو اُدھر سے ہٹانے کا یہی طریقہ ہے کہ اس کے بیٹے کو اغوا کرا لو۔ یٰسین اور اُس کے ساتھی نے یہ کام بھی کامیابی سے کر لیا۔ وہ رضیہ کے بیٹے کو پہچانتا تھا۔

انہوں نے بچے کو گاؤں سے تھوڑا سا دُور ایک کچے کوٹھے میں بند کر دیا تھا۔ اس کے دو کمرے تھے۔ ایک میں چارہ اور بھوسا وغیرہ رکھتے تھے۔ حامد کی ماں نے یٰسین کو کہا کہ وہ بچے کو فوراً لے آئے۔ یٰسین اُدھر چلا گیا اور حامد کی ماں بیٹھک میں اس واسطے گئی کہ مجھ کو بتاتے

کہ لڑکا مل گیا ہے اور حامد کے ساتھ یٰسین کی طرح سلوک کر کے اُس سے پوچھے کہ وہ کاغذ کہاں ہیں جو اُس نے رضیہ کے گھر سے چوری کرائے ہیں لیکن میں حامد کو ساتھ لے کر گاؤں سے جا چکا تھا۔

حامد کی ماں کو بہت رنج ہوا۔ یٰسین بچے کو لے کر آ گیا۔ حامد کی ماں نے حامد کے سُوٹ کیس کی تلاشی لی۔ یٰسین کو اُس نے ساتھ رکھا۔ وہ اَن پڑھ عورت تھی اس واسطے کاغذوں کو نہیں پہچان سکتی تھی۔ یٰسین بھی اَن پڑھ تھا لیکن اس کو معلوم تھا کہ کاغذ کپڑے میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ بنڈل مل گیا۔ حامد کی ماں نے یٰسین کو کہا کہ میرے ساتھ تھانے چلو۔ یٰسین نے کہا کہ آدھی رات ہو گئی ہے، اس وقت جانا ٹھیک نہیں۔ اس واسطے وہ صبح روانہ ہوئی جب ابھی ذرا ذرا اندھیرا تھا۔

جب ماں نے ہاتھ جوڑے

اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ــــ "محبوب! میں تجھ کو بھی حامد کی طرح اپنا بیٹا سمجھتی ہوں۔ تُو تھانیدار ہے۔ قانون تیرے ہاتھ میں ہے سیاہ کر، سفید کر، تجھ کو کون پوچھ سکتا ہے۔ میرے بیٹے کو چھوڑ دے۔ اُسے میرے سامنے لا۔ اللہ قسم تیرے پاؤں میں اُس کا سر رکھوا دوں گی۔ میرا ایمان دیکھ۔ چوری کا مال بھی لے آئی ہوں۔ جُرم کرانے والا تیرے پاس ہے۔ جُرم کرنے والے کو بھی لے آئی ہوں۔"

میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ ابھی یہ معاملہ میرے ہاتھ میں تھا۔ میرے دماغ میں یہ خیال بھی آتا تھا کہ یہ کس طرح ثابت ہوگا کہ یہ عورت خود اس جُرم میں شریک نہیں تھی۔ میں نے اس کے ساتھ کچھ باتیں کیں۔ اُس نے میری تسلی کے جواب دیئے۔

"میں جانتی ہوں کہ مجھ کو جائیداد میں سے اس لڑکے کا حصّہ الگ کرنا پڑے گا" ــــ اُس نے کہا ــــ "اگر میرا دل میلا ہو جاتا تو اس لڑکے کو اس کی ماں سمیت غائب کر دینا ہمارے واسطے کوئی مشکل کام نہیں ہیں

نے کسی ڈر سے یہ بچہ اور یہ کاغذ تم کو نہیں دیئے۔ اس واسطے دیئے ہیں کہ میرا دل بالکل پاک ہے اور اس دل میں اپنے بیٹے کی محبت ہے۔ مجھ کو جب یہ ساری خفیہ باتیں معلوم ہوئیں تو میں یہ سمجھی کہ رضیہ شہر کی کوئی رنڈی بدمعاش ہوگی جس نے میرے خاوند کو پھنسا لیا ہوگا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اس عورت کا نہ بچہ واپس کروں گی نہ اس کو جائیداد میں سے ایک رتی دوں گی۔ روپیہ خرچ کرکے اور اثر استعمال کرکے بیٹے کو صاف چھڑا لوں گی، لیکن محبوب! اپنے اللہ پر یقین کرنا کہ لیٹین نے مجھ کو بتایا کہ رضیہ تو نیک اور پردہ دار لڑکی ہے اور اُس کو اپنے باپ کے غم نے میرے خاوند کے جال میں پھنسایا تھا تو میں نے دل میں کہا کہ ہائے عورت ذات کو یہ مرد گائے بکری سمجھ کر اس کو کس چکر میں ڈال دیتے ہیں۔ اب میرا بیٹا اس عورت پر ظلم کر رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ میرے بیٹے کو تھانیدار لے جا رہا ہے تو میرا اندر سے کیا حال ہوا ہے اور جس عورت کا بچہ اغوا ہو گیا ہے اُس کا کیا حال ہو رہا ہوگا۔"

"آپ کو یہ تو پتہ ہی نہیں کہ آپ کا بیٹا رضیہ کو اپنی داشتہ بنا رہا تھا" — میں نے کہا — "اسی سے تو یہ راز کھلا ہے۔ رضیہ نے اُس کو مجبور ہو کر بتا دیا کہ میں تو تیری سوتیلی ماں ہوں، پھر اُس نے اس کا یہ نقصان کیا۔ اگر رضیہ اس کو نکاح نامہ اور خط دے دیتی تو حامد اس کو اپنی داشتہ بنا کر اس کا باقاعدہ وظیفہ لگا دیتا۔ اس بے چاری کا دُنیا میں خدا کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں۔"

"سانپوں کے بچے سانپ ہی ہوتے ہیں محبوب بیٹا!" — ماں نے کہا — "یہ میں ہی جانتی ہوں کہ اس کے باپ کو میں نے کس طرح لگام ڈالی ہوئی تھی، ورنہ وہ میرے اُوپر معلوم نہیں کتنی سوکنیں لاتا۔ اب میری مجبوری یہ ہے کہ اُس کا بیٹا میرے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ میں کرموں جلی ماں ہوں محبوب!" — اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا — "اپنا بچہ لو اور میرا بچہ مجھے دے دو.... دیکھ محبوب! ایک ماں ہاتھ جوڑتی ہے۔"

"خالہ جان!" — میں نے کہا — "اس بچے کی ماں پاگل ہو گئی ہے۔ ابھی آ جائے گی۔ اس کے بچے کو اس واسطے اُٹھایا گیا ہے کہ اس کی ماں اپنا حق نہ مانگے۔ آپ نے اس کے ساتھ یہ نیکی تو کی ہے کہ اُس کا بچہ اُس کو دے دیا ہے لیکن اُس کا حق اسے کون دے گا؟ آپ کو اگر اپنا بیٹا چاہئے تو رضیہ کو اُس کا حق دے دیں۔"

"میں اس کے لئے تیار ہوں" — اُس نے کہا — "مجھ کو معلوم ہے کہ اس کو حق دینا ہے۔"

اسی دوران رضیہ آگئی۔ اُس کی نظر اپنے بیٹے پر پڑی تو اُس نے جھپٹ کر اُسے اُٹھا لیا۔ میں نے اُس کو اُس کے کاغذ دے دیئے اور اُس کو بتایا کہ یہ حامد کی والدہ ہیں اور یہی بچے کو لائی ہیں۔ رضیہ اُس سے بہت چھوٹی تھی۔ اُس نے حامد کی ماں کا شکریہ اُس کے پاؤں چھو کر ادا کیا اور وہ بہت روئی۔ اُس نے روتے روتے حامد کی ماں سے کہا — "میں نے آپ کو کوئی دھوکہ نہیں دیا تھا۔ میں خود دھوکے میں آگئی تھی۔"

یہ تو بڑی لمبی باتیں ہیں جو اِن دونوں کے درمیان ہوتی رہیں۔ میں نے حامد کو بُلایا۔ وہ اپنی ماں، رضیہ اور اُس کے بچے کو دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ ماں نے اُس کو جو گالیاں دیں اور جس طرح اُس پر حملہ آور ہوئی وہ دیکھنے والا منظر تھا۔ حامد کے مُنہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ میں نے بھی اُسے کچھ شرمسار کیا۔

میں نے آخر ان کا سُودا طے کرا دیا جو حامد کی ماں نے بڑی خوشی سے قبول کر لیا اور رضیہ نے بھی۔ دو تین مہینوں بعد مجھے پتہ چلا کہ رضیہ کو سُودے کے مطابق اُس کا حق مل گیا ہے اور یہ بھی پتہ چلا کہ حامد ہیرا پھیری کرنا چاہتا تھا لیکن اُس کی ماں نے اُسے لگام ڈالے رکھی اور رضیہ کو پُورا حق دیا۔



بن بیاہی ماں

بھارت میں بھرت پور کا علاقہ ہندو راجپوتوں کا گڑھ ہے۔ ہر ایک ہندو ہر ایک مُسلمان کا دشمن ہوتا ہے لیکن بھرت پور کے راجپوت مُسلمانوں کو دوسرے ہندوؤں سے زیادہ دشمن سمجھتے ہیں۔ اگر میں آپ کو صرف یہ سُنانا شروع کر دوں کہ ہندو راجپوتوں نے کب سے مُسلمانوں کا خون خرابہ شروع کیا تھا اور ان کو کس کس طرح سے قتل کیا اور ان کی عورتوں کے ساتھ کیسا کیسا سلوک کیا تھا تو آپ کا خون اتنا گرم ہو جاتے کہ آپ غُصّے میں مجھ کو قتل کر دیں۔ یہ بہت دردناک کہانی ہے اور بہت لمبی ہے، اس واسطے یہ ابھی نہیں سُناؤں گا۔

اس علاقے کے ہندو راجپوت ہندوستان کے دوسری ذاتوں کے ہندوؤں سے مختلف ہُوا کرتے تھے۔ یہ اُن ہندوؤں کی طرح نہیں تھے جن کو ہم بُزدل اور دھوتی والے کہا کرتے ہیں، اس واسطے کہ ہندو راجپوت، خاص کر بھرت پور والے، دلیر اور لڑاکے تھے اور قتل اور ڈانگ سوٹے میں ان کی فطرت مُسلمانوں والی تھی۔ نندی گڑھ کو بڑا گاؤں بھی کہتے تھے اور قصبہ بھی۔ وہاں آڑھت کی منڈی تھی اور ایک منڈی جانوروں کی کھالوں کی بھی تھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہندو گائے بیل کو ذبح نہیں کرنے دیتے تھے۔ مُسلمان بڑا گوشت کھاتے تھے اس واسطے بیل گائے ذبح کرنے پر ہندوستان میں فساد ہوتے رہتے تھے اور ان فسادوں میں مُسلمانوں کا بہت نقصان ہوتا تھا، لیکن کھالوں کے تاجر ہندو تھے۔ وہ گائے بیل کی کھالیں بھی خریدتے اور فروخت کرتے تھے۔ منافع کی خاطر

ان کے دماغ سے مذہب نکل جاتا تھا۔

میری کہانی گاتے بیل ذبح کرنے کی بابت نہیں ہے۔ یہ تو میں نے آپ کو ایک فالتو بات سُنائی ہے۔ اصل واردات اس طرح ہوئی تھی کہ فوج کا ایک نائک وردی میں تھانے میں آیا۔ اُس نے اپنا نام نائک موہن کمار بتایا اور نام بتانے کے ساتھ یہ بھی کہا — "میں راجپوت ہوں"۔ اُس نے اپنی ذات اس واسطے بتائی تھی کہ میں اُس کے رُعب میں آجاؤں۔ وہ جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ جنگ ختم ہوتے تین چار مہینے ہو گئے تھے۔ موہن کمار ایک ٹانگ کھینچ کر چلتا تھا۔ اُس کو ایک گولی گھٹنے کے جوڑ میں لگی تھی اس واسطے وہ ٹانگ پوری طرح دوہری نہیں کر سکتا تھا۔

وہ اپنے سگے چچا اور اُس کے بیٹے کے خلاف بڑا سنگین پرچہ کرانے آیا تھا۔ اُس نے بڑی لمبی کہانی سُنائی جس کو وہ اپنا بیان کہتا تھا لیکن یہ ایک عبرت ناک کہانی ہے۔ میں آپ کو اس کی کہانی کی موٹی موٹی باتیں سُناؤں گا اس واسطے کہ ہر ایک بات سُنائی تو آپ کا بہت سارا ٹائم تباہ ہو جائے گا۔ وہ نندی گڑھ سے ڈیڑھ پونے دو میل دُور ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ وہاں اُس کے باپ کی زمین تھی۔ نندی گڑھ میں دو دکانیں تھیں جو کرائے پر چڑھی ہوتی تھیں۔ موہن کمار کی عمر بارہ تیرہ سال تھی اور اُس وقت اس کا باپ مر گیا۔ اس کی صرف ایک بہن تھی جس کی اُس وقت عمر نو دس سال تھی۔ بس یہی باپ کی اولاد تھی۔

ماں نے دونوں کو زمین کی آمدنی اور دکانوں کے کرائے پر بہت اچھی طرح پالا پوسا۔ موہن کمار کے سر پہ باپ کا سایہ نہیں تھا، پھر آمدنی بہت تھی اس واسطے وہ خراب ہو گیا۔ اس کی عمر سولہ سال ہوئی تو ماں بھی مر گئی۔ اس کی بہن اب تیرہ سال کی تھی۔ موہن کمار نے بہن کا بہت خیال رکھا لیکن خود خراب ہو گیا۔ اُس کو کھانے اُڑانے والے دوست مل گئے۔ نندی گڑھ کے بھی دو تین دوست مل گئے۔ ان سب نے اس کو شہزادہ بنا کر اس کو کھانا شروع کر دیا۔

یہ سب راجپوتوں کے لڑکے تھے۔ انہوں نے موہن کمار کو پہلے شراب پلائی اور جب نشہ اُس کے دماغ میں سما گیا تو اُس نے شراب خوری کو عادت بنا لیا۔ اس کے دوست اس سے شراب پینے لگے۔ شراب اندر چلی جاتے تو انسان میں ہر عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ دوستوں نے اس کو جُوئے کا چسکا ڈال دیا۔ انسان ہار جیت کے چکر میں آجاتے تو وہاں سے اس کا نکلنا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ آگے ہی جاتا ہے پیچھے نہیں آتا۔ پھر موہن کمار نے عورتوں کا شکار شروع کر دیا۔ اس نے سب سے پہلے ماں کے سونے کے زیورات پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ جُوئے میں گنوایا اور کچھ دو جوان عورتوں کو تحفے میں دے دیا۔ طوائف بازی بھی شروع ہو گئی۔ دوست اسے راجکمار کہتے تھے جس طرح ہم کسی کو شہزادہ کہتے ہیں۔

بڑوں نے اس کو روکا ٹوکا۔ اُس کے باپ کی شرافت کی بابت بھی بتایا کہ وہ بہت شریف آدمی تھا لیکن وہ غُنڈہ بدمعاش بن گیا تھا اس واسطے بڑوں نے اس کو اپنی عزت بچانے کے واسطے روکنا ٹوکنا بند کر دیا۔

جُوئے بازی، شراب خوری اور دوسری بدکاریوں میں بدمست ہو کر بھی اُس نے اپنی بہن کا بہت خیال کیا۔ اس کو گھر میں نوکرانی رکھ دی اور اُس کو بہت اچھے کپڑے سلا کر دیتا اور اس کے ساتھ پیار بہت کرتا تھا۔

دوستوں نے موہن کمار کو راجکمار بنا کر بہت عیش کی۔ وہ زمین کے ٹکڑے بیچنے لگا اور ساری زمین بک گئی۔ پیچھے نندی گڑھ میں دو دکانیں رہ گئی تھیں۔ ایک روز اس نے کسی کی جوان بیٹی کو کھیتوں میں زبردستی پکڑ لیا۔ لڑکی اس کا مقابلہ نہ کر سکی۔ موہن کمار جیت گیا لیکن لڑکی روتی چیختی اپنے گھر گئی۔ اُس کے گھر کے آدمی موہن کمار کو قتل کرنے کے واسطے نکل آئے۔ وہ ابھی گھر نہیں پہنچا تھا۔ اس کو ایک دوست نے کہیں ڈھونڈ کر بتایا کہ وہ گھر نہ جائے ورنہ لڑکی والے اُس کو جان سے مار ڈالیں گے۔

اُس کو اپنی جان سے زیادہ اپنی بہن کا غم تھا۔ اس کو ڈر تھا کہ وہ لوگ اس کی بہن سے بدلہ لیں گے جو بہت بُرا ہوگا۔ اس نے غور کیا کہ اس کی

مالی حالت کیسی ہے۔ اس کو یاد آگیا کہ وہ تو کنگال ہو چکا ہے۔ زمین فروخت ہو گئی تھی۔ زیورات عیش میں اُڑ گئے تھے۔ گاؤں والا مکان بھی اپنا نہیں رہ گیا تھا اس واسطے کہ اس کی رجسٹری ساہوکار کے پاس رکھوا کر اُس سے قرض لیا تھا اور ساہوکار نے اُس سے ایک کاغذ پر انگوٹھا لگوایا تھا۔ پیچھے دو دکانیں رہ گئی تھیں۔ اس میں اتنی عقل رہ گئی تھی کہ اس نے دکانیں بہن کے واسطے رکھ لی تھیں۔

شام کے بعد اندھیرا ہو گیا تو وہ اپنے ایک دوست کے گھر گیا اور اس کو کہا کہ وہ اس کی بہن کے سر پر ہاتھ رکھ لے۔ دوست نے صاف جواب دے دیا۔ دوسرے دوست کے پاس گیا تو اُس نے بھی اس کو ٹرخا دیا۔ دوستوں کو پتہ چل گیا تھا کہ یہ شخص خالی ہو چکا ہے اور اب مدد مانگتا ہے۔ موہن کمار کی آنکھیں کھل گئیں لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

گاؤں میں سب لوگ سو گئے تھے۔ وہ اپنے گھر جا رہا تھا۔ اس کو چوکیدار مل گیا۔ اس نے موہن کمار کو بتایا کہ لڑکی والے اس کو ڈھونڈتے رہے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ موہن کمار نہ ملا تو وہ تھانے میں رپورٹ کریں گے۔ موہن کمار جلدی سے اپنے گھر گیا۔ اس کی بہن کو اس کی کرتوت کا پتہ چل گیا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ موہن کمار کو اُس نے کہا کہ وہ کہیں بھاگ جائے نہیں تو لڑکی والے اس کو قتل کر دیں گے۔

بہن کا اس کو اتنا زیادہ خیال تھا کہ اُس کو اکیلا چھوڑ کر جانا اُس کو پسند نہیں تھا۔ اس نے گھر میں جو قیمتی چیز دیکھی اور بہن کے سارے کپڑے وغیرہ ایک ٹرنک میں ڈالے۔ ٹرنک سر پر اُٹھایا اور بہن کو ساتھ لیا۔ چوکیدار اُس کا یار تھا۔ اُس نے اس کی مدد کی۔ ٹرنک باری باری دونوں نے اُٹھایا اور نندی گڑھ پہنچا دیا۔

مالتی اُس کی بہن تھی

نندی گڑھ میں موہن کمار کا چچا تھا۔ میری ڈائری میں جو میں اپنے

واسطے لکھتا رہتا تھا، چچا کا نام ہرکشن لعل لکھا ہوا ہے۔ یہ شخص نندی گڑھ میں آڑھتی تھا۔ اس نے بھی تین چار دفعہ موہن کمار کو کہا تھا کہ وہ بدمعاشی اور عیاشی چھوڑ دے اور باپ دادا کی جائیداد نیلام نہ کرے لیکن موہن کمار نے اس کی بھی نہیں مانی تھی۔ اب موہن کمار اس حالت میں اپنے چچا کے پاس گیا کہ کنگال ہو چکا تھا۔ وہ جرم کر کے آیا تھا اور مفرور تھا۔ دوست یار کھا پی کر منہ پھیر گئے تھے۔ چچا کے گھر والے سوتے ہوئے تھے۔ موہن کمار نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس کے چچا کا بیٹا جگ دیو باہر آیا۔ جگ دیو اس سے ڈیڑھ ایک سال چھوٹا تھا۔ وہ موہن کمار اور اس کی بہن کو دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ دونوں کو اندر لے گیا۔ چچا جاگا تو موہن کمار اس کے پاؤں پر گر پڑا۔ روتے ہوئے اس نے کہا۔ "چچا! میں نے تمہاری نصیحت نہیں مانی تھی اس واسطے آج سزا لے کر تمہارے قدموں میں آیا ہوں۔ مجھ کو دھتکار نہ دینا۔ میں تمہارے بھائی کا بیٹا ہوں اور یہ معصوم لڑکی تمہارے بھائی کی بیٹی ہے۔ اس کی عزت کا معاملہ ہے۔"

اس نے چچا کو سارا واقعہ سنا دیا اور پھر کہا کہ چچا! میں پاپی ہوں۔ تمہارے گھر میں نہیں رہوں گا۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ میں کدھر جاؤں گا۔ میں اُس وقت واپس آؤں گا جب اِدھر کے لوگوں کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ چچا نے اپنی بھتیجی کو دیکھا تو اُس کا دل موم ہو گیا۔ اس لڑکی کا نام مالتی تھا۔ چچا نے لڑکی کو اپنے پاس رکھ لیا۔ موہن کمار کو اُس نے نہیں کہا کہ وہ بھی اُس کے گھر میں رہے۔ موہن کمار نے اپنی بہن کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بہن کو روتا ہوا چھوڑ کر چلا گیا۔

جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ ہندوستانیوں کی قسمت چمک پڑی۔ فوج میں بھرتی اتنی عام ہو گئی کہ چھوٹے موٹے جسمانی نقص والے کو بھی بھرتی کر لیتے تھے۔ مُلک میں کاروبار بھی کھل گیا۔ موہن کمار رات کو ہی نندی گڑھ سے نکل گیا اور اگلے روز بھرت پور کے ڈاک بنگلے میں جا کر فوج میں بھرتی ہو گیا۔ بھرتی کرنے والے ڈاک بنگلوں میں چند دنوں کے لیے آتے تھے اور بھیڑ بکریوں کی طرح دیہاتی جوانوں کو بھرتی کر کے لے

جاتے تھے۔ موہن کمار بھی سپاہی بن کر چلا گیا۔ راجپوت لڑاکا قوم تھی اس واسطے انگریز اس قوم کو بہت پسند کرتے تھے۔

موہن کمار کو ٹریننگ کے بعد اس پلٹن میں بھیجا گیا جو برما کے محاذ پر تھی۔ اس وقت فوجی اپنی تنخواہیں اپنے گھر کے کسی فرد کے نام لکھوا دیتے تھے۔ تنخواہ اس فرد کو ہر مہینے گھر مل جاتی تھی۔ محاذوں پر فوجی کو پیسوں کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ موہن کمار کی تنخواہ اس کی بہن کو ملتی تھی۔ اس کے خط آتے تھے لیکن وہ اپنا ایڈریس نہیں لکھتا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ وہ جو جرم کر کے بھاگا ہے اس پر پولیس اس کو پکڑنے کے واسطے آجائے گی۔ اس نے تین سال بعد اپنا ایڈریس لکھا۔ اس پر اس کو اپنی بہن مالتی کا خط ملا۔ اس نے بھائی کو لکھا کہ چچا کہتا ہے کہ دونوں دکانیں جو کرائے پر چڑھی ہوئی ہیں وہ بیچ دیتے ہیں اس واسطے کہ سب رقم کاروبار میں لگا دیں جو مالتی کے واسطے کارآمد ہوگا۔

مالتی نے اس کو یہ بھی لکھا کہ جس لڑکی پر اس نے جرم کیا تھا اس کے گھر والوں نے پولیس میں پرچہ نہیں کرایا اور وہ چپ ہو گئے تھے۔ مالتی نے ایک اور بات اس کو لکھی۔ اس کا موہن کمار کو کچھ شک ہو گیا۔ اس کے چچا کا ایک ہی بیٹا تھا، جگدیو۔ اس کو باپ نے شہزادوں کی طرح پالا تھا اور بیٹا خراب ہو گیا تھا۔ مالتی نے خط میں لکھا کہ جگدیو اس کے ساتھ پیار سے سلوک کرتا ہے اور اس کا بہت خیال رکھتا ہے۔ موہن کمار کو یہ بات پسند نہ آئی اس واسطے کہ اس نوجوان جگدیو کی بابت اس کو معلوم تھا کہ ٹھیک چال چلن کا نہیں ہے۔ اس نے پندرہ سولہ سال کی عمر میں ہی جوان لڑکیوں کے پیچھے پھرنا اور ان کو کھلانا پلانا شروع کر دیا تھا۔ موہن کمار مالتی کو ایسی بات لکھنے سے ڈرتا تھا کہ جگدیو سے بچ کر رہے اس واسطے کہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی۔ خط کسی سے پڑھواتی تھی۔

پھر اس کو چچا کا خط ملا جس میں اس نے لکھا کہ وہ اس کی دکانیں بیچ کر مالتی کے نام کا کاروبار کرنا چاہتا ہے اس واسطے موہن کمار اس کو

مختار نامہ لکھ کر بھیج دے کہ وہ موہن کمار کے نام پر دکانیں بیچ سکتا ہے۔ موہن کمار نے مختار نامہ زیر دستخط کمپنی کمانڈر بھیج دیا۔

مالتی ایک مسلمان کے ساتھ بھاگ گئی

جنگ میں فوجی مکھیوں کی طرح مرتے تھے اس واسطے ترقی جلدی ملتی تھی۔ موہن کمار کو بھی ترقی مل گئی۔ وہ جنگ کے آخری دنوں میں نائک ہو گیا۔ برما فرنٹ سے جاپان کی فوج بھاگ رہی تھی اس واسطے یہ فرنٹ خطرناک نہیں رہ گیا تھا لیکن ایک رات موہن کمار رات کی پٹرول پارٹی لے کر آگے گیا تو اس پر فائرنگ ہوئی۔ ایک گولی موہن کمار کے گھٹنے میں لگی۔ اس کو اٹھا کر پیچھے لے آئے۔ زخم بہت بڑا تھا۔ اس کو پیچھے کلکتہ کے ہسپتال میں بھیج دیا گیا۔ اس نے اپنے چچا کو اس ہسپتال کا پتہ لکھ دیا۔ اس کا زخم تو ٹھیک ہو گیا لیکن ٹانگ میں کھچاؤ پیدا ہو گیا اس واسطے وہ فوج میں نوکری کے قابل نہ رہا۔ ایسے فوجیوں کی بابت فیصلہ کرنے کے واسطے میڈیکل بورڈ بیٹھا کرتا ہے۔ موہن کمار کا بھی بورڈ ہوا اور اس کو فوج کے لیے اَن فِٹ قرار دے دیا گیا۔ انگریز زخمی فوجی پر بہت مہربانی کرتے تھے۔ بہت روپیہ پیسہ دیتے تھے۔ سروس زیادہ ہوتی تو میڈیکل پنشن دیتے تھے جو عام پنشن سے زیادہ ہوتی تھی۔

موہن کمار نے مجھ کو بتایا کہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ مالتی کا خط بڑے عرصے سے نہیں آیا۔ ہسپتال میں وہ چار مہینوں سے تھا۔ آخر اسے مالتی کا خط مل گیا۔ اس خط سے موہن کمار کا خون سخت گرم ہو گیا اس واسطے کہ اس کی بہن نے اس کو باتیں ہی ایسی لکھی تھیں۔ ایک یہ تھی کہ اس کے چچا نے اس کی دونوں دکانیں بیچ دی تھیں اور چار پانچ مہینوں بعد مالتی کو خبر سنائی تھی کہ اس نے دکانوں کی قیمت سے جو کاروبار شروع کیا تھا اس میں بہت نقصان ہو گیا ہے اور ساری رقم ڈوب گئی ہے۔

دوسری خبر چچا کے بیٹے جگدیو کی بابت تھی۔ وہ مالتی پر بُری نظر رکھتا تھا۔ اُس نے مالتی کو اپنی نیت صاف بتا دی۔ مالتی نے اُس کو کہا کہ وہ اُس کی چچازاد بہن ہے لیکن جگدیو بہت بُرا آدمی تھا۔ اُس نے کوئی شرم نہیں کی۔ مالتی نے لکھا کہ اس نے جگدیو کی ماں کو بتایا تو ماں اپنے بیٹے سے پوچھنے کی بجائے مالتی کو بُرا بھلا کہنے لگی کہ وہ اُس کے بیٹے کو بدنام کرتی ہے۔ جگدیو نے مالتی کو دھمکی دی کہ وہ اسے اپنے گھر سے نکال دے گا۔ چچا کو پتہ چلا تو اُس نے بھی مالتی کو ہی ڈانٹ ڈپٹ دیا۔

ایک مہینے بعد موہن کمار فوج سے فارغ ہو کر نندی گڑھ پہنچ گیا۔ اُس کو سب سے پہلی خبر یہ سُنائی گئی کہ پندرہ بیس دن گزرے مالتی اس کے چچا کے ایک مسلمان نوکر کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے۔ موہن کمار نے چچا سے پُوچھا کہ اُس نے نوکر کا پیچھا کیا ہے؟ اگر نہیں کیا تو پولیس کو رپورٹ دی ہے؟

چچا نے نوکر کا پیچھا نہیں کیا تھا اور اُس نے رپورٹ بھی نہیں دی تھی۔

"کیوں نہیں تھانے جا کر رپورٹ درج کرائی؟"

"تمہاری بہن خود اُس کے ساتھ گئی ہے"۔ چچا نے اس کو جواب دیا۔ "اگر وہ اغوا ہوئی ہوتی تو میں سارا تھانہ اس آدمی کے پیچھے لگا دیتا لیکن تمہاری بہن آوارہ ہو گئی تھی۔ اُس کا چال چلن بہت خراب ہو گیا تھا۔ اُس نے میرے بیٹے جگدیو کو بھی پھانسنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اُس کے ہاتھ نہ آیا اس واسطے تمہاری بہن نے اس کو بدنام کرنا شروع کر دیا کہ وہ اس کو چھیڑتا ہے۔ تمہاری بہن کو یہ بھی شرم نہ آئی کہ جگدیو اس کا بھائی ہے۔ میرا نوکر حیدر خان تھا۔ مجھ کو اس پر اتنا اعتبار تھا کہ وہ میرے گھر بھی آ جاتا تھا۔ خوبصورت اور دلیر جوان ہے اس واسطے مجھ کو کسی کا ڈر خطرہ نہیں ہوتا تھا۔ مجھ کو لوگوں نے بتایا کہ مالتی حیدر خان کے ساتھ ملتی ہے اور دونوں کو اکٹھے باہر بھی کہیں دیکھا گیا ہے۔ میں نے حیدر خان سے پوچھا

تو اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ مالتی اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتی اور کہتی ہے کہ مجھ سے الگ ہو گئے تو میں چچا کو کہوں گی کہ تم مجھے چھیڑتے ہو اور بُری باتیں کہتے ہو۔ میں نے مالتی کو ڈانٹا دبکارا اور حیدر خان کو بھی گالی گلوچ کی۔ دونوں دبک گئے لیکن تیسرے چوتھے روز دونوں غائب ہو گئے۔ میں اگر شور مچاتا یا تھانے جاتا تو اپنی بے عزتی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہے۔"

موہن کمار نے چچا سے پُوچھا کہ اُس نے اس کی دکانیں بیچ کر کس کاروبار میں پیسہ لگایا تھا۔ چچا نے اسے بتایا کہ کاروبار کیا شروع کیا تھا اور اور نقصان کس طرح ہوا ہے۔ موہن کمار نے ساری بات سُن کر کہا کہ چچا! کاروبار تو آپ نے کیا تھا، مالتی نے نہیں کیا، اس واسطے یہ نقصان آپ کا ہے میرا نہیں۔ مجھ کو رقم دیں۔ دراصل موہن کمار کو شک ہو گیا تھا کہ اس کے چچا نے کوئی کاروبار نہیں کیا اور وہ دکانوں کی قیمت وصول کر کے کھا گیا ہے۔

موہن کمار یہ بھی ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اس کی بہن کا چال چلن خراب ہو گیا تھا اور وہ مسلمان ملازم کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ میرے پاس تو ابھی کوئی ثبوت نہیں آیا تھا کہ مالتی نام کی لڑکی اچھے چال چلن کی تھی یا بُرے چال چلن کی، لیکن کوئی بھائی نہیں مانتا کہ اُس کی بہن کا چال چلن خراب ہے۔ یہی حال موہن کمار کا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اس کا حال زیادہ خراب ہو گیا۔

"پاپ میرے تھے اور سزا میری بہن کو ملی ہے"۔ اُس نے کہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگا۔ "اب میں پچھتاوے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے باپ دادا کی جائیداد شراب اور عورت میں ڈبو دی اور دوست کھا پی کر بیٹھ گئے۔ میں نے بہن کی عزت کی خاطر اسے چچا کے حوالے کیا تھا لیکن یہاں اس کی عزت نہ بچ سکی۔"

اغوا اور قتل

اس کا اتنا لمبا چوڑا بیان میرے واسطے عبرت ناک کہانی تھی۔ اس کی کہانی ختم ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی رپورٹ کیا ہے؟ کیا وہ اپنے چچا سے اپنی دکانوں کی قیمت لینا چاہتا ہے؟

"میرے چچا نے یا اس کے بیٹے جگدیو نے میری بہن کو غائب کر دیا ہے" — اس نے کہا — "مجھے شک ہے کہ جگدیو نے میری بہن کو قتل کرا دیا ہے۔"

"قتل کی وجہ؟" — میں نے پوچھا — "قتل کس واسطے کیا؟"

"دو وجہیں ہیں" — اس نے کہا — "جگدیو میری بہن کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ میری بہن نے اس کو قبول نہیں کیا۔ مجھے سولہ آنے یقین ہے کہ میری بہن نے اسے گالی گلوچ کی ہوگی۔ اس واسطے جگدیو نے اس کو اِدھر اُدھر کر دیا ہے۔ یہ آپ کو معلوم کرنا پڑے گا کہ میری بہن زندہ ہے یا قتل ہو گئی ہے۔"

"تم کوئی ثبوت دے سکتے ہو کہ جگدیو مالتی کے پیچھے پڑا رہا ہے اور اُس نے مالتی کو غائب کیا ہے؟" — میں نے پوچھا اور اس کو بتایا — "موہن کمار! تم کو معلوم ہوگا کہ جس شخص کو سب لوگ قاتل مانتے ہیں وہ عدالت سے بری ہو جاتا ہے اس واسطے کہ اُس کے خلاف ثبوت کچا ہوتا ہے۔"

اس نے جواب دیا کہ وہ تین دنوں سے لوگوں کی باتیں سُن رہا ہے۔ اس کو پکا ثبوت ملا ہے کہ جگدیو بدکار جوان ہے اور باپ کا روپیہ عیاشی میں برباد کر رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے چچا کا مسلمان ملازم حیدر خان بہت دنوں سے نظر نہیں آ رہا لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ مالتی اُس کے ساتھ چلی گئی ہے؟ موہن کمار نے کہا کہ اس کو یہ شک ہے کہ حیدر خان کسی اور وجہ سے چلا گیا ہے اور اس کے چچا ہرکشن لعل نے کہہ دیا ہے کہ مالتی

اُس کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

"میری دوسری رپورٹ یہ ہے کہ چچا نے مجھے کاروبار اور منافع کا دھوکہ دے کر میری دکانیں بیچ ڈالی ہیں" — موہن کمار نے کہا — "اور ساری رقم ہضم کر لی ہے۔ میں معلوم کر چکا ہوں کہ اس نے کوئی اور کاروبار نہیں کیا تھا" — بولتے بولتے اسے کچھ یاد آ گیا۔ چُپ ہو کر سوچتا رہا پھر کہنے لگا — "میری بہن نے اس کو بار بار کہا ہوگا کہ ہماری دکانوں کی رقم دے دے اس واسطے میرے چچا نے یہ کام کیا کہ میری بہن کو قتل کرا دیا۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہاری بہن کو تمہارے چچا نے غائب کرایا ہے یا اس کے بیٹے جگدیو نے" — میں نے کہا — "لیکن موہن کمار! اغوا اور قتل اور دھوکہ دہی معمولی جُرم نہیں ہوتے کہ تم نے شک کیا اور تھانیدار اُن کو گرفتار کر لے گا۔ میں تم کو بتاتا ہوں کہ ان دونوں کے خلاف پرچہ کرانے کے لئے گواہ لے آؤ۔ میں بھی شہادت اور ثبوت معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"آپ پولیس انسپکٹر ہیں" — اس نے کہا — "لیکن آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ میرے مقابلے میں پولیس انسپکٹر کی کوئی پوزیشن نہیں۔ میں فوجی ہوں۔ اگر آپ میری رپورٹ پر کارروائی نہیں کریں گے تو میں اپنی رجمنٹ کو رپورٹ لکھوں گا لیکن یہ آپ کے لئے ٹھیک نہیں ہوگا۔"

وہ اس واسطے وردی پہن کر آیا تھا کہ میں اس کے رُعب کے نیچے آ جاؤں۔ اس نے مجھ پر ٹھیک رُعب ڈالا تھا۔ جنگِ عظیم میں انگریزوں نے ہندوستانی فوجیوں کا درجہ بہت اُونچا کر دیا تھا۔ تھانیداروں اور تحصیلداروں کو حکم ملا تھا کہ وہ اپنے اپنے علاقے کے فوجیوں کا بہت خیال رکھیں اور ان کو کوئی تکلیف ہو تو تکلیف رفع کریں۔ موہن کمار نے مجھ پر اپنی وردی کا رُعب ڈالا تو مجھے غصہ آ گیا اس واسطے میں نے اس کو تھوڑی سی باتیں اُس کی فوجی پوزیشن کی بابت کہیں اور یہ بھی کہا کہ جوان! میں مان لیتا ہوں کہ تمہاری پوزیشن مجھ سے اُونچی ہے لیکن جس طرح تم فوج میں کوئی غلط کام نہیں کر سکتے اسی طرح میں بھی کسی کے خلاف کسی کے صرف کہنے پر کارروائی

نہیں کر سکتا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ تم بھی ثبوت اور شہادت لے آؤ اور میں بھی کوشش کروں گا۔ اگر مجرم کو مجرم ثابت کرنے کے واسطے شہادت کافی ہوگئی تو میں ہر کرشن لعل اور جگدیو کو گرفتار کر لوں گا۔

"یہی تو مجھ کو خطرہ ہے" ۔۔۔ اس نے کہا ۔۔۔ "میرا چچا کانگرس پارٹی کا لیڈر ہے اور اس کے پاس پیسہ ہے اور اس کا ہر جگہ رعب چلتا ہے اس واسطے آپ اس کے خلاف معاملہ گول کر دیں گے"۔

میں نے اس کو سمجھایا کہ میں قانون کے معاملے میں امیر غریب کو نہیں دیکھوں گا۔ اس نے مجھ کو اپنے چچا کی بابت جو بتایا تھا وہ سارا درست تھا۔ میں لالہ ہر کرشن لعل کو جانتا تھا۔ وہ کانگرس پارٹی کا لیڈر اور عہدیدار تھا اور وہ رعب اور رسوخ والا آدمی تھا۔ میں نے اس کی بابت ایسا بالکل نہیں سوچا کہ اس کو بڑا آدمی سمجھ کر موہن کمار کی شکایت کی پروا نہیں کروں گا۔ میں نے یہ سوچا کہ موہن کمار اپنے چچا پر بڑے سنگین الزام لگا رہا ہے اور اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس کو اپنے چچا پر صرف یہ غصہ تھا کہ اس نے اس کی دکانیں بیچ کر سارا پیسہ ہضم کر لیا تھا۔

میں نے موہن کمار کو کہا کہ وہ اگلے روز یا جس روز بھی اس کو پکا ثبوت مل جائے میرے پاس آجائے اور پھر دیکھے میں کیا کرتا ہوں ۔۔۔ وہ چلا تو گیا لیکن وہ غصے میں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ رہتا کہاں ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ چچا کے گھر نہیں رہتا۔ مندر کے ساتھ آشرم سا بنا ہوا تھا۔ وہ عارضی طور پر وہاں رہتا تھا۔ مندر کے پنڈت نے اسے رہنے کی اجازت دے دی تھی۔

لڑکی آوارہ ہو گئی

میں نے ہر کرشن لعل کو تھانے بلایا۔ وہ جلدی آگیا۔ میں نے سوچا تھا کہ آخر بڑے درجے کا آدمی ہے، اس کی عزت بچ جائے گی بشرطیکہ مجھے صحیح بات بتا دے کہ کیا ہے۔

"لالہ جی!" ۔۔۔ میں نے اس کو کہا ۔۔۔ "آپ سب کچھ سمجھنے والے ہیں۔ میں نے یہ کام قانون کے خلاف کیا ہے کہ آپ کو ادھر بلایا ہے۔ میں نے آپ کی عزت کے واسطے یہ غلط کام کیا ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ اپنی عزت کو بچائیں یا اپنی عزت کا کوئی خیال نہ کریں"۔

وہ گھبرانے لگا۔ اس نے کہا کہ میں اسے صاف بات بتاؤں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔

"میں آپ کی بھتیجی مالتی کو دیکھنا چاہتا ہوں" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "اگر آپ یہ لڑکی اس کے بھائی موہن کمار کے حوالے کر دیں تو میں کوئی کارروائی نہیں کروں گا ..... اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے موہن کمار کی دکانیں بیچی تھیں۔ اس کی رقم کا حساب کتاب اسے بتا دیں"۔

"میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں" ۔۔۔ اس نے کہا ۔۔۔ "وہ میرے خلاف رپورٹ کر گیا ہے"۔

"لیکن میں نے ابھی کاغذی کارروائی نہیں کی" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "آپ عزت اور حیثیت والے آدمی ہیں اس واسطے پولیس کے چالان کیس سے بچیں۔ اس چکر میں نہ پڑیں"۔

"اگر آپ مجھ کو اجازت دیں تو میں پوری رام کہانی سنا دوں؟"

"میں رام کہانی سننے کے لئے تیار ہوں" ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ "لیکن یہ سوچ لیں کہ آپ منہ سے جو بات نکالیں گے اس کا آپ کو ثبوت دینا پڑے گا۔ میں نے موہن کمار پر اعتبار نہیں کیا، میں آپ کی زبانی رام کہانی پر بھی اعتبار نہیں کروں گا"۔

"آپ میری بات سن لیں" ۔۔۔ اس نے کہا ۔۔۔ "موہن کمار میرے بھائی کا بیٹا ہے۔ میرا بھائی اچھے پائے کا زمیندار تھا اور شریف آدمی تھا۔ وہ مر گیا تو موہن کمار عیاش ہو گیا۔ آپ اس کے گاؤں سے اس کی رپورٹ لے سکتے ہیں۔ اس کی ماں اس غم سے مر گئی کہ ایک ہی بیٹا تھا، وہ بھی آوارہ اور

بدمعاش ہوگیا۔ موہن کمار نے تمام زمین بیچ کھائی اور باپ کی اتنی بڑی حویلی گروی رکھ کر گنوا دی۔ شراب یہ پیتا تھا، رنڈی بازی یہ کرتا تھا، بدمعاشی یہ کرتا تھا، سارے غنڈے بدمعاش اس کے یار بنے ہوتے تھے۔ جُوا اس کے اپنے گھر میں چلتا تھا۔ میں نے سَو بار کہا کہ اپنے باپ کا نام اور اُس کی جائیداد برباد نہ کرو لیکن اُس نے مجھ کو غصّے میں جواب دیا کہ تم کون ہو مجھ کو روکنے والے ....

"مجھ کو فکر تو اس کی بہن کا لگا ہُوا تھا۔ جیسا بھائی نکلا ویسی بہن نکلتی۔ میں نے موہن کمار کو کہا کہ تمہاری بہن ابھی کمسن ہے تم گھر میں بدمعاشوں کو اکٹھا کئے رکھتے ہو اور شراب پیتے ہو۔ تمہاری بہن بھی ایسا ہی کرے گی۔ موہن کمار نے پھر مجھ پر غصّہ جھاڑا۔ مجھ کو کسی نے بتایا کہ مالتی جو موہن کمار کی بہن ہے وہ ٹھیک نہیں رہی۔ بھائی کی طرح بدمعاشی کی باتیں کرتی ہے اور اُس نے اپنی اسی عمر میں یارانے لگانے شروع کر دیئے ہیں۔"

"لالہ جی مہاراج!" — میں نے اُس کو ٹوک کر کہا — "آپ کو وہ آدمی تھانے میں یہ بیان دینے کے واسطے پیش کرنے پڑیں گے کہ مالتی بدمعاشی کرتی تھی اور ان کو یہ بیان بھی دینا پڑے گا کہ اس کا فلاں فلاں آدمی کے ساتھ یارانہ تھا۔"

"سارا گاؤں کہتا ہے جی!"

"صرف کہنے پر میں اعتبار نہیں کر سکتا" — میں نے کہا — "اگر کہنے پر ہم لوگ کارروائی کرنے لگیں تو موہن کمار بہت ساری باتیں کہہ گیا ہے۔ مجھ کو چاہیئے کہ آپ کو اور آپ کے بیٹے کو گرفتار کر لوں۔ آپ تھانے میں باتیں کر رہے ہیں۔ یہ آڑھتیوں کی منڈی نہیں ہے۔ یہاں صرف وہ بات کریں جس کو دو تین گواہ سچی ثابت کر سکیں۔"

"میں ثابت کروں گا جناب!" — اُس نے کہا — "پھر ایک رات موہن کمار اپنی بہن کے ساتھ میرے گھر آ گیا۔ اُس نے مجھ کو بتا دیا کہ وہ کیا کرتوت کر کے آیا ہے۔ اُس نے جناب! ایک عزّت والے گھر کی لڑکی کو زبردستی خراب کیا۔ وہ لوگ اس کو قتل کرنے پر آ گئے۔ یہ اپنی بہن کو لے

کر میرے گھر میں آ گیا اور اسے میرے گھر میں چھوڑ کر کہیں لاپتہ ہو گیا۔ مجھ کو کیا معلوم کہاں چلا گیا ہے۔ اس کی تنخواہ اس کی بہن کے نام پر آنے لگی تو پتہ چلا کہ فوج میں بھرتی ہو گیا ہے۔ مجھ کو اس کا بہت افسوس ہُوا کہ یہ لڑکا شریف انسانوں کی طرح رہتا تو سارے گاؤں پر اس کی حکومت ہوتی لیکن یہ معمولی سا سپاہی بن کر جنگ پر چلا گیا۔ یہ جنگ ہماری تو نہیں تھی۔ یہ انگریزوں اور جاپانیوں کی جنگ تھی۔ ہم تو ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔"

"ہندوستان اور انگریزوں کو گولی مارو لالہ جی!" — میں نے کہا — "موہن کمار اور مالتی کی اور اپنے بیٹے کی بات کرو۔"

"مالتی نے میرے گھر میں بھی اپنے لچھن دکھانے شروع کر دیئے" — اُس نے کہا — "وہ کھلی پھرتی تھی۔ مندر میں کبھی نہیں گئی۔ لڑکی خوبصورت تھی اس واسطے کئی جوان اس کو اشارے کرنے پر آ گئے۔ اشارے تو یہ خود کرتی تھی۔ میرا ایک مُسلمان نوکر تھا۔ وہ چھوٹا سا تھا تو میرے پاس آیا تھا۔ میرے پاس ہی جوان ہُوا۔ مجھ کو اس پر بہت اعتبار تھا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ مالتی نے اُس کے ساتھ یاری لگا لی اور اُس کے ساتھ نکل گئی۔"

"آپ نے موہن کمار کی دکانیں بیچی تھیں" — میں نے پُوچھا — "آپ نے رقم کس کاروبار میں لگائی تھی؟"

اُس نے مجھ کو سمجھایا کہ کاروبار کیا تھا اور یہ کس طرح ٹھپ ہو گیا۔ ساتھ ہی اُس نے کہا — "میں تو دکانیں بیچنے کے حق میں نہیں تھا۔ موہن کمار نے خط لکھا تھا کہ دکانیں بیچ کر پیسہ کسی کاروبار میں لگا دو۔ میں نے اس کو خط میں سمجھا دیا تھا کہ کاروبار کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس نے خط لکھا کہ آپ میری ذمّہ داری پر پیسہ لگا دیں۔ اگر نقصان ہو گیا تو یہ میرا ہو گا۔ اس نے مختار نامہ بھی بھیجا تھا۔"

"آپ کے پاس اُس کا وہ خط پڑا ہُوا ہو گا جس میں اُس نے لکھا تھا کہ نقصان کا ذمّہ دار وہ خود ہو گا" — میں نے کہا — "اگر وہ خط موجود ہو تو اُس

کی یہ شکایت خود بخود ختم ہو جاتی ہے کہ آپ نے اس کی دکانیں دھوکے سے بیچی ہیں۔"

"خط کون سنبھال کر رکھتا ہے جی!" اُس نے کہا — "بات دراصل یہ ہے جی، کہ یہ شخص مجھ سے رقم بٹورنے کی کوشش کر رہا ہے۔ فوج سے اس کو چھٹی مل گئی ہے۔ مجھ کو آکر اس نے کہا دس ہزار روپیہ دے دو، دکان کھولوں گا۔ میں نے انکار کیا اس واسطے کہ یہ رقم جوئے میں ہار دے گا یا ہفتہ دس دن عیش کر کے رقم اڑا دے گا۔ اس نے میرا انکار سُنا تو مجھ کو دھمکی دی کہ میں فوجی ہوں اس واسطے تم کو گرفتار کرا دوں گا کہ اس شخص نے میری بہن کو لاپتہ کیا ہے اور دھوکے سے میری دکانیں بیچ کر رقم کھا گیا ہے۔"

میں نے بیوقوفی کی

یہ تو مجھ کو معلوم تھا کہ یہ شخص الزام کے جواب میں الزام لگاتے گا اور یہ بات آپ کے دماغ میں بھی آسکتی ہے کہ کسی پر سچا الزام لگا دو تو وہ کہتا ہے کہ الزام جھوٹا ہے۔ میری کوشش اس پر بھی کہ ان لوگوں کا تصفیہ بغیر مقدمہ ہو جاتے اس واسطے کہ ان کی عزت اور دولت اسی میں تھی اور میں ایک کیس سے بچ جاتا۔ میں نے ہرکشن لعل کو ایک بار پھر کہا کہ وہ موہن کمار کو بدمعاش کہتا ہے تو مجھ کو سچی باتیں بتا دے لیکن اس شخص نے مجھ کو اپنی لیڈری کی باتیں سنانی شروع کر دیں۔ مجھ کو یہ تماشہ بڑا دلچسپ اور عجیب لگا کہ ایک آیا اور مجھ پر رُعب کس گیا کہ میں فوجی ہوں اس واسطے میں جو کہتا ہوں اس پر کارروائی کرو۔ دوسرا آیا تو وہ مجھ پر کانگرس کی لیڈری کا رُعب ڈالنے لگا کہ میں جو کہتا ہوں وہی سچ ہے۔ میری تھانیداری تو ایک پیسے کی نہ رہی۔

"لالہ ہرکشن جی!" میں نے اس کو کہا — "میں نے آپ کے ساتھ

جو مہربانی کی ہے اس کو سمجھ جائیں اور اس کی تھوڑی سی قدر کریں اس واسطے کہ آپ کو عدالتوں اور کچہریوں کے چکروں سے بچا رہا ہوں۔ آپ پر ایک مہربانی اور کرتا ہوں کہ آپ کو پہلے بتا رہا ہوں کہ ان سوالوں کے جواب لا دیں اور گواہ بھی تیار رکھیں۔ ایک یہ کہ آپ کی بھتیجی لاپتہ ہو گئی تو آپ نے پولیس کو رپورٹ کیوں نہیں دی؟ خود لڑکی کا پیچھا کیوں نہیں کیا؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ نے خود موہن کمار سے کہا تھا کہ آپ اس کی دکانیں بیچ کر کاروبار میں پیسہ لگائیں گے یا موہن کمار نے کہا تھا کہ آپ اُس کی دکانیں بیچ کر کاروبار میں پیسہ لگائیں اور نقصان کا ذمہ دار وہ ہوگا۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ آپ نے کیا کاروبار کیا تھا اور نقصان کس طرح ہُوا اور چوتھا سوال یہ ہے کہ مالتی بدکار ہوگئی تھی۔ گواہ تیار رکھنا۔ آپ چلے جائیں اور کوشش کریں کہ موہن کمار کے ساتھ آپ کا تصفیہ تھانے اور کچہری کے احاطے سے باہر باہر ہی ہو جاتے۔"

وہ چلا گیا تو میں نے دو پرانے ہیڈ کانسٹیبلوں کو بلایا۔ مجھ کو اس تھانے میں آتے ہوئے ابھی ایک سال ہُوا تھا اور اے۔ ایس۔ آئی ڈیڑھ سال پہلے آیا تھا۔ مجھ کو پرانے ہیڈ کانسٹیبل پرانی خبریں دے سکتے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبلوں کے ساتھ بات ہوئی تو ان سے پہلے پرانے کانسٹیبل بول پڑے۔ انہوں نے بتایا کہ ہرکشن لعل کا بیٹا جگدیو بدمعاش نوجوان ہے۔ باپ کی طرف سے کوئی روک رکاوٹ نہیں۔ آوارہ شہزادہ ہے اور جوان لڑکیوں کا شکاری ہے۔ پیسہ خرچ کرتا ہے اور باپ اس کو روپیہ پیسہ دیتا رہتا ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ اس نے دو تین پیشہ ور غنڈے اپنے ساتھ لگا رکھے ہیں۔

میں ان لوگوں کی باتیں سُن رہا تھا۔ بہت سارا وقت گزر گیا تھا۔ پہلے موہن کمار نے اپنی رام کہانی سُنانے میں دو گھنٹے لے لئے تھے پھر اس کا چچا آگیا۔ میں نے ان کی باتیں بہت مختصر سنائی ہیں۔ میں نے جرح بھی کی تھی۔ اس کا چچا اڑھائی گھنٹے لے گیا۔ میں نے دوپہر کا کھانا تھانے میں ہی کھایا تھا۔ اب دن کا پچھلا پہر تھا۔ موہن کمار غصے میں آیا۔

"دیکھو تھانیدار صاحب!" — اس نے رُعب سے کہا — "مجھ کو پتہ چل گیا ہے کہ آپ نے میرے چچا کو بلایا تھا۔ آپ نے اس کو اس واسطے بلایا تھا کہ اس کی عزّت خراب نہ ہو اور میری عزّت بے شک خراب ہوتی رہے اس واسطے کہ وہ دولت والا لیڈر ہے اور میں غریب آدمی ہوں۔"

میں نے اس کو اپنے دفتر میں لے جا کر بٹھایا اور سمجھایا بجھایا کہ میری آنکھ میں غریب اور امیر ایک برابر ہیں اور میں نے اُس کو اس واسطے بلایا تھا کہ تمہارے حق میں کچھ شہادت اکٹھی ہو جاتے۔

"میں فوجی ہوں جناب!" — اُس نے بیوقوفوں کی طرح کہا — "آپ مجھ کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ وہ آپ کی مٹھی گرم کر گیا ہے۔ اگر آپ ایماندار ہوتے تو فوراً میری رپورٹ لکھ لیتے اور اُس کو گرفتار کر لیتے۔"

غصّہ تو مجھ کو بھی چڑھ گیا لیکن میں نے غصّہ پی لیا۔ مجھ کو ابھی کیا پتہ تھا کہ سچا کون اور جھوٹا کون ہے۔ میں نہ کسی کی حمایت کر سکتا تھا نہ مخالفت۔ میں نے اس کو آرام سے سمجھایا کہ میں نے اپنی مٹھی گرم نہیں کی اور وہ ذرا آرام سے بات کرے۔ میں نے اس کو یہ بھی کہا کہ وہ تھوڑی سی شہادت لے آتے اس واسطے کہ میں کیس درج کر سکوں باقی عمارت میں خود کھڑی کر لوں گا، لیکن میری میٹھی زبان نے اس کو غلط فہمی میں ڈال دیا کہ میں اس سے ڈر رہا ہوں اور میں اس واسطے ڈر رہا ہوں کہ میں نے ہرکشن لعل سے رشوت لی ہے۔

"آپ کی مرضی ہے میرا کیس درج نہ کریں" — اس نے کہا — "میں آپ کو دکھاؤں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم جیسے مُسلمانوں کو میں اپنی جُوتی کے نیچے رکھنا جانتا ہوں۔ ہرکشن لعل کی لیڈری کا بھی تماشہ دیکھ لینا۔"

اب میرا غصّہ میرے قابو سے نکل گیا۔ میں نے اس کو کیا کیا کہہ دیا وہ میں آپ کو سُنا نہیں سکتا۔ مجھ کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا، لیکن مُسلمانوں کی بابت یہ کون مُسلمان برداشت کر سکتا ہے کہ ایک ہندو ان کو جُوتی کے نیچے رکھنے کی بات کرے۔ میں نے بہت بے وقوفی کی کہ اس کو یہ بھی کہہ دیا کہ ایک ایسی لڑکی کی بابت جس کے کئی یار تھے اور ایک کے ساتھ بھاگ

گئی ہے، رپورٹ درج کرنے سے پہلے میں دس بار سوچوں گا۔ اُس کا یارانہ جگدیو کے ساتھ بھی تھا۔

"جگدیو.... جگدیو" — اس نے سخت غصّے میں کہا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ جاتے جاتے کہہ گیا — "مجھ کو معلوم ہے کہ ایک غریب آدمی کی رپورٹ نہیں سنو گے۔"

میں ہر طرح کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرا ارادہ اس کے ساتھ بے انصافی کرنے کا نہیں تھا۔ اس نے مجھ پر غصّہ جھاڑا اور اس نے بکواس بھی کی تھی پھر بھی میں نے دل میں اس طرح نہیں کہا تھا کہ اس کی رپورٹ اور شکایت دبا کر اس سے بدلہ لوں گا۔

جوان بیٹا قتل ہو گیا

دوسری صبح بڑی خوفناک رپورٹ آئی۔ لالہ ہرکشن لعل اس حالت میں تھانے آیا کہ دھاڑیں مار رہا تھا۔ اس کے ساتھ تین چار آدمی تھے۔ اس کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ وہ دھاڑیں مارتا تھا — "ہائے میرا راجکمار۔ ہائے میرا شہزادہ"۔ دوسرے آدمیوں نے بتایا کہ اس کے بیٹے جگدیو کی لاش کھیتوں میں پڑی ہے۔

"اُس ملیچھ نے میرے بیٹے کو قتل کر دیا ہے" — ہرکشن لعل نے روتے ہوئے کہا۔

"کس ملیچھ نے؟" — میں نے پوچھا۔

"موہن کمار نے" — اُس نے کہا — "اور کون کر سکتا ہے۔ ہائے اوئے میں مر گیا۔ بہن نے اس کو خراب کیا اور بھائی نے آ کر اُس کو قتل کر دیا۔"

موہن کمار کے سوا اور کوئی قاتل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ مجھ کو دھمکی دے کر گیا تھا اور اُس نے مجھ کو غصّے سے کہا تھا کہ تم ایک غریب آدمی کی رپورٹ نہیں سنو گے۔ اُس نے قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور جگدیو سے اپنی

بہن کی بے آبروئی کا بدلہ لیا تھا۔ جگدیو کا باپ بھی اسی کو قاتل کہہ رہا تھا۔
میں نے یہ سُننے سے پہلے کہ جگدیو کہاں اور کس طرح قتل ہُوا ہے صرف یہ سُن کر کہ وہ قتل ہو گیا ہے اپنے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ موہن کمار مندر میں رہتا ہے اُسے پکڑ لائے۔ مجھ کو خطرہ یہ دکھائی دے رہا تھا کہ وہ بھاگ کر کہیں دُور نکل گیا ہوگا۔ نندی گڑھ میں اس کا کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔

اے۔ ایس۔ آئی کو روانہ کر کے میں نے ہر کشن لعل اور اس کے ساتھ آنے والے آدمیوں سے پوچھا کہ جگدیو کس طرح قتل ہُوا ہے۔ مجھ کو بتایا گیا کہ جگدیو رات کو کھانا کھا کر گھر سے نکلا تھا۔ وہ بہت دیر تک واپس نہ آیا تو اُس کے باپ نے اُس کی تلاش شروع کر دی۔ اُس کے جتنے دوست تھے، اُن سب کے گھر گیا۔ سب سوئے ہوئے ملے۔ جگدیو کا کوئی سراغ نہ ملا۔ آدھی رات گزر گئی تو فکر بڑھ گیا۔ ہر کشن لعل کو اس کی بیوی نے کہا کہ اس نے بیٹے کو بہت خراب کر دیا ہے۔ اب وہ ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اس کی شادی ہو جانی چاہیے۔ ہر کشن لعل نے اپنی بیوی کو کہا کہ وہ کل ہی اس کی شادی کا بندوبست کر دے گا۔

صبح سویرے ایک آدمی نے آکر بتایا کہ کھیتوں میں جگدیو کی لاش پڑی ہے۔ ہر کشن لعل اور اُس کی بیوی اور جس کسی نے سُنا وہ سب دوڑتے گئے۔ لاش ابھی تک کھیتوں میں پڑی تھی۔

میں موقعۂ واردات پر گیا۔ لاش کا چہرہ دیکھ کر مجھ کو یاد آیا کہ میں نے یہ چہرہ پہلے دیکھا ہُوا ہے۔ نندی گڑھ چھوٹی سی جگہ تھی۔ اس کی شکل وصورت قصبے جیسی ہو گئی تھی۔ آبادی تھوڑی تھی۔ آبادی کے ساتھ سے کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ جنگل اور کھڈ بھی تھے۔ جگدیو بیس سال کے لگ بھگ عمر کا خوبصورت جوان تھا۔ لاش کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور مُنہ بھی کھلا ہُوا تھا۔ لاش اکڑ گئی تھی، اس واسطے مجھ کو خیال آیا کہ اس کو مرے ہوئے بہت وقت گزر گیا ہے۔ شام کے بعد مرا ہوگا۔
لاش کے نیچے گز ایک لمبی ادوائین کی رسّی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے لاش کی گردن دیکھی۔ گردن پر رسّی کے یا گلا گھونٹنے کے نشان صاف تھے۔

اس کو رسّی سے پھانسی دی گئی تھی۔
تماشہ دیکھنے والے لوگ اور جگدیو کے گھر والے مجھ سے پہلے لاش دیکھنے پہنچ گئے اس واسطے وہاں قاتل کا کھُرا تلاش کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ کھوجی میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے لاش کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ جسم پر اور کوئی ضرب، زخم یا مارپیٹ کا نشان نہیں تھا۔
میں نے وہاں جو کاغذات تیار کرنے تھے وہ کیے۔ گواہ بنائے اور لاش پوسٹمارٹم کے لئے بھجوا دی۔

وہ عبادت کرتا اور روتا تھا

میں جب تھانے میں گیا تو میں دیکھ کر حیران ہو گیا کہ موہن کمار وہاں موجود تھا۔ اُس کو اے۔ ایس۔ آئی نے ہتھکڑی نہیں لگائی تھی اور اس کو یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ اُس کو تھانے کیوں لایا گیا ہے۔
"دیکھ لیا آپ نے؟" — اُس نے مجھ کو دیکھتے ہی کہا — "ایک کو تو بھگوان نے پکڑ لیا ہے۔ سُنا ہے اُس کی لاش باہر کہیں پڑی ہے۔"
میں مُسکرایا اور اُس کو اپنے دفتر میں لے گیا۔ اس کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔
"تم اُس کی لاش دیکھنے کے واسطے نہیں گئے؟" — میں نے پوچھا۔
اُس نے نفرت سے کہا — "میں سویرے سویرے اُس کا مرا ہُوا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھ کو اُس کے مرنے کا کوئی افسوس نہیں۔"
"مجھ کو بھی ایسے بدکار آدمی کے مرنے کی خوشی ہے" — میں نے کہا اور میں نے اس کے قریب ہو کر بہت آہستہ سے کہا — "لیکن مجھ کو تمہارا افسوس ہو رہا ہے۔ تم خود ہی بتا دو کہ میں تم کو کس طرح بچاؤں؟"
"مجھے؟" — اُس نے حیران ہو کر پوچھا — "آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"
"میری بات غور سے سنو موہن کمار!" — میں نے اُس کو اس طرح کہا

جس طرح ایک ہمدرد دوست بولا کرتا ہے۔ میں نے کہا — "لوگ ٹھیک کہا کرتے ہیں کہ فوجی بیوقوف ہوتے ہیں۔ تم نے بیوقوفی کی ہے اور اس کی سزا بڑی ہی خوفناک ہے۔"

"میں نے کیا بیوقوفی کی ہے؟"

"تم اتنے چالاک نہیں ہو موہن کمار!" — میں نے کہا — "تم ایک پولیس انسپکٹر کو چکمہ نہیں دے سکتے اس واسطے کہ پولیس کو چکمہ دینے کے واسطے بہت زیادہ عقل کی ضرورت ہوتی ہے" — وہ بولنے لگا تھا۔ میں نے اس کو نہیں بولنے دیا اور اس کو کہا — "میں نے تم کو کہا تھا کہ اپنے چچا اور اس کے بیٹے کے خلاف گواہیاں لے آؤ۔ کمی بیشی میں خود پوری کر لوں گا مگر تم نے چچا کے بیٹے کو قتل کر دیا۔"

وہ اچھل پڑا اور اس نے میرے ہاتھ پکڑ لئے۔ اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ صرف ہکلا رہا تھا۔ کچھ کہنے لگتا تھا تو اس کی زبان کانپ جاتی تھی۔

"مت گھبراؤ موہن کمار!" — میں نے کہا — "مجھ کو بتا دو کہ تم نے اس کو کس طرح قتل کیا ہے۔ اگر تم نے اپنی زبان سے نہ بتایا تو میں عدالت میں ثابت کر دوں گا، پھر تم پھانسی یا عمر قید سے نہیں بچ سکو گے۔ اگر مجھ کو بتا دو گے تو میں ثابت کر دوں گا کہ تم نے فوری اشتعال پر قتل کیا ہے۔ اس طرح تم کو تین چار سال سزا ملے گی۔ ہو سکتا ہے کہ تم بری ہی ہو جاؤ۔"

اس نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ میں نے اس کے چچا سے رشوت لی ہے اور اس پر قتل کا جھوٹا الزام لگا رہا ہوں۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے اس کو آرام سے سمجھانے اور ٹھنڈا کرنے کی بہت کوشش کی۔ اس کو نرمی سے کہا کہ وہ اقبال جرم کر لے لیکن وہ اتنا پکا نکلا کہ اقبال جرم کے نام پر اور زیادہ بکواس کرنے لگتا تھا۔ میں نے اس کو حوالات میں بند کر دیا۔ اب مجھے خود اس کے خلاف شہادت اکٹھی کرنی تھی۔

وہ مندر میں رہتا تھا۔ میں نے مندر کے پنڈت کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ گزشتہ رات موہن کمار کس وقت باہر نکلا اور کس وقت واپس آیا تھا۔

پنڈت نے کہا کہ اس کو معلوم نہیں اور دو آدمی جو اس کے ساتھ رہتے ہیں وہ بتا سکتے ہیں۔ میں نے ان دونوں کو بلا لیا۔ انہوں نے موہن کمار کی بابت بتایا کہ وہ زیادہ وقت عبادت میں گزارتا ہے اور اکثر روتا رہتا ہے۔ کہتا ہے کہ بھگوان اس کے گناہوں کی سزا اس کی بہن کو دے رہا ہے۔

"وہ شام کو باہر جایا کرتا ہے؟ ہر روز کیا کرتا ہے؟"

"وہ شام پڑتے ہی کمرے میں آ جاتا ہے" — ایک آدمی نے بتایا — "کل شام کے بعد وہ بہت پریشان تھا۔ وہ یہ کہہ کر باہر چلا گیا کہ ذرا گھوم پھر کر طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

"کتنی دیر بعد واپس آیا تھا؟"

"ہم سو گئے تھے" — ان آدمیوں نے بتایا — "صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں سویا ہوا تھا۔"

میں نے پنڈت سے اور اس کے دونوں آدمیوں سے پوچھا کہ موہن کمار ہر کشن لعل اور اس کے بیٹے کی بابت باتیں کرتا ہوگا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنی بہن کی باتیں زیادہ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ تھانیدار اس کے چچا کی حمایت کر رہا ہے۔ اپنی بہن کی بابت کہتا تھا کہ اس کا چچا جس مسلمان نوکر کی بابت کہتا ہے کہ اس کی بہن اس کے ساتھ چلی گئی ہے، اس کا گاؤں وہ کسی سے معلوم کر لے گا۔ اگر بہن مل گئی تو اس سے پتہ چلے گا کہ جگدیو اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا تھا۔

ان لوگوں سے میں نے اور بھی بہت ساری باتیں پوچھیں۔ ان سے ایسے شک ہوتا تھا کہ موہن کمار نے قتل نہیں کیا لیکن اس کے خلاف شک زیادہ پکا تھا۔ میں نے اب یہ فیصلہ کیا کہ موہن کمار کے ساتھ اس وقت بات کروں گا جس وقت شہادت مکمل ہو جائے گی۔

عورتوں سے دوستی کا ذریعہ ایک عورت

پوسٹمارٹم ہندی گڑھ سے دس گیارہ میل دُور ہوتا تھا اس واسطے ڈاکٹر کی رپورٹ رات کو آئی۔ موت رسّی سے گلا گھونٹنے سے ہوئی تھی اور ڈاکٹر نے موت کا وقت رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان لکھا تھا۔ پنڈت اور اس کے آدمیوں نے یہی وقت بتایا تھا جب موہن کمار گھر سے غیر حاضر تھا۔

رات کو حوالات کے سنتری نے بتایا کہ موہن کمار مجھ کو بلاتا ہے۔ میں نے اُس کو حوالات میں سے نہ نکالا۔ اُدھر ہی چلا گیا۔ وہ دروازے کی سلاخیں پکڑ کر اندر کھڑا تھا اور رو رہا تھا۔

"آپ مسلمان ہیں" — اُس نے بہت دُکھی ہوئی آواز میں کہا — "مسلمان کہا کرتے ہیں کہ آپ کا مذہب سچا ہے لیکن آپ ثابت کر رہے ہیں کہ آپ کے مذہب میں کوئی سچائی نہیں" — اتنا کہہ کر وہ رو پڑا۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ اُس نے کہا — "آپ روپے پیسے کے پیچھے اپنا ایمان خراب کر رہے ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ جس طرح میرے بھگوان نے مجھ کو میرے گناہوں کی سزا دی ہے اسی طرح خدا آپ کو اسی دُنیا میں سزا دے گا" — اس نے دروازے کو جھنجھوڑتے ہوئے اور دانت پیستے ہوئے کہا — "میں نے اُس حرام کی اولاد کو قتل نہیں کیا۔ میرا باپ اپنے اُوپر نہ لو۔ روپیہ آنی جانی چیز ہے۔ روپیہ چند دنوں میں ختم ہو جائے گا، لیکن بے گناہ کی بددعائیں ساری عمر ختم نہیں ہوں گی"۔

"صرف یہ بتا دو کہ رات تم کہاں گئے تھے" — میں نے کہا — "جو بھی جگہ بتاؤ گے میں وہاں جا کر پوچھوں گا"۔

"شام کے بعد میں آبادی سے دُور نکل گیا تھا" — اُس نے جواب دیا — "دل بہت اُداس تھا۔ نیند نہیں آتی تھی۔ میں دُور جا کر بیٹھ گیا اور روتا رہا۔ بہن بہت یاد آ رہی تھی۔ میں وہاں سے گزرا بھی نہیں جہاں سے اُس پاپی کی لاش

ملی ہے .... میں تو دن رات مندر میں ماتھا رگڑتا ہوں اور اپنے پاپوں کی معافی مانگتا ہوں"۔

اُس نے میرے ساتھ بہت ساری باتیں کی تھیں۔ مجرم جھوٹ ضرور بولتے ہیں۔ تھانیداروں کو اتنا تجربہ ہوتا ہے کہ انہیں محسوس ہو جاتا ہے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ بے گناہ کو پکڑ لو تو وہ بھی مجرموں کی طرح اپنے آپ کو بچانے کے واسطے بہت ساری باتیں کرتا ہے۔ موہن کمار نے تو بہت ہی باتیں کی تھیں۔ میرا تجربہ مجھے اشارے دینے لگا کہ موہن کمار بے گناہ ہو سکتا ہے اور مجھ کو اور زیادہ گہرائی میں جانا چاہیے۔

"موہن کمار!" — میں نے اس کو آرام سے کہا — "میں نے رشوت نہیں لی اور تمہارے ساتھ میری کوئی دشمنی نہیں۔ ٹھنڈے ہو جاؤ اور مجھ کو سوچنے دو۔ میری نظر صرف تمہارے اُوپر نہیں۔ میں ہر طرف دیکھ رہا ہوں"۔

مجھ کو اِدھر اُدھر بھی نگاہ پھیرنی چاہیے تھی۔ یہ مجھ کو پتہ چل گیا تھا کہ جگدیو لوگوں کی بیٹیوں کے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ ہندی گڑھ میں ہندو راجپوت زیادہ تھے۔ مجھ کو یہ خیال آیا کہ مقتول نے کسی کی بیٹی پہ ہاتھ ڈالا ہو گا اور بیٹی والوں نے اُس کو رات کسی دھوکے سے باہر بلایا اور قتل کر دیا۔

تھانے کے مخبر بڑا اچھا کام کرتے تھے۔ میں نے ابھی کسی مخبر کو نہیں بلایا تھا لیکن رات کو تھانے کا ایک خاص مخبر آ گیا۔ اُس نے کہا کہ جگدیو بہت بدمعاش ہو گیا تھا۔ اُس نے عورتوں کے ساتھ دوستی کرنے کا ذریعہ ایک عورت کو بنا لیا تھا۔ یہ عورت بہت بُرے چال چلن کی بتاتی گئی۔

رات کو کانگریس پارٹی کا ایک وفد آ گیا۔ یہ سب سرکردہ ہندو تھے۔ حوالات کا کمرہ برآمدے میں تھا۔ موہن کمار ہر آنے جانے والے کو دیکھ رہا تھا۔ جب کانگریسیوں کا وفد آیا تو میں نے ان لوگوں کو دفتر میں نہیں بٹھایا۔ ان کو برآمدے میں کھڑا رکھا اور خود بھی کھڑا رہا۔ وفد نے میرے اُوپر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ میں موہن کمار کے خلاف کیس جلدی تیار کروں۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ قاتل آپ کو مل گیا ہے۔

میں نے اُونچی آواز میں کہا — "ابھی کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ قاتل موہن کمار ہے" — میں اُونچی آواز میں اس واسطے بولا تھا کہ موہن کمار سُن لے۔ مجھ کو معلوم تھا کہ وہ اسی واسطے غصّے میں آجاتا تھا کہ میں روپے پیسے والوں کی بات سُنتا اور مانتا ہوں۔ میں نے کانگریسیوں کو کہا — "مجھ کو آپ لوگوں کی ہدایت اور تاکید کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں گہری تفتیش کر رہا ہوں۔ میں ابھی اس آدمی کو قاتل نہیں کہوں گا جس کو میں نے حوالات میں بند کر دیا ہے۔ آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں۔ میرے کام میں دخل نہ دیں۔"

رام پیاری کی کہانی

دوسرے دن مجھ کو خفیہ اطلاعیں ملنے لگیں۔ ہر اطلاع جگدیو کے خلاف تھی اور میرا یہ شک پکا کرتی تھی کہ اُس نے کسی کی بیٹی پر دست درازی کی ہے اور عزت کا بدلہ لینے کے لئے اُس کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔

مجھ کو اس بدکردار عورت کا اتا پتہ مل گیا جو جگدیو کے دوستانے لگائی تھی۔ میں نے اُس کو تھانے بلا لیا۔ رام پیاری نام کی اس اُدھیڑ عمر عورت کا قد کاٹھ اور اُس کا چہرہ اب بھی ایسا تھا کہ دل کو اچھا لگتا تھا۔ اس کی آنکھیں ہنستی تھیں اور اس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی۔ میرے سامنے آئی تو بھی مُسکراہٹ موجود تھی۔ ہم لوگ اس قسم کی عورتوں کو جانتے ہیں کہ باہر سے کیا اور اندر سے کیا ہوتی ہیں۔

"رام پیاری!" — میں نے اُس کو اُسی کی طرح مُسکراتے ہوئے کہا — "تمہارے آنے سے پہلے تمہاری ساری رپورٹ میرے پاس آگئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم جھوٹ بولنا شروع کر دو اور میں دس آدمی اور دس بارہ عورتیں تمہارے سامنے کھڑی کر دوں اور وہ تمہاری ہر ایک بات بتائیں۔ مجھ کو یہ بتا دو کہ مجھ سے انعام لینا چاہتی ہو یا آٹھ دس سال قید۔ اپنی مرضی بتا دو۔ میرے پاس

دونوں بندوبست ہیں اور میں تم پر یہ مہربانی بھی کر سکتا ہوں کہ جب تک زندہ ہو تھانے کا کام کرو۔ بہت پیسہ دلاؤں گا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ مُخبری کروں؟" — اُس نے پُوچھا۔

"مُخبری کرو اور اپنا یہ کام بھی جاری رکھو جو کر رہی ہو" — میں نے اس کو کہا — "میں نہیں روکوں گا۔"

عادی مجرموں اور اس قسم کی عورتوں کے ساتھ پولیس والے گول مول بات نہیں کیا کرتے۔ اس سے نقصان ہوتا ہے۔ رام پیاری کو میں نے ایسا کہنے کا موقع ہی نہ دیا کہ وہ شریف عورت ہے۔ میں نے ایسی باتیں کیں کہ اس کا چہرہ بتانے لگا کہ یہ عورت ایسا محسوس کر رہی ہے جیسے میرے سامنے ننگی ہو گئی ہو۔ میں نے اُس کو کہا تھا کہ وہ اپنا کام جاری رکھے۔ یہ اس واسطے کہا تھا کہ وہ جو کام کر رہی تھی اس سے میں کئی مجرموں کا سراغ لگانے میں مدد لے سکتا تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ میں نے اس کو کہا کہ اتنا مت سوچو۔ دل کی بات میرے آگے رکھ دو۔ تم دیکھ رہی ہو کہ میں تمہارے ساتھ تھانیداروں کی طرح بات نہیں کر رہا۔ اگر تم نے مجھ کو تھانیداروں کی طرح باتیں کرنے پر مجبور کر دیا تو تمہاری چیخیں سارا اندر گڑھ سُنے گا۔

"رام پیاری!" — میں نے اُس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے اور ہاتھ دبا کر اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اُس کی آنکھیں مُسکراتی تھیں اور ان آنکھوں میں راز چھپے ہوئے تھے۔ میں نے کہا — "میری دوستی تم کو تخت پر بٹھا دے گی۔ گڑبڑ کرو گی تو تخت کی جگہ پھانسی کا تختہ ہو گا۔"

وہ نئی نویلی دُلہن بن گئی۔ میرا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبا کر اور عجیب طرح سے گردن کو خم دے کر اور بڑے پیارے نخرے سے بولی — "ارے پُوچھنا کیا پُوچھتا ہے۔ تجھ سے کیا پردہ ہے، پر ذرا میرے پردے کا خیال رکھنا۔ مردوں کی طرح یاری لگانا، پُلسیوں کی طرح دھوکہ نہ دینا۔"

اس ٹائپ کی عورتوں کا نہ کوئی دین ہوتا ہے نہ مذہب۔ کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے جس کے واسطے کوئی عورت اس لائن پر چل پڑتی ہے اور اسی کو روزی کمانے کا اور اپنے دل کی تسکین کا ذریعہ بنا لیتی ہے۔ ایسی عورت ضرورت کے واسطے ہر کسی کے ساتھ محبت اور پیار کرتی ہے لیکن وفادار کسی کی بھی نہیں ہوتی۔ مسلمانوں میں وجہیں کچھ اور ہوتی ہیں اور ہندوؤں میں اور۔ رام پیاری کی تاریخ یہ تھی کہ معمولی سے ایک کسان کی بیٹی تھی، قد کاٹھ اور شکل وصورت اور رنگ روغن بہت اچھا تھا۔ کنواری تھی تو راجپوت زمینداروں کے بیٹے جال پھینکتے تھے اور جب شادی ہوئی تو باپ نے نقد رقم لے کر ایسے آدمی کے ساتھ شادی کر دی جس کی عمر رام پیاری سے اڑھائی گنا زیادہ تھی۔ وہ بڑھاپے کی عمر میں تھا۔

رام پیاری کے اندر ایسی آگ لگی کہ اس نے اپنے خاوند کو دھوکہ دینا شروع کر دیا۔ ابھی چار سال ہی گزرے تھے کہ رام پیاری بیوہ ہو گئی۔ ہندوؤں میں یہ پابندی ہے کہ بیوہ دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ رام پیاری کی عمر ابھی بائیس تیئیس سال تھی۔ اس کی تاریخ سنانے والوں نے مجھ کو بتایا کہ وہ روتی نہیں۔ اس کی آنکھوں میں کسی نے آنسو نہ دیکھا۔ ہندو لڑکی بیوہ ہو جاتے تو سہیلیاں اُس سے دور بھاگتی ہیں۔ گھر باہر والے اُسے منحوس سمجھتے ہیں۔ جب یہ واردات ہوئی تھی اُس وقت تو ہندو بہت سخت تھے۔

رام پیاری کو یار دوست مل گئے تھے۔ یہ خفیہ دوستیاں تھیں۔ پنڈت نے اور رام پیاری کے باپ نے اس کو کہا کہ وہ مندر کے آشرم میں چلی جائے اور باقی عمر وہیں گزارے۔ ہندو اب بھی بیوہ عورتوں کو ہردوار یا بنارس بھیج دیتے ہیں۔ مجھ کو رام پیاری کی ایک اور بات سُنائی گئی تھی جو پُرانی تھی۔ اب وہ میرے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے اس سے پُوچھا کہ یہ بات سچ ہے؟ اُس نے کہا کہ بالکل سچ ہے۔ بات یہ تھی کہ اپنے باپ اور پنڈت کے کہنے پر وہ مندر کی داسی بن گئی تھی۔ اُس کو الگ کمرہ دیا گیا تھا لیکن ایک مہینے سے زیادہ وہاں نہ رہی اس واسطے کہ پنڈت جی مہاراج نے اس کو اپنی خفیہ بیوی سمجھ

لیا تھا۔ رام پیاری نے اُس کو کہا کہ میری قسمت میں پاپ ہی پاپ رہ گئے ہیں تو مندر میں قید ہو کر کیوں پاپ کروں؟ کیوں نہ کھلی ہوا میں اُڑوں اور سب کے مُنہ پر ہاتھ پھیروں؟

پھر ایک اور واقعہ ہو گیا۔ وہ مندر کی قید سے آزاد ہو گئی تو پنڈت اور اُس کے بالکوں نے اس کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔ رام پیاری کو اپنے مذہب کے خلاف اتنی نفرت ہو گئی کہ اس نے کوئی ڈر اور ادب لحاظ کئے بغیر سب کو بتانا شروع کر دیا کہ سب سے بڑا پاپی تو ہمارا پنڈت ہے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ راجپوت عام ہندوؤں سے ذرا مختلف ہوا کرتے تھے۔ رام پیاری نے ایک بڑے زمیندار کی پناہ لے لی۔ ظاہری طور پر وہ اس گھر میں نوکری کرتی تھی لیکن خفیہ طور پر وہ اس زمیندار کی داشتہ تھی۔ اس زمیندار کا اتنا رُعب تھا کہ اُس نے رام پیاری کے خلاف سب کا مُنہ بند کر دیا۔

رام پیاری کی عمر اب پچیس سال سے اُوپر ہو گئی تھی اور اُس کو تجربہ بھی بہت حاصل ہو گیا تھا۔ وہ جس زمیندار کی پناہ میں تھی اور جو اُس کو عیش کراتا تھا اُس کی بھی وہ وفادار نہیں تھی لیکن وہ اتنی بد نہ رہی جتنی پہلے تھی۔ اب اُس نے مردوں کو اُنگلیوں پر نچانا شروع کر دیا۔ تین سال بعد اس کا رکھوالا زمیندار مر گیا۔ رام پیاری کو اب کسی کے سہارے اور پناہ کی ضرورت نہیں تھی، اس واسطے کہ کئی آدمیوں کی گردنیں اُس کے ہاتھ میں آ گئی تھیں۔ ان کے بڑے خطرناک راز اُس کے پاس تھے۔ کچھ عورتوں کے اندر کے حالات بھی وہ جانتی تھی بلکہ وہ اکیلی جانتی تھی۔ اب اُس کو کسی کا ڈر خطرہ نہیں تھا۔ اُس کے آگے وہی سر اُٹھا سکتا تھا جس کا مَن صاف تھا۔

یہ تھی رام پیاری۔ آپ کو ایسی رام پیاریاں اپنے محلّے اور اپنے گاؤں میں ضرور ملیں گی۔ ان کو ہم لوگ خود یعنی اپنی غلط کاریوں سے رام پیاری بناتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ عورت بدمعاش ہے۔

کوکھ میں پاپ

اب رام پیاری میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اُس کو صاف کہہ دیا کہ اپنا کام جاری رکھو اور پولیس کا کام بھی کرو۔ اُس کے پاس ایک ہی تحفہ تھا۔ یہ اُس نے مجھ کو اس طرح پیش کیا کہ کہنے لگی کہ "کچھ اور" ضرورت ہو تو مجھ کو ضرور بتانا۔ اشارہ کر دینا۔ حاضر کرنا میرا کام ہے۔ میں نے اس کو کہا "کچھ اور" تو بعد کی بات ہے، پہلے میرا یہ مسئلہ حل کرو۔

اُس نے بات بالکل صاف کر دی۔ کہنے لگی کہ یہ جو لڑکا مارا گیا ہے، جگدیو راج، اس کے میں نے بہت کام کئے ہیں اور اس نے ہر بار میری جھولی بھری ہے۔ رام پیاری نے اپنی ایک انگلی آگے کر کے مجھ کو سونے کی انگوٹھی دکھائی اور کہنے لگی کہ یہ مجھ کو اسی نے دی تھی۔ اس نے مجھ کو ریشمی جوڑے بھی دیئے۔ نقد رقم بہت دی ہے۔

میں اب اس شک پر سوچ رہا تھا کہ جگدیو کو موہن کمار نے نہیں کسی اور نے قتل کیا ہے اور اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اس نے کسی کی بیٹی بہو پر ہاتھ ڈالا ہو گا۔ یہ میرا خیال تھا۔ ایک قیاس تھا۔ ابھی تو کئی اور قیاس اور خیال آنے تھے۔ میں نے رام پیاری سے پوچھا کہ جگدیو کا تعلق کسی ایسی لڑکی سے رہا ہے جس کے گھر والوں کو پتہ چل گیا ہو؟

"تم سمجھتے ہو کہ اُس لڑکی کے باپ یا بھائیوں نے جگدیو کو قتل کیا ہو گا؟" ۔۔۔ رام پیاری نے کہا ۔۔۔ "میرا خیال ایسا نہیں اس واسطے کہ ہر دوستی میرے ہاتھ سے لگتی تھی۔ میرا انتظام اتنا کچا نہیں تھا۔"

"وہ جو مالتی اس گھر میں آ کر رہی تھی اس کی بابت تم کو کیا پتہ ہے؟"

"سب پتہ ہے" ۔۔۔ رام پیاری نے کہا ۔۔۔ "وہ اُس کے ہاتھ نہیں آئی۔ وہ خود کہتا تھا کہ رام پیاری، تم اُڑتے پنچھی پکڑ لیتی ہو، مجھ سے اپنے پنجرے کا پنچھی نہیں پکڑا جاتا۔ میں نے اس کو کہا کہ جس لڑکی نے تم کو ایک بار دھتکار دیا ہے وہ تمہارے ہاتھ نہیں آئے گی ۔ ۔ ۔ اصل بات یہ ہے کہ مالتی ان کے نوکر کے

ساتھ لگی ہوئی تھی۔ بڑا خوبصورت مسلمان تھا۔ یہ راز مجھ سے پوچھو نا! وہ کہاں کہاں ملتے تھے، مجھ کو معلوم ہے، پھر دونوں غائب ہو گئے۔ وہ مسلمان اُس کو لے گیا۔ چچا نے پرواہ ہی نہیں کی۔ کہتا تھا جاتی ہے تو جائے۔ بھائی اس کا اگر لڑائی میں مارا گیا تو لڑکی کی شادی کی ذمہ داری ہم پر آ پڑے گی۔"

"جگدیو اُس کی بابت کیا کہتا تھا؟"

"کہتا تھا ہاتھ سے نکل گئی" ۔۔۔ رام پیاری نے جواب دیا ۔۔۔ "کہتا تھا کہ حیدر خان کہیں نظر آ جائے، گولی مار دوں گا، پر وہ کہاں نظر آنے والا تھا۔"

"اب جگدیو کی دوستی کہاں کہاں تھی؟"

"ایک تو شانتا ہے" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "جوان ہے۔ خاوند والی ہے، پر اس سے دوستی اب کچھ کم ہو رہی ہے۔ دوسری کامنی ہے۔ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی، پر اس سے جگدیو نے نظریں پھیر لی تھیں، اس واسطے کہ وہ جگدیو کے بچے کی ماں بننے والی ہو گئی۔ اس کے ساتھ جگدیو نے دھوکہ کیا ہے۔ میرے ساتھ بھی اس نے دھوکہ کیا ہے۔ جگدیو نے مجھ کو کہا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ وہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ شادی کی بات لڑکے کے ماں باپ لڑکی کے ماں باپ کے ساتھ کیا کرتے ہیں پر جگدیو نے اس لڑکی کی خواہش کی تو میں نے لڑکی کو بتا دیا۔ لڑکی کامنی بہت خوش ہوئی، اس واسطے کہ اُس کو جگدیو پسند تھا اور جگدیو کا باپ امیر تھا ....

"میں نے جگدیو کو بتایا کہ کامنی تو تم پر مرتی ہے تو وہ بے چین ہو گیا۔ کہنے لگا کہ کامنی سے ملوا دو۔ میں نے ان کی ملاقات کرا دی۔ ان کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جم گئے۔ اس کے بعد ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ایک روز جگدیو کو میں نے کہا کہ شادی کی بات چلاؤ۔ اُس نے ہنس کر کہا کہ شادی تو ہو گئی ہے۔ میں نے اُس کو کہا کہ میرا بال بال پاپ میں رنگا ہوا ہے پر میں نے کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دیا۔ کامنی کو میں نے کہا تھا کہ جگدیو تمہارے ساتھ شادی کرے گا پر تم نے دوسرا چکر چلا دیا ہے اور کامنی مجھ کو کہتی ہے کہ جگدیو کے ماں باپ کو کہو کہ میرے ماں باپ کے پاس آئیں۔ جگدیو نے

ہنس کر مجھ کو ٹال دیا۔۔۔ اور پھر یہ مصیبت آپڑی کہ کامنی اور جگدیو کا پاپ کامنی کی کوکھ میں بیٹھ گیا۔ آج سمجھ لو کہ اُس کا تیسرا مہینہ ہے۔ جگدیو نے ایک مہینہ پہلے سے اس کو ملنا چھوڑ دیا تھا۔ کامنی منت کرتی ہے اور گالیاں بھی دیتی ہے کہ میں جگدیو کو اُس سے نہیں ملاتی۔۔۔۔

"جگدیو مانتا نہیں تھا۔ مجھ کو کامنی کا بہت خیال آتا تھا۔ وہ بڑی دلیر اور شرارتی لڑکی ہے، پر جس میں دلیری ہوتی ہے وہ پاپ کرکے پرآجاتے تو بھی دلیری سے کرتا ہے، یہ پاپ ہی کامنی نے کیا۔ اُس نے کہا تھا کہ جگدیو کے ماں باپ اس کا رشتہ نہ مانے تو وہ جگدیو کے گھر چلی جائے گی۔"

کامنی روتی بہت تھی

مجھ کو کامنی اور جگدیو کی اس چکر بازی کے ساتھ دلچسپی نہیں تھی۔ رام پیاری اس طرح سنا رہی تھی جیسے کسی عورت کو کہانی سُنا رہی ہو۔ میں نے اُس کو روک دیا اور کہا کہ اتنی لمبی بات سنانے کی ضرورت نہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ جگدیو کا قاتل کون ہے۔ مجھ کو یقین ہے کہ کامنی قاتل نہیں۔

"ہاں، تو یہ بھی سُن لو" — رام پیاری نے کہا اور میں نے محسوس کیا کہ اس عورت میں عقل بھی ہے اور یہ بہت کچھ جانتی ہے۔ اُس نے کہا — "شاید تم کو کوئی سراغ مل جائے۔ کل دن کی بات ہے۔ کامنی نے مجھ کو بلایا اور رو پڑی۔ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگی کہ یہ نہ ہوتا تو میں دل پہ پتھر رکھ لیتی۔ اب اس کا کیا بنے گا۔ ایک ہی علاج ہے کہ وہ میرے ساتھ بیاہ کر لے، پر وہ سامنے ہی نہیں آتا۔ میں نے اب انتظام کر لیا ہے۔ میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔ اگر میں نہ مری تو جب میرا پاپ ظاہر ہوگا تو میرا باپ اور میرا بھائی مجھ کو قتل کر دیں گے۔ جگدیو سے کہو کہ آج شام کے بعد مجھ کو باہر ملے۔ اُس نے جگہ بتا دی۔ میں نے جگدیو کو جا کر کہا کہ پاپی! ایک بار تو اس کو مل لے اور اُس کے دل کو کچھ تسلی دے دے۔ وہ تو زہر کھا کر مر

رہی ہے۔ میں نے جگدیو کو یہ بھی بتا دیا کہ تم آج رات اُس سے نہ ملے تو میں تمہارے ساتھ تعلق توڑ لوں گی اور تم کو کسی کے ساتھ موقع پر پکڑوا کر دُنیا کے سامنے بے عزتی کراؤں گی۔۔۔۔ بس، میں یہاں تک جانتی ہوں۔ مجھ کو اعتبار نہیں تھا کہ جگدیو کامنی کو ملنے جائے گا۔ صبح ہوئی تو پہلی خبر یہ سُنی کہ جگدیو قتل ہو گیا ہے اور اُس کی لاش کھیتوں میں پڑی ہے۔"

مجھ کو اس طرح دھکا لگا جیسے کسی نے میرے جسم کے ساتھ ننگے تار لگا دیئے ہوں۔ رام پیاری نے مجھ کو قاتل کے قریب پہنچا دیا تھا۔

"تم نے کامنی کے گھر جا کر پُوچھا نہیں کہ رات کو اُسے جگدیو ملا تھا یا نہیں؟"

"میں کامنی کے گھر گئی تھی" — رام پیاری نے کہا — "اس سے یہی بات پُوچھی جو آپ نے کہی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ تو گھر سے ہی نہیں نکلی اس واسطے کہ اُس کو یقین تھا کہ جگدیو اُس کو ملنے کے واسطے نہیں آئے گا۔ کامنی نے یہ بھی کہا کہ جگدیو نے اُس کی طرح کسی اور کو بھی ایسا ہی دھوکہ دیا ہوگا اور اُس نے اس کو مار کر دیا۔ کامنی روتی بہت تھی۔"

رام پیاری کے ساتھ اور بھی بہت ساری باتیں ہوئیں۔ آپ کو میں نے ضروری باتیں سنائی ہیں۔ میرے دماغ میں یہ خیال آیا کہ کامنی نے کیا سچ کہا ہے کہ وہ جگدیو کو ملنے نہیں گئی؟ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اُس کو ملنے گئی اور اُس کا بھائی پہنچ گیا اور اُس نے جگدیو کو قتل کر دیا۔ یہ بات صاف تھی کہ جس نے بھی اس کو قتل کیا ہے وہ قتل کے لئے تیار ہو کر گیا تھا، یعنی وہ اسی کام کے لئے رسی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

ایک خیال یہ بھی آیا کہ جگدیو کامنی کے بلانے پر گیا اور اتفاق سے موہن کمہار اُدھر جا نکلا۔ ان میں کوئی بات ہوتی ہوگی اور موہن کمہار نے اس کو قتل کر دیا مگر موہن کمہار اپنے ہاتھ میں رسی کیوں لے گیا تھا؟

قتل کی بابت ایک اور بات ذہن میں بٹھا لیں۔ جب کوئی آدمی کسی کو اس واسطے قتل کرتا ہے کہ اُس کے تعلقات اُس کی بہن، بیٹی یا بیوی کے

ساتھ ہیں تو وہ ظالموں اور درندوں کی طرح قتل کرتا ہے۔ کلہاڑی یا گنڈاسہ استعمال کرتا ہے۔ ایسے بعض قاتل اتنے پاگل ہو جاتے ہیں کہ لاش کے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ اگر کسی خاوند کو راستے سے ہٹانا ہو اس واسطے کہ اُس کی بیوی کے ساتھ آشنائی ہے تو زہر استعمال کیا جاتا ہے۔ رسّی سے گلا گھونٹنا بُزدلوں کا یا عورت کا طریقہ ہے۔ عام طور پر ایسا ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ میرا دماغ اسی پر ٹھہرتا تھا کہ موہن کمار یا کامنی کا بھائی جگدیو کو قتل کرتا تو جگدیو کی لاش کے بہت سے ٹکڑے ہو جاتے۔ اشتعال اور غیرت کا قتل بڑا ظالموں والا ہوتا ہے۔

وہ خاموش تھی

مجھ کو ایک اشارہ اور ایک راستہ مل گیا تھا۔ میں نے رام پیاری کو تھانے میں ہی بٹھا رکھا اور اس سے کامنی کے گھر کا پتہ اور اُس کے بھائی اور باپ کے نام معلوم کر کے ایک کانسٹیبل کو بھیجا کہ کامنی کو، اُس کے باپ اور بھائی کو تھانے میں لے آئے۔ کانسٹیبل کو میں نے وردی اُتار کر جانے کو کہا تھا اس واسطے کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ ان کو تھانے لے جا رہے ہیں۔

یہ تینوں آ گئے۔ میں نے کامنی کو الگ کر کے اپنے دفتر میں بٹھا لیا۔ اُس کے باپ اور بھائی کو برآمدے میں بٹھا دیا۔ کامنی سترہ اٹھارہ سال کی خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس کے چہرے پر بہت بُری گھبراہٹ تھی۔ میں کچھ دیر اُس کے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔ اس سے اُس کی گھبراہٹ اور زیادہ بڑھ گئی۔ میں نے اُس کو ایسا نہیں کہا کہ وہ گھبرائے اور ڈرے نہیں۔ یہ رام پیاری نہیں تھی۔ کامنی جیسی لڑکیوں کے ساتھ تفتیش کا طریقہ کچھ اور ہوتا ہے۔

"کامنی!" — میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا — "رات کو جب جگدیو تمہارے ساتھ تھا تو اُوپر سے کون آ گیا تھا؟"

وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔

"باپ آ گیا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

اُس نے آہستہ سے دائیں بائیں سر ہلایا، یعنی نہیں۔

"بھائی آ گیا تھا؟"

اُس نے پھر پہلے کی طرح سر ہلایا۔

"پھر اور کون آ گیا تھا؟" — میں نے پوچھا — "کوئی آیا ضرور تھا۔"

اُس نے پھر پہلے کی طرح سے بہت آہستہ سر ہلا دیا، یعنی نہیں۔

"کامنی!" — میں نے اُس کو کہا — "کوئی لڑکی اپنے باپ اور اپنے بھائی کو قتل کے جُرم میں نہیں پکڑوا سکتی۔ وہ اپنی زبان بند رکھے گی لیکن میں نے تمہارے باپ اور تمہارے بھائی کو پکڑ لیا ہے۔ جگدیو کو تم نے بلایا تھا۔ تم دونوں کو اکٹھے دیکھا گیا ہے، اس واسطے میں نے تم کو، تمہارے باپ اور بھائی کو بلایا ہے۔ میں تو تم لوگوں کو جانتا ہی نہیں۔"

مجھ کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ کامنی کے بلانے پر جگدیو گیا تھا یا نہیں۔ میں قیاس پر باتیں کر رہا تھا۔ کامنی کے چہرے پر اب رنگ آتے اور جاتے تھے لیکن وہ خاموش تھی اور مجھ کو دیکھ رہی تھی۔

"تم نے اُسے بلایا تھا نا؟"

وہ چُپ رہی۔

"کامنی!" — میں نے ذرا سا جھنجھلا کر کہا — "مجھ سے کیا کیا چھپاؤ گی؟ کیا تم جگدیو کے بچّے کی ماں بننے والی نہیں ہو؟ کیا اُس نے تم سے شادی کا وعدہ نہیں کیا تھا؟ .... میں نے تمہارے باپ اور بھائی کو ابھی باہر بٹھایا ہُوا ہے۔ میں ان کو حوالات میں بند کر دوں گا۔ پھر جانتی ہو ان کا انجام کیا ہو گا؟ .... پھانسی۔ تم کو ان کی لاشیں ملیں گی۔ اپنی حالت دیکھ لو جو جگدیو بنا گیا ہے۔"

"پھر میں کیا کروں؟" — وہ بول پڑی — "آپ ہی کچھ بتائیں۔"

"تمہارے ساتھ دھوکہ ہُوا ہے کامنی!" — میں نے بڑے حلیم لہجے میں کہا — "میں تم سے اس واسطے پوچھ رہا ہوں کہ اصل معاملہ کیا ہُوا تھا کہ تمہارے

واسطے پہنچنے کی ترکیب کروں۔ میں بہت خوش ہوں کہ جگدیو مارا گیا ہے۔ ایسے ملیچھ اور پاپی کو زندہ نہیں رہنا چاہیئے۔ مجھ کو صاف صاف بتا دو۔ میں تمہارے باپ اور بھائی کو سمجھا دوں گا کہ وہ کیا بیان دیں، پھر میں لکھ دوں گا کہ قاتل کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔"

آپ نہیں سمجھ سکتے کہ کامنی جس صورتِ حال میں پھنس گئی تھی اس میں اس جیسی لڑکی کا حال کیا ہوتا ہے۔ اگر آپ سیلاب میں ڈوب رہے ہوں اور آپ کا ہاتھ ناگ پر جا پڑے تو آپ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ڈس لے گا آپ اس کو پکڑ لیں گے کہ شاید یہی آپ کو ڈوبنے سے بچا لے گا۔ کامنی کے ساتھ میں نے پیار اور ہمدردی کی اور بھی باتیں کیں تو اس کے آنسو بہنے لگے۔

میں راجپوت کی بیٹی تھی

اس نے پہلی بات یہ کہی کہ میرے باپ اور بھائی کو چھوڑ دیں، اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔

"پھر قصور کس کا ہے؟"

"میرا" — اس نے کہا — "اس کو میں نے اپنے ہاتھوں ختم کیا ہے۔"

اتنا کہہ کر اس کی زبان چل پڑی۔ وہی کامنی جو بولتی ہی نہیں تھی اس طرح بولنا شروع ہو گئی کہ میں کوئی بات پوچھنے کے لئے اس کو روکتا تھا تو وہ ذرا چپ ہوتی تھی۔ کبھی اس کے آنسو بہتے تھے اور کبھی خشک ہو جاتے تھے۔ کبھی وہ اتنی غصے میں آ جاتی تھی کہ اس کے دانت بجنے لگتے تھے اور کبھی اس طرح بولتی تھی جس طرح لوگ نیند میں بولتے ہیں۔ میں نے دیکھ لیا کہ یہ معمولی لڑکی نہیں۔ یہ قتل کر سکتی ہے۔

میں نے اس کی ساری رام لیلا سنی۔ یہ میں آپ کو رام پیاری کے بیان میں سنا چکا ہوں۔ اس نے وہی بیان دیا جو رام پیاری نے دیا تھا۔ پھر

اس نے یہ بتایا کہ اس کو جگدیو پر کس طرح غصہ آیا اور اس کو کیا کیا سوچیں آئیں۔ آخر اس نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا اور اس فیصلے کے ساتھ اس کو یہ سوچ آئی کہ وہ خود مر رہی ہے اور اپنے جسم میں ایک اور جان کو اپنے ساتھ مار رہی ہے تو وہ شخص کیوں زندہ رہے جس نے اس کو دھوکہ دیا ہے۔

اس نے جب رام پیاری کو کہا تھا کہ جگدیو کو کہو کہ ایک بار مجھ کو مل لے تو اس کے دماغ میں دو سوچیں تھیں کہ وہ جگدیو کو شادی کے لئے تیار کرنے کی کوشش کرے گی اور دوسری یہ سوچ کہ اس کو جان سے مار ڈالے گی۔ اس کے لئے اس نے جو طریقہ سوچا وہ اس نے عورتوں سے سنا تھا۔ ایک عورت نے اپنے بدکار خاوند کو اس طرح قتل کیا تھا کہ اس کے گلے میں رسی ڈال کر پھندا بنایا اور جھٹکے دے دے کر اس کو ختم کر دیا تھا۔

"میں نے دو دفعہ خواب میں دیکھا کہ میں جگدیو کی گردن میں رسی ڈال کر اس کو قتل کر رہی ہوں" — اس نے کہا — "میں دن کو بھی یہی دیکھتی رہتی تھی۔ آپ کی نگاہ میں میں مجرم ہوں لیکن میرے دل کا حال کوئی نہیں جانتا۔ مجھ کو امید نہیں تھی کہ جگدیو آ جائے گا۔ میں ادوائن کی رسی ہاتھ میں لے کر کھیتوں میں اس جگہ چلی گئی جہاں پہلے کبھی ہم مل چکے تھے۔ اسے موت لے آئی۔ میری بات سننے سے پہلے ہی اس نے مجھ کو کہا کہ تم نے مجھ کو کس واسطے بلایا ہے؟ میں تم کو یہ کہنے آیا ہوں کہ پھر کبھی مجھ کو نہ بلانا....

"میں نے اس کے پاؤں میں بیٹھ کر اس کے پاؤں پکڑ لئے اور رو رو کر کہا کہ میرے ساتھ شادی کر لو، نہیں تو اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لوں گی۔ اپنے اس بچے کا کچھ خیال کرو جو میرے جسم میں پل رہا ہے۔

اس نے مجھ کو پاؤں کی ٹھوکر مار کر کہا — جا بدمعاش کہیں کی۔ معلوم نہیں کس کا بچہ پیٹ میں اٹھائے پھرتی ہو اور مجھ کو پھانس رہی ہو" —

زمین سے ایک شعلہ اٹھا جو میرے سر تک چلا گیا۔ میں آہستہ آہستہ اٹھی

اور اُس کے پہلو میں ہو گئی۔ اب میں مظلوم لڑکی نہیں تھی۔ اب میں راجپوت کی بیٹی تھی۔ میرے ہاتھ میں رسّی تھی۔ میں نے جس طرح خواب میں دو دفعہ اُس کو قتل کیا تھا اسی طرح رسّی کے دونوں سرے پکڑ کر رسّی اُس کے سر کے اُوپر سے اُس کی گردن میں پھینکی۔ وہ شراب کے نشے میں تھا۔ اُس نے ایک ہی بار کہا کہ یہ کیا کر رہی ہو۔ میں نے بہت تیزی سے رسّی کو گانٹھ دے کر رسّی دونوں طرف کھینچی۔ اُس کے مُنہ سے خرخر نکلی اور اُس کے ہاتھ اپنی گردن پر چلے گئے۔ میں نے رسّی کو اور زور سے کھینچا۔ وہ ایک طرف گرتے گرتے اوندھا ہو گیا۔ میں نے اُس کے سر پر ایک پاؤں رکھ کر زور زور سے جھٹکے دیئے۔ وہ تڑپ رہا تھا۔ پھر اُس کی حرکت بند ہو گئی۔ میں نے رسّی کو اور کھینچا۔ میرے دل پر ذرا سا بھی ڈر خوف نہیں تھا۔ میں نے اُس کی گردن سے رسّی کھول دی۔ وہ بالکل نہ ہلا۔ پھر میں اپنے گھر چلی گئی ....

"میرا غصّہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہُوا تھا۔ میں سو گئی۔ صبح آنکھ کھُلی تو سب کہہ رہے تھے کہ لالہ ہر کشن لعل کے بیٹے جگدیو کی لاش کھیتوں میں پڑی ہے۔ اب میرا دماغ ٹھیک طرح سوچنے لگا لیکن پتہ نہیں چلتا تھا کہ کیا کروں۔ میں نے خودکشی کا ارادہ کیا ہُوا تھا۔ وہ میرے دماغ سے نکل گیا اور میں اس سوچ میں پڑ گئی کہ اب کیا ہوگا اور کیا پولیس کو پتہ چل جائے گا کہ جگدیو کو میں نے قتل کیا ہے؟ میں سارا دن اور رات کو بھی اسی سوچ میں پڑی رہی۔ اب آپ کا بلاوا آیا تو مجھ کو ڈر تو لگا لیکن اطمینان سا بھی ہو گیا اس واسطے کہ جو سوچ کل سے پریشان کر رہی تھی وہ ختم ہو گئی ہے۔ میں آپ سے یہ عرض کرتی ہوں کہ مجھ کو زہر لا دیں۔ میں کھا کر اپنے آپ کو ختم کر لوں گی۔"

میں اُس کو زہر نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے اس کے بیان کے بعد یہ کام کیا کہ موہن کمار کو حوالات سے نکالا اور اُس کو سمجھایا کہ وہ مندر میں ہی رہے اور میں کوشش کروں گا کہ اُس کے چچا سے اُس کو کچھ دلوا دوں۔

وہ کہنے لگا کہ میں اُس کی بہن برآمد کرا دوں اور رپورٹ درج کر دوں۔ میں نے اُس کو بتایا کہ مجھ کو شہادت مل چکی ہے کہ اُس کی بہن اپنی مرضی سے اُس کے چچا کے مُسلمان ملازم حیدر خان کے ساتھ چلی گئی ہے۔ مجھ کو قتل کی تفتیش میں پکا ثبوت ملا ہے کہ جگدیو کو اُس کی بہن نے دھتکار دیا تھا۔ میں نے اُس کو یہ بھی بتایا کہ جگدیو کو کس نے اور کس واسطے قتل کیا ہے۔ وہ خاموش ہو گیا اور سر جھکا کر چلا گیا۔

مالتی مُسلمان ہو گئی

میں نے کامنی کو حوالات میں بند کر دیا اور شہادت کی بابت سوچنے لگا۔ یہ کام بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس میں میرے چار پانچ دن لگ گئے۔ اس دوران جگدیو کا باپ ہر کشن لعل میرے پاس آتا رہا۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے غم میں تپ دق کے مریضوں کی طرح ہو گیا تھا۔ بات کرتا اور روتا تھا۔ ایک دن اُس نے کہا کہ مجھ کو ساری رات نیند نہیں آتی۔

مجھ کو موقع مل گیا۔ میں نے اُس کو کہا کہ لالہ جی! آپ کا دل دُکھی ہے، میں اُس کو اور نہیں دُکھانا چاہتا لیکن آپ کی شانتی (اطمینان اور سکون) کے واسطے ایک بات ضرور کہوں گا۔ انسان کوئی پاپ کرتا ہے تو اُس کو خدا کی طرف سے سزا ملتی ہے۔ آپ سوچیں کہ آپ سے کیا پاپ ہو گیا ہے جس کی اتنی خوفناک سزا ملی ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ میری بات پر دھیان دے رہا تھا۔ میں نے اُس کو کہا کہ صبر اور سکون حاصل کرنے کے واسطے خیرات کریں اور ہردوار جا کر لمبا عرصہ عبادت میں ڈوب جائیں اور اگر آپ کے ہاتھوں کسی کا حق مارا گیا ہے تو وہ ادا کر دیں۔ آپ کا بیٹا آپ کو واپس نہیں ملے گا، سکون اور صبر مل جائے گا۔

اُس نے میری باتوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ بہت دیر باتیں کرتے کرتے میں نے اُس کو کہا کہ خدا نے اُس کو بہت دولت دی ہے۔

وہ موہن کمار کی دکانوں کی قیمت اُسے دے دے ورنہ اُس کو اور نہ جانے کیا سزا ملے گی اور موہن کمار اُس کے خلاف دھوکہ دہی کا مقدمہ بھی کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کو یہ بھی کہہ دیا کہ موہن کمار غنڈوں بدمعاشوں کا دوست ہے۔ یہ ڈر بھی ہے کہ اُس کا بیٹا ایک عورت کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے اور وہ موہن کمار کے ہاتھوں قتل ہو جائے۔ موہن کمار اُس کے گھر ڈاکہ بھی ڈلوا سکتا ہے۔

اکلوتے بیٹے کے قتل نے اُس کے دماغ کا حال کچھ اور ہی کر دیا تھا۔ اُس نے مجھ کو کہا کہ میں تصفیہ کرا دوں اور وہ موہن کمار کو رقم دے دے گا۔ میں نے اُسی شام موہن کمار اور ہرکشن لعل کو تھانے بلا لیا۔ ہرکشن لعل رقم ساتھ لایا تھا۔ یہ آٹھ ہزار تھی جو آج کے اسّی ہزار کے برابر تھی۔ اُس نے رقم مجھ کو دی۔ میں نے موہن کمار کو دے دی اور اُس کو کہا کہ وہ چُپ کر کے چلا جائے۔ وہ چلا گیا۔

کامنی کو پانچ سال سزائے قید دی گئی تھی۔

چھ سات ماہ بعد اتفاق سے پتہ چلا کہ موہن کمار کی بہن مالتی حیدر خان کے ساتھ اپنی مرضی سے چلی گئی اور اُس نے مسلمان ہو کر اُس کے ساتھ شادی کر لی تھی۔



دل دریا سمندروں ڈُونگھے

قتل بہت خوفناک واردات سمجھی جاتی ہے اور لوگ خیال کرتے ہیں کہ قتل جس وجہ سے ہُوا وہ وجہ بھی خوفناک ہوگی اور معلوم نہیں اس کہانی میں کیا کیا دلچسپیاں ہوں گی مگر پولیس والے قتل کو کوئی خوفناک واردات نہیں سمجھتے۔ خاندانی دشمنیوں پر لوگ ایک دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں۔ معمولی معمولی باتوں پر قتل ہو جاتے ہیں۔ چال چلن کے شبہے میں کوئی خاوند اپنی بیوی کو یا کوئی بھائی اپنی بہن کو قتل کر دیتا ہے اور خود ہی تھانے میں چلا جاتا ہے۔

قتل کی بعض وارداتیں اس وجہ سے دلچسپ ہوتی ہیں اور حیران کر دیتی ہیں کہ قاتل اس خیال سے کہ پکڑے نہ جائیں، عجیب و غریب طریقے اختیار کرتے ہیں۔ انہیں یہ اُمید پکی ہوتی ہے کہ پولیس کو وہ بیوقوف بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ وارداتیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں اور یہ ثبوت بھی ملتا ہے کہ انسان کی فطرت سمندر جیسی ہے۔ اس کے اندر بہت عجیب عجیب چیزیں چھُپی ہوتی ہیں۔

میں آپ کو ایک حادثے کا کیس سُناتا ہوں۔ ایک جوان آدمی پر بھیڑیوں نے حملہ کیا اور اُس کو چیر پھاڑ کر مار ڈالا۔ بھیڑیا بڑا بدمعاش درندہ ہوتا ہے لیکن انسان کی فطرت میں جو بدمعاشی اور خونخواری ہے اس تک کوئی درندہ نہیں پہنچ سکتا۔ مجھ کو تھانے میں ایک حاجی صاحب نے یہ پیغام بھیجا کہ ایک آدمی کو بھیڑیوں نے مار ڈالا ہے، آکر دیکھ لو، ورنہ ہم لاش کو جلدی دفن کر دیں گے کیونکہ لاش خراب ہو رہی ہے۔ مجھ کو یہ پیغام اس طرح دیا گیا تھا جیسے تھانیدار میں نہیں ہوں بلکہ یہ حاجی صاحب ہیں۔

میں لوگوں کے اور گاؤں، شہروں وغیرہ کے نام اصلی نہیں لکھوں گا۔
یہ قصہ ہندوستان کے ایک علاقے کا ہے اور جن کی بابت یہ قصہ ہے وہ مسلمان تھے۔ وہ اُدھر سے آگئے ہوں گے۔ وہ ایک قصبہ تھا۔ آبادی کے اردگرد کھیتیاں تھیں اور ان سے آگے جنگل اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور نالے تھے۔ کھڈ بھی تھے۔

میں اس تھانے کا چارج لینے کے لئے آیا تو شہر کے خاص خاص افراد مجھ کو ملنے کے واسطے آئے۔ ایسا اِدھر پاکستان میں بھی ہوتا ہے کہ قصبے یا کسی دیہاتی تھانے میں نیا تھانیدار آئے تو چند ایک آدمی جو "معززینِ شہر" کہلاتے ہیں نئے تھانیدار سے ملنے کے لئے آتے ہیں۔ یہ لوگ خوشامد کے ماہر ہوتے ہیں۔ نئے تھانیدار کو اس طرح پھونک دیتے ہیں کہ پہلے تھانیدار (یعنی تبدیل ہو کر جانے والے تھانیدار) کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اکیلے اکیلے آئیں اور ہر ایک کو نیا تھانیدار اکیلا ملے۔ وہ ایک دوسرے کی چغلیاں کرتے ہیں اور ہر آدمی اپنے آپ کو اعتماد کے قابل ثابت کرتا ہے۔

میں نے نئے تھانے کا چارج لیا تو مجھ کو شہر کے "معززین" ملنے کے واسطے آئے۔ ان میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ ان میں ایک آدمی شہر کا رئیس تھا۔ وہ مسلمان تھا اور اس نے حج کیا ہوا تھا اس واسطے حاجی کہلاتا تھا۔ اس کا کھالوں کا کاروبار تھا اور وہ بہت ساری زمین کا مالک بھی تھا۔ شہر میں اس کی بہت بڑی حویلی تھی۔ یہاں نوکر چاکر تھے اور ساتھ کے دیہات میں اس کے مزارعے تھے۔ وہ مجھ کو ملنے آیا تو اس نے دوسروں کی طرح مجھ کو باتوں میں خوش کرنے کی کوشش کی اور اپنی پوزیشن اور امیری کا رعب بھی جمایا۔

ابھی ایک ہی مہینہ گزرا تھا کہ صبح سویرے سویرے اس حاجی کا ایک آدمی میرے پاس آیا اور اس نے کہا کہ حاجی صاحب کے منیم (منشی یا کلرک) کو رات بھیڑیوں نے چیر پھاڑ کر ہلاک کر دیا ہے۔

"حاجی صاحب نے مجھ کو آپ کے پاس بھیجا ہے"۔ اس نے کہا۔۔۔ "وہ کہتے ہیں کہ لاش ابھی تک وہیں پڑی ہے۔ اگر آپ کوئی کاغذی کارروائی کرنا چاہیں تو آ کر کر لیں۔ زیادہ انتظار نہیں ہو سکتا۔ لاش خراب ہو رہی ہے۔ میں اسے جلدی دفن کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ شخص حاجی کا ملازم تھا۔ میں نے اس سے چند ایک ضروری باتیں پوچھیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ میرے کسی بھی سوال کا جواب پورا نہیں دیتا تھا۔ میرے لئے یہ واقعہ کچھ عجیب تھا کہ کسی کو بھیڑیوں نے ہلاک کیا ہو۔ اس علاقے میں بھیڑئیے موجود تھے۔ میں نے تھانے کے پرانے آدمیوں سے پوچھا کہ ایسا واقعہ پہلے بھی کبھی ہوا ہے؟ انہوں نے مجھ کو بتایا کہ کبھی کسی کی بھیڑ بکری بھیڑیوں کا شکار ہو جاتی ہے لیکن کسی انسان پر بھیڑیوں کا حملہ کبھی نہیں ہوا۔ یہ بھی انہوں نے مجھ کو بتایا کہ ذرا آگے چلے جاؤ تو بھیڑئیے رات کو حملہ کرتے ہیں۔

چیری پھاڑی ہوئی لاش

میں لاش دیکھنے چلا گیا۔ شہر (جو دراصل قصبہ تھا) سے ایک میل سے کچھ زیادہ دور حاجی کا باغ تھا۔ اس میں سبزیاں اُگائی جاتی تھیں جو منڈی میں فروخت ہوتی تھیں۔ باغ میں رہٹ تھا۔ یہ کم از کم دس ایکڑ کا باغ تھا۔ اس سے آگے دو کھیت تھے اور آگے علاقہ بنجر تھا۔ باغ سے ایک میل کے فاصلے پر لاش پڑی تھی۔ میں نے دیکھتے ہی دل میں فیصلہ دے دیا کہ اس شخص کو بھیڑیوں نے چیرا پھاڑا ہے۔ اس کے جسم پر چیتھڑے رہ گئے تھے جو خون سے لال تھے۔ کھال تو اتاری ہوئی لگتی تھی بلکہ پنجوں سے کھینچی ہوئی تھی۔

کوئی شبہ نہیں تھا کہ حاجی کے منیم کو درندوں نے چیرا پھاڑا ہے۔ میرے دماغ سے یہ بوجھ اتر گیا کہ قتل کی واردات ہوگی اور مجھ کو تفتیش

کرنی پڑے گی۔ موقعہ پر ایک تو حاجی موجود تھا۔ اُس کے نوکر وغیرہ تھے۔ قصبے کا نمبردار بھی تھا۔ وہ مسلمان تھا۔ میرے کانسٹیبل اور بہت سے تماشائی تھے جو دُور کھڑے تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا کہ بھیڑیئے یہاں تک بھی آگئے ہیں اور انہوں نے ایک انسان کو بھی مار ڈالا ہے تو ان کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ میں اس علاقے سے ابھی پوری طرح واقف نہیں ہُوا تھا۔ میں سب سے پوچھنے لگا کہ بھیڑیوں کا ٹھکانہ کہاں ہو سکتا ہے۔ ہر آدمی مجھ کو کچھ نہ کچھ بتانے لگا۔

یہ میری ذمہ داری کا علاقہ تھا۔ اس کے باشندوں کی حفاظت اور ان کا امن و امان میری ذمہ داری تھی۔ میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا تو میری نظر زمین پر چلی گئی۔ آپ یہ ذہن میں رکھیں کہ تھانیدار کی نظریں دوسرے لوگوں سے بہت مختلف ہوتی ہیں۔ ٹریننگ، وارداتیں اور تجربہ اپنے آپ دماغ سے کام کراتا ہے۔ پھر وہ انگریزوں کی حکومت تھی۔ انگریزوں کو ہم بہت بُرا کہتے ہیں کیونکہ انہوں نے ہم کو غلام بنایا ہُوا تھا لیکن ہم پاکستانیوں نے ان سے کوئی اچھا وصف سیکھا نہیں۔ ہم لوگ اسلامی قانون کی صرف باتیں کرتے ہیں مگر اس کا ذرا سا بھی عملی احترام نہیں کرتے۔ انگریز اپنے قانون کے تقاضے پورے کرنے کے لئے ہر طرح کی قربانی دیتے تھے۔ مجرم کا سراغ حاصل کرنے کے واسطے نہ دن کو آرام کرتے نہ راتوں کو سوتے تھے۔ مجھ پر انہی لوگوں کا اثر تھا۔ یہ دیکھ کر بھی کہ یہ شخص بھیڑیوں کا شکار ہوا ہے میری نظریں زمین پر چلی گئیں اور مجھے بھیڑیوں کے پنجوں کے نشان نظر آئے۔ جنگل کی زبان میں درندوں کے پنجوں کے نشانات کو پگ کہتے ہیں۔ میں ان کو کھُرے کہوں گا جو پولیس کی زبان ہے۔ جہاں لاش پڑی تھی وہاں بارہ چودہ گز کے دائرے میں زمین کی حالت بتا رہی تھی کہ بھیڑیئے دو یا اس سے زیادہ ہوں گے۔ وہ اپنے شکار کو پچھاڑنے کے واسطے اِدھر اُدھر بھاگتے دوڑتے رہے ہیں اور ان کا شکار (منیم) ان سے بچنے کے لئے بھاگتا دوڑتا رہا ہے، لیکن میں نے دیکھا کہ پنجوں کے بہت سارے نشان باغ کی طرف

جا رہے تھے اور ان میں انسانی کھُرے بھی تھے۔ یہ جوتیوں کے نشان تھے۔ میں نے اور زیادہ غور سے دیکھا تو مجھے نظر آیا کہ ان میں ایسے کھُرے تھے جو باغ کی سمت سے آ رہے تھے۔ جا بھی رہے تھے۔

کیا یہ بھیڑیوں کے پگ ہیں؟

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے میں نے ان کھُروں کو اور زیادہ غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ بھیڑیئے آئے کدھر سے اور گئے کدھر کو۔ دیکھتے دیکھتے میری نظر وہاں سے ہٹی تو میں نے دیکھا کہ دو آدمی باغ کی طرف جا رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ آدمی شاید حاجی کے نوکر تھے۔ حاجی نے انہیں کہا ہو گا کہ جاؤ اپنا کام کرو۔ میں پھر کھُرے دیکھنے لگا۔

یہ ایک راستہ سا تھا جو باغ کی طرف جاتا تھا۔ زمین نرم اور گرد والی تھی اس واسطے پنجوں کے اور انسانی قدموں کے نشان صاف تھے۔ میں نے لاش سے باغ تک کا درمیانی فاصلہ نصف طے کر لیا تو میں نے دیکھا کہ چھ سات مویشی باغ کی طرف سے اسی راستے پر آ رہے تھے۔ انہیں دو آدمی ہانک رہے تھے۔ میں نے چلا چلا کر کہا کہ مویشیوں کو راستے سے دُور کر دو مگر وہ سیدھے چلے آ رہے تھے۔ دو کانسٹیبل دوڑے گئے اور مویشیوں کو راستے سے ہٹا دیا مگر انہوں نے کھُرے مٹا دیئے تھے۔

مجھ کو کھوجی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں نے اُس کو بلانے کے واسطے ایک کانسٹیبل کو دوڑا دیا۔ میں نے کھُروں اور پنجوں کا رُخ دیکھا تھا۔ آگے کھُرے مویشی مٹا گئے تھے۔ میں اندازے پر چلتا گیا اور باغ میں جا پہنچا۔ بہت بڑا ڈربہ تھا جس کے تین طرف جالی تھی۔ اس میں چار کُتے گھوم پھر رہے تھے۔ ایک بُل ڈاگ تھا جو چہرے سے ہی خونخوار لگتا تھا۔ ایک بھیڑیئے جیسا بہت بڑی جسامت کا کُتا تھا اور دو بُل ٹیریئر تھے۔ یہ بھی پُوری طرح تندرست تھے۔

یہاں مجھے شک ہُوا کہ ایسا تو نہ ہُوا ہو کہ منیم کو ان کُتوں نے مار ڈالا ہو۔ حاجی بھی میرے پاس آ گیا تھا۔ میرے پوچھے بغیر ہی کہنے لگا کہ یہ شکاری کُتے ہیں اور وہ شکار کا شوقین ہے۔

"یہ کُتّے رات کو باہر لے جاتے گئے تھے؟" — میں نے پوچھا۔

اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور یہ کہہ کر دوڑ پڑا۔ "ابھی پوچھ کر بتاتا ہوں" — وہ باغ کے اندر ہی کہیں چلا گیا۔

یتیم اور مظلوم

لاش کو پوسٹمارٹم کے لئے بھیجنا تھا۔ باغ میں بیٹھ کر میں نے کاغذات تیار کئے اور ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ لاش پوسٹمارٹم کے واسطے لے جاتے۔ پوسٹمارٹم کا انتظام موجود تھا جو قصبے کے سرکاری ہسپتال میں ہوتا تھا۔ حاجی کبھی کا آیا کھڑا تھا۔ کاغذات کی تیاری میں بہت وقت لگ گیا تھا۔ میں نے حاجی کی طرف توجہ دی۔

"جناب! کُتّے آج صبح سویرے سے کھولے گئے تھے۔" اُس نے کہا۔ "میں نے نوکروں کو کہہ رکھا ہے کہ دوسرے تیسرے دن کُتّوں کو ٹہلائی کے لئے باہر لے جایا کریں۔ وہ آج صبح کُتّوں کو لے گئے تھے۔ راستے میں انہوں نے مُنیم کی لاش دیکھی اور کُتّے واپس لا کر مجھ کو آکر اطلاع دی۔ میں دوڑا آیا۔ لاش کو دیکھتے ہی میں نے کہہ دیا کہ اسے بھیڑیوں نے مارا ہے۔"

"اور آپ نے مجھ کو حکم بھیجا کہ کوئی کارروائی کرنی ہے تو آکر کر لو ورنہ میں لاش کو جلدی دفن کر دوں گا" — میں نے کہا اور اُس سے پوچھا — "کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ بھیڑیوں کا شکار ہوا ہے؟"

"اگر شیر ہوتا تو لاش یہاں نہ ہوتی" — حاجی نے کہا — "شیر کے بعد دوسرا درندہ بھیڑیا ہی ہو سکتا ہے۔ آگے ندی ہے اور یہاں سے جنگل اور کھڈ نالے شروع ہو جاتے ہیں۔ میں شکاری ہوں۔ مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ اس علاقے میں کتنے بھیڑیئے ہیں۔ میرے کُتّوں نے کئی بار بھیڑیا مارا ہے۔"

"کیا آپ کا مُنیم بھی کُتّوں کے ساتھ گیا تھا؟"

"نہ جی!" — اُس نے جواب دیا — "مُنیم کا کُتّوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"

"یہ کہاں رہتا تھا؟"

"میں نے اپنی حویلی کے ساتھ ہی ایک کمرہ اُسے دے رکھا تھا" — حاجی نے جواب دیا۔

"پھر یہ اِدھر کیوں آیا تھا؟" — میں نے پوچھا — "آپ نے کسی کام سے اسے بھیجا ہوگا؟"

حاجی سوچ میں پڑ گیا اور افسوس کے لہجے میں بولا — "میں خود حیران تھا کہ وہ رات کو اِدھر کیسے آنکلا۔ دو تین روز پہلے میں نے اسے آگے کے ایک گاؤں کا ایک کام بتایا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ گذشتہ رات اُدھر کو چلا گیا ہوگا... بڑا برخوردار لڑکا تھا۔"

اُس نے مُنیم کی بہت ہی تعریفیں کیں اور کہنے لگا کہ اُسے ایسا مُنیم پھر کبھی نہیں ملے گا۔ اُس نے بتایا کہ مُنیم یتیم تھا۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں اُس کے پاس آیا تھا۔ وہ کسی اور شہر کا رہنے والا تھا۔ گھر سے بھاگ آیا تھا۔ اس قصبے میں آیا تو نوکری اور ٹھکانہ تلاش کرنے لگا۔ کسی نے اسے حاجی کے گھر کا راستہ دکھایا۔ حاجی کو اُس نے بتایا کہ چار سال گذرے اُس کے ماں باپ مر گئے تھے۔ اُسے چچا اپنے گھر لے گیا۔ چچا نے اُسے سکول سے تو نہ ہٹایا لیکن اُسے گھر کا نوکر بنا لیا اور وہ اس کو مارتا پیٹتا تھا۔ لڑکا پڑھتا رہا اور ظلم بھی برداشت کرتا رہا۔ دسویں جماعت میں پڑھ رہا تھا تو چچا، چچی اور ان کے بچوں کے سلوک سے اتنا تنگ آگیا کہ گھر سے بھاگ نکلا۔

یہاں وہ اس حاجی سے ملا۔ اس نے اُس کی دُرد بھری کہانی سُنی اور اُسے اپنے پاس رکھ لیا۔ حاجی نے اس واسطے بھی لڑکے کو اپنے پاس رکھ لیا کہ وہ خوبصورت تھا۔ اس کے خراب ہونے کا خطرہ تھا۔ حاجی نے اسے اپنی حویلی کے ساتھ کا ایک کمرہ دے دیا۔ لڑکا دیانتدار اور ذہین نکلا۔ اُس نے اپنا اعتبار پیدا کر لیا اور مُنیم کا کام سیکھ لیا۔ حاجی کے گھر میں پردہ تھا لیکن اس لڑکے کو گھر میں آنے جانے کی اجازت تھی۔

موت کے وقت اس کی عمر بائیس تیئس سال تھی۔ اُس کی لاش کی حالت تو بہت بُری تھی۔ چہرہ ٹھیک تھا۔ جسم سے خون نکل جانے کے باوجود

چہرہ مجھ کو اچھا لگا تھا۔

"میں تو اس کی شادی کا بندوبست کر رہا تھا" حاجی نے کہا ۔۔۔ "دو تین روز بعد میری بیٹی کی شادی ہے۔ اس کے بعد میں اس کی شادی کا بندوبست کرنے والا تھا لیکن اللہ کو منظور نہیں تھا"

اتنے میں کھوجی آگیا۔ میں نے اسے کہا کہ جو کھرے اور پگ میں دیکھ آیا ہوں انہیں پہچانے اور جہاں لاش پڑی تھی وہاں سے دیکھنا شروع کرے اور بھیڑیوں کے پگ (پنجوں کے نشان) تلاش کرے اور یہ بھی دیکھے کہ جو نشان میں دیکھ آیا ہوں وہ بھیڑیوں کے ہیں یا کتوں کے۔

معاملہ کچھ اور تھا

لاش پوسٹمارٹم کے واسطے جا چکی تھی۔ مرنے والے کی جیبوں سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوئی تھی جو کوئی شک پیدا کرتی یا جس سے کوئی سراغ ملتا۔ مجھے ابھی وہیں رہنا تھا۔ ہر پہلو کو اچھی طرح دیکھ کر مجھ کو تسلی کرنی تھی۔ کھوجی اپنا کام کرنے چلا گیا تھا۔ میں نے ان دو آدمیوں کو بلایا جن کی بابت حاجی نے بتایا تھا کہ کتے ٹہلانے کے لئے لے گئے تھے۔ ان سے الگ الگ بیان لئے۔ انہوں نے ایک ہی جیسا بیان دیا کہ حاجی صاحب کے حکم کے مطابق کتوں کو باہر لے جایا کرتے تھے۔ اس صبح بھی وہ لے گئے اور آگے لاش پڑی ملی۔

تھانے سے ایک آدمی دوڑتا آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ڈی ایس پی آیا ہے۔ یہ ڈی۔ ایس۔ پی انگریز تھا، اے۔ ایم بارٹن۔ انگریز ڈی۔ ایس۔ پی اور ایس۔ پی اکثر دورے پر آیا کرتے اور کبھی اچانک آدھمکتے اور تھانے میں رجسٹر شدہ کیسوں کی فائلیں دیکھا کرتے تھے۔ علاقے میں بھی گھومتے پھرتے تھے۔ وہ اپنی افسری کو دوسروں سے سلام کرانے کے لئے استعمال نہیں کیا کرتے تھے بلکہ اپنے فرض پر توجہ رکھتے تھے۔ ان کے اس اصول کو میں جانتا تھا اس واسطے میں نے ایسا نہیں کیا کہ اپنا کام چھوڑ کر تھانے کی طرف دوڑ پڑتا۔

میں اپنے کام میں لگا رہا۔ بارٹن کو میں جانتا تھا۔ اگر میں اس کے بلانے کے بغیر تھانے چلا جاتا تو وہ مجھے ڈانٹ کر واپس بھیج دیتا۔

تھانے کا یہ آدمی مجھے ڈی۔ ایس۔ پی کے آنے کی اطلاع دے چکا تو میں نے دیکھا کہ ڈی۔ ایس۔ پی گھوڑے پر سوار چلا آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ میرے تھانے کا اے۔ ایس۔ آئی تھا اور پیچھے پیچھے ایک کانسٹیبل آ رہا تھا۔ میں اس کے استقبال کے لئے آگے بڑھا۔ وہ گھوڑے سے اترا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا کیس ہے۔ میں نے اسے سارا کیس بتایا اور یہ بھی کہ میں نے کھرے اور پنجے دیکھے ہیں اور کھوجی کو مزید نشان تلاش کرنے کے لئے بھیجا ہوا ہے۔

اس نے مجھ کو ساتھ لیا اور وہاں لے گیا جہاں لاش دیکھی گئی تھی۔ اس نے پنجوں اور انسانی قدموں کے نشان دیکھے۔ کھوجی ندی کی طرف سے آ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ہمارے پاس آگیا۔

"میں درندوں کے پگ پہچان سکتا ہوں" اس نے کہا ۔۔۔ "یہ پگ کتوں کے ہیں بھیڑیوں کے نہیں۔ میں دور دور تک دیکھ آیا ہوں بھیڑیوں کا ایک بھی پگ نظر نہیں آیا"

"بھیڑیئے اور کتے کے پگ میں کیا فرق ہوتا ہے" ڈی۔ ایس۔ پی نے اس سے پوچھا۔

اس نے فرق ایسے طریقے سے بیان کیا کہ ڈی۔ ایس۔ پی متاثر ہو کر مسکرانے لگا۔ اس نے کھوجی کو شاباش دی اور اس کی مہارت کی تعریف کی۔

"میں آپ کو ہر طرح سے یقین دلا سکتا ہوں کہ یہاں بھیڑیئے نہیں آئے" کھوجی نے کہا ۔۔۔ "اگر بھیڑیوں نے اس شخص پر کہیں اور حملہ کیا ہے اور یہ شخص چلتے چلتے یہاں آکر گرا ہے تو ایسا ہو سکتا ہے کہ ہوا ہو لیکن آپ نے اس کے جسم کی جو حالت بتائی ہے اس میں وہ چلنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ چند قدم چل سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مجھ کو بھیڑیوں کا

کوئی پگ نظر نہیں آیا۔"

ہم باغ میں چلے گئے۔ کھوجی کو حاجی کے اُن دو نوکروں کے کھُرے دکھائے۔ اُس نے کہا کہ جو کھُرے کُتوں کے پنجوں کے نشانات کے ساتھ دیکھے گئے ہیں وہ انہی دو آدمیوں کے ہیں اور اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہ دونوں آدمی وہاں نہیں گئے — یہ دونوں پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ وہ کُتوں کے ساتھ وہاں تک گئے تھے جہاں لاش پڑی تھی۔ کھوجی نے ایک جگہ کُتوں کے پنجوں کے نشان بھی دیکھ لئے۔ ڈی۔ایس۔پی بائرن نے بھی دیکھے۔ میں نے بھی دیکھے۔ یہ وہی نشان تھے جو باہر دیکھے گئے تھے۔

ڈی۔ایس۔پی نے ایک کُتا باہر نکلوایا اور اس پر ہاتھ پھیر کر اور اسے بہت غور سے دیکھ کر پوچھا — "چاروں کُتوں کو آج نہلایا گیا ہے؟"

ایک نوکر نے جواب دیا کہ کُتوں کو نہلایا گیا تھا۔ ڈی۔ایس۔پی مجھے الگ لے گیا اور اس نے مجھے کہا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ منیم کو بھیڑیوں نے نہیں ان کُتوں نے مارا ہے۔ اسے حادثاتی موت لکھنے سے پہلے گہری تفتیش کرنا۔

ڈی۔ایس۔پی نے مجھ کو اور بھی بہت کچھ کہا۔ تھانے کے متعلق مجھ سے کچھ پوچھا اور چلا گیا۔

دو بیویاں — ایک بوڑھی ایک جوان

میں نے جب گہرائی میں جا کر سوچا تو میرے دماغ میں آئی کہ منیم بھی نوکروں کے ساتھ گیا ہوگا اور کسی وجہ سے کُتوں نے اس پہ حملہ کر دیا۔ نوکر اُسے چھُڑا نہ سکے اور اب بتاتے ڈرتے ہیں۔ میں نے دونوں نوکروں سے کہا کہ وہ سچی بات بتا دیں لیکن وہ اپنے پہلے بیان پر اڑے رہے۔

میں دونوں کو تھانے لے گیا۔ حاجی بھی تھانے میں آ گیا۔ وہ بہت پریشان تھا۔

"نوکروں اور منیم کے درمیان کچھ ہوگا" — اُس نے کہا — "پریشانی میرے لئے پیدا ہو گئی ہے۔ چوتھے روز میری بیٹی کی شادی ہے اور یہ شادی معمولی نہیں ہوگی۔ میری ایک ہی بیٹی ہے، کوئی اور اولاد نہیں۔ میں نے

شادی کا اہتمام ایسا کیا ہے کہ اس شہر کے لوگ بہت مدت تک یاد کریں گے۔"

میں نے اُسے کہا کہ اُسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اس شخص سے کُچھ متاثر ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ اُس کی بیٹی کی شادی میں کوئی خلل نہیں پڑے گا۔ اُس سے میں نے بیان لے لیا اور اُسے چلے جانے کو کہا۔ میں نے دونوں نوکروں سے الگ الگ پوچھ گچھ کی لیکن کوئی خاص بات معلوم نہ ہوئی۔ میں نے یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش کی کہ ان کی منیم کے ساتھ کوئی دشمنی تھی۔ مجھے دشمنی کا کوئی سراغ یا اشارہ نہ ملا۔

شام کے تین اور چار کے درمیان کا وقت تھا جب مجھ کو پوسٹمارٹم رپورٹ ملی۔ اس میں موت کا باعث درندوں کو لکھا تھا اور موت کا وقت آدھی رات سے بہت پہلے کا بتایا گیا۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ مرنے والے نے مرنے سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے کھانا کھایا تھا۔ یہ رپورٹ معدے میں پڑی ہوئی غذا کی حالت کو دیکھ کر لکھی گئی تھی۔ عام پوسٹمارٹم میں جو کچھ دیکھا جاتا ہے اس میں معدے کو کھول کر دیکھنا بھی شامل ہوتا ہے۔

اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ منیم کھانا کھانے کے بعد مرنے والی جگہ گیا۔ کُتوں کی بابت حاجی کے نوکر کہتے تھے کہ انہیں وہ صبح اُس وقت باہر لے گئے تھے جب صبح ابھی پوری طرح طلوع نہیں ہوئی تھی۔ میرے سامنے اب یہ سوال تھا — "کیا مجھے نوکروں کے بیان کو سچ تسلیم کر لینا چاہئے؟" — مگر یہ تسلیم کرنا بہت مشکل تھا کہ منیم بھیڑیوں کا شکار ہوا ہے۔ یہ اس واسطے مشکل تھا کہ بھیڑیوں کا وہاں اور دُور دُور تک ایک بھی پگ نظر نہیں آیا تھا۔

میں ابھی یہ بھی فیصلہ نہیں دے سکتا تھا کہ منیم کو کُتوں سے مروایا گیا ہے۔

یہ دن ایسے ہی گزر گیا۔ لاش حاجی کے حوالے کر دی گئی تھی۔ نوکروں کو میں نے تھانے میں ہی رکھا۔ وہ ملزم تو نہیں تھے لیکن مجھے کچھ اور لوگوں کے بیان لینے تھے، اس واسطے یہ مناسب نہیں تھا کہ نوکر ان سے ملتے۔ ان میں باغ میں کام کرنے والے دوسرے مزارعے تھے۔ کھیتوں کے مزارعے بھی تھے۔ یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ ان نوکروں کی منیم کے ساتھ دشمنی تھی۔ مخبروں

سے رپورٹیں لیتی تھیں۔

اُسی رات ایک صاحبِ حیثیت آدمی میرے پاس آیا۔ وہ اُن آدمیوں میں سے تھا جو پولیس کے ساتھ دوستی رکھا کرتے ہیں اور تھانیداروں کو سلام کرنے کے واسطے تھانے جاتے رہتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ حاجی بڑا گہرا اور بڑا اکایاں آدمی ہے۔ اس کی بیٹی جس کی شادی ہو رہی ہے وہ بہت خوبصورت ہے اور اُس کی دو بیویاں ہیں۔ ایک تو اس لڑکی کی ماں ہے اور دوسری جوان ہے۔ منیم سے گھر کی عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں۔

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حاجی کو منیم کے چلن پر شبہ تھا"— میں نے کہا— "اور اُس نے منیم کو مروا دیا ہے۔"

"شاید ایسے ہی ہوا ہو"— اُس نے کہا— "میں آپ کو یہ بتا رہا ہوں کہ حاجی کو نیک اور شریف آدمی نہ سمجھ لیں۔"

"منیم کیسا آدمی تھا؟"

"ظاہری طور پر تو خاموش طبیعت والا تھا"— اُس نے جواب دیا— "میرا خیال ہے کہ وہ بھی حاجی کی طرح کا شریف آدمی ہوگا۔"

تھانیداروں کے ساتھ یہ لوگ اسی واسطے دوستی لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس کسی کے ساتھ کوئی چپقلش ہو اُس کے خلاف تھانیداروں کے کان بھر کے ذلیل کرایا جاتے۔ میں نے اُس آدمی کی بات سن لی تو ایک اور آگیا۔ اُس نے حاجی کی تعریف کی۔ ہمیں صحیح رپورٹیں اپنے مخبروں سے ملا کرتی تھیں۔

خوبصورت جوان، لڑکی نے قبول نہ کیا

میرے پاس ڈکیتی کی ایک سنگین واردات کا ایک کیس تھا اور منیم کے مارے جانے کے بعد ایک قتل کا اور ایک ڈکیتی کا اور ایک اور کیس آگیا۔ میں نے منیم کی موت کا کیس اے۔ ایس۔ آئی کو دے دیا اور اُسے کہا کہ

وہ حاجی کے تمام نوکروں اور مزارعوں سے تفتیش کرے اور مخبروں کو استعمال کرے۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی کو اپنا شک بتا دیا جو یہ تھا کہ میں یہ نہیں مانتا کہ منیم نے حاجی کی بیٹی یا جوان بیوی کے ساتھ تعلقات بنا رکھے ہوں گے۔ یہ ممکن تھا کہ منیم نوکروں میں سے کسی کی بہن یا بیوی کا در پردہ دوست رہا ہو۔ لڑکی کے گھر والوں کو پتہ چل گیا۔ انہوں نے اسے کتوں سے مروا دیا۔ اگر ایسا ہوا ہے تو نوکر اُسے دھوکے میں لے گئے ہوں گے اور اس پر کتے چھوڑ دیتے۔

یہ بھید لینا مشکل نہ تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی کو معلوم تھا کہ یہ بھید کس طرح حاصل کئے جاتے ہیں۔

میں دوسرے کیسوں میں مصروف ہو گیا۔ حاجی کی بیٹی کی شادی ہوئی۔ مجھ کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ بہت ہی شاندار شادی تھی۔ حاجی منیم کو بہت یاد کرتا تھا۔ اُسے رنج تھا کہ منیم اُس کی خوشی میں شریک نہ تھا۔ منیم کو مرے چوتھا دن تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی تفتیش کر رہا تھا۔ اُس کے پلے ابھی کچھ نہیں پڑا تھا۔ اُس نے منیم کے دو دوست ڈھونڈ نکالے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ منیم ہنسنے کھیلنے والی طبیعت کا آدمی تھا لیکن پندرہ بیس دنوں سے چپ چاپ تھا۔ اُس نے دو تین مرتبہ اپنے دوستوں سے کہا تھا کہ اُسے اب اپنی غربت کا احساس ہونے لگا ہے۔ مرنے سے دو دن پہلے اُس نے کہا تھا کہ دل ایسی جگہ دے بیٹھا ہوں جو بہت اونچی ہے۔

یہ اشارہ ملنے سے اے۔ ایس۔ آئی نے تفتیش میں کچھ اور لوگ شامل کر لئے تھے۔ وہ کوتاہی نہیں کر رہا تھا۔ مخبروں نے بتایا تھا کہ حاجی کے گھر کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں ہو سکتی کیونکہ وہاں ایک قسم کی شرافت اور وقار ہے۔ اے۔ ایس۔ آئی راجیشور اپنے فرض کو پورا کرنے والا اور عقل والا آدمی تھا۔ اس نے مجھے کہا تھا— "مجھے توقع ہے کہ منیم کی موت کے پیچھے کچھ بھی نہیں، اور اگر کچھ ہے تو وہ بڑا ہی زبردست ڈرامہ ہوگا۔"

دن گذرتے جا رہے تھے اور کوئی "زبردست ڈرامہ" سامنے نہیں آ رہا تھا۔ معلوم یہی ہونے لگا تھا کہ اس واقعہ میں کچھ بھی نہیں۔ ہمیں کسی نے

بھی نہیں کہا تھا کہ یہ موت حادثاتی نہیں یہ قتل کی واردات ہے۔ جب ایک مہینہ گزر گیا تو ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے حاجی بھی اس واقعہ کو بھول گیا ہے۔ میں اب سوچنے لگا کہ تفتیش روک کر اسے حادثاتی موت لکھ دوں۔

مجھے اس تھانے میں آئے دو اڑھائی مہینے ہو گئے تھے۔ مجھے ملنے والے، سلام اور خوشامد کرنے والے تو بہت تھے لیکن دوست ایک ہی بنا۔ وہ سب جج تھا۔ اتفاق سے وہ مسلمان تھا اور بڑے اونچے خاندان کا فرد تھا۔ میرا ہم عمر تھا۔ ایک روز اُس نے پیغام بھیجا کہ آج رات کا کھانا اُس کے ساتھ کھاؤں اور گپ شپ کے واسطے وقت نکالوں۔ میں شام کو اُس کے گھر چلا گیا۔

کھانے کے دوران اُس نے مجھ سے پوچھا کہ حاجی کے منیم کی موت کی میں نے رپورٹ لکھی ہے یا نہیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ کوئی شک سامنے نہیں آرہا اس واسطے میں اسے حادثاتی موت لکھ رہا ہوں۔

"ابھی رپورٹ نہ لکھنا" — اُس نے کہا — "یہ قتل ہے۔ اپنے منیم کو حاجی نے قتل کرایا ہے"

"کُتّوں سے؟"

"میں قتل کا طریقہ نہیں جانتا" — اُس نے کہا — "میں پورے یقین کے ساتھ بھی بات نہیں کر سکتا لیکن میں کسی بنیاد پر بات کر رہا ہوں۔ تم پولیس افسر ہو۔ اگر سراغرسانی میں مہارت رکھتے ہو تو بڑا عجیب اور دلچسپ کیس سامنے آئے گا"

"مجھ کو وہ بنیاد بتائیں جس پر آپ بات کر رہے ہیں" — میں نے کہا — "پھر میری سراغرسانی کا کمال دیکھنا"

"حاجی کی بیٹی کی شادی میں تم بھی شریک ہوتے تھے" — سب جج نے کہا — "اس لڑکی کی شادی جس آدمی کے ساتھ ہوئی ہے وہ میرے چھوٹے بھائی کا گہرا دوست ہے۔ اس آدمی کی عمر چوبیس سال کے لگ بھگ ہے۔ وہ حاجی کی برادری کا آدمی ہے (اُسے آپ

ناصر کہہ لیں) ناصر بہت پریشان ہے۔ سب حیران تھے کہ اسے اتنی خوبصورت اور اتنے امیر ماں باپ کی لڑکی مل گئی ہے اور یہ غمگین رہتا ہے۔ ناصر نے ایک مہینہ صبر کیا اور آخر تنگ آکر اُس نے میرے بھائی کو راز کی بات بتا دی جو یہ ہے کہ حاجی کی بیٹی نے ناصر کو پہلے دن سے ہی قبول نہیں کیا اور وہ اس کے ساتھ بات بھی نہیں کرتی، حالانکہ ناصر خوبصورت جوان ہے"

غنڈے، بدمعاش، سزا یافتہ — حاجی کے ہاتھ میں

"ناصر کے لئے مسئلہ یہ نہیں کہ اُس کی دلہن نے اُسے قبول نہیں کیا" — سب جج نے کہا — "بلکہ یہ کہ حاجی کی بیٹی کا رویہ اور سلوک ایسا ہے کہ ناصر کو اُس پر غصہ نہیں رحم آتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ناصر کی شادی ہو گئی۔ اُس نے اب دو روز پہلے میرے بھائی کو راز داری سے بتایا ہے کہ اس کی دلہن نے اُسے کہا — "میں نے تمہیں دل سے قبول نہیں کیا۔ میں نے باپ کی عزت رکھنے کے لئے نکاح کے وقت ہاں کہہ دی تھی۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تمہیں پریشان نہیں کروں گی لیکن اپنے دل میں تمہاری ذرا سی بھی محبت پیدا نہیں کر سکوں گی" — ناصر کے دل پر جو چوٹ پڑی ہو گی اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں لیکن دلہن نے اُسے دھتکارا نہیں، نہ ہی نفرت کا اظہار کیا....

"ناصر مایوس اور اُداس ہو کر الگ بیٹھ گیا۔ دلہن نے اُسے کہا — "میں تمہاری بیوی ہوں۔ مجھے جو کچھ بھی کہو گے وہ تمہاری مرضی کے مطابق پورا کروں گی لیکن مجھے صرف جسم سمجھنا۔ یوں سمجھ لو کہ ایک زندہ لاش ہے جو تمہیں دے دی گئی ہے۔ میرا دل اور میری روح کہیں اور ہے!....

"ناصر نے میرے بھائی کو بتایا کہ اُس کی دلہن کا لہجہ اور انداز ایسا تھا جس میں رُعب اور دھمکی نہیں تھی۔ التجا اور اُداسی تھی لیکن اُس کا عزم

پکا تھا۔ ناصر نے اُسے نہ کہا کہ وہ اُس کو اپنے دل میں جگہ دے۔ اُس نے دلہن سے پوچھا کہ اُس کا دل اور روح کہاں ہے۔ دلہن نے جواب دیا۔ "وہ اس دُنیا میں نہیں ہے۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو میں آج تمہیں یہ الفاظ نہ کہہ رہی ہوتی جو تمہارے دل کو زخمی کر رہے ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم مجھ کو طلاق نہیں دے سکتے۔ تم میرے باپ سے ڈرتے ہو۔ میں تمہیں ذلیل نہیں ہونے دوں گی۔ جب تک زندہ ہوں میرا باپ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں تم سے صرف یہ درخواست کرتی ہوں کہ مجھ سے وہ محبت نہ مانگنا جو بیوی اپنے خاوند کو دیا کرتی ہے۔ میرا جسم تمہارا ہے۔" ناصر نے دیکھا کہ دلہن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُس نے آنسو پونچھ کر کہا — "میں تم سے معافی مانگتی ہوں کہ تمہاری یہ رات خوشی کی رات ہے اور میں آنسو بہا رہی ہوں۔ پھر کبھی میری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھو گے۔" اُس نے ناصر کو بازو سے پکڑا اور کھینچ کر اپنے پاس پلنگ پر بٹھا لیا۔"

"اگر میں ہوتا تو اُسی وقت اس دلہن کو بازو سے پکڑتا اور اُس کے ماں باپ کے حوالے کر آتا" — میں نے کہا — "اور کہتا کہ اسے وہاں چھوڑ آؤ جہاں اس کا دل اور اس کی رُوح ہے۔"

"کوئی بھی ہوتا یہی کرتا جو آپ کہہ رہے ہیں" — سب جج نے کہا —

"یہاں معاملہ کچھ اور ہے۔ ناصر نے میرے بھائی کو بتایا کہ دلہن نے اپنا آپ اُسے پیش کیا اور کہا کہ اس جسم کو اور میری خوبصورتی کو اپنا سمجھو..... آپ جانتے ہیں کہ جوانی ہو اور اتنی خوبصورت دلہن مل جاتے تو انسان جذبات کی گرمی میں پگھل جاتا ہے۔ ناصر ان جذبات سے مغلوب ہو گیا اور دلہن نے جس انداز سے باتیں کی تھیں اس سے بھی وہ متاثر ہو گیا۔ اُس نے میرے بھائی کو بتایا کہ دلہن برف کا تودہ تھا جس کے ساتھ وہ کھیلتا رہا۔"

"وہ دراصل اپنے جذبات سے مغلوب ہُوا تھا" — میں نے کہا — "مرد جب حیوانوں والے جذبات سے مغلوب ہوتا ہے تو ایک آوارہ اور بدمعاش بیوی کا بھی غلام ہو جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ناصر نے اُسے اُسی وقت طلاق کیوں نہ دے دی۔"

"یہ بھی سُن لیں" — سب جج نے کہا — "ناصر حاجی کی برادری کا آدمی ہے۔ حاجی اسی کو اپنی بیٹی دینا چاہتا تھا۔ رشتہ طے ہو گیا۔ ناصر کو اتنی خوبصورت لڑکی اور اتنا امیر سسرال جانے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا لیکن حاجی کی بیٹی کو پتہ چلا کہ اُس کا رشتہ ناصر کے ساتھ ہو گیا ہے تو اُس نے ایک عورت کی زبانی ناصر کو پیغام بھیجا کہ میرا رشتہ لینے سے انکار کر دو ورنہ ساری عمر کی خوشیوں سے خالی رہ جاؤ گے۔ ناصر کے لئے یہ دھمکی کافی تھی۔ اُس نے اب میرے بھائی کو بتایا ہے کہ اُس نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کرے گا۔ ناصر کا باپ مر چکا ہے۔ ماں بہت حیران ہوئی کہ لڑکا کیا کہہ رہا ہے۔ اُس نے ماں کو اصل وجہ نہ بتائی۔ ماں نے اُسے سمجھایا بجھایا....

"ناصر خود ہی حاجی کے پاس چلا گیا اور اُس سے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کسی اور کو دے دے۔ حاجی نے وجہ بھی نہ پوچھی۔ اُس نے بڑے اطمینان کے لہجے میں ناصر سے کہا کہ تم نے پھر کبھی یہ الفاظ منہ سے نکالے تو تمہیں بھکاری بنا دوں گا۔ تمہاری بہن کو اغوا کرا دوں گا۔ ناصر کی ایک کنواری بہن بھی ہے۔ آپ حاجی کو نہیں جانتے۔ اسے نہ جاننے والوں کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوتا کہ اس شخص کے اشارے پر کسی کا گھر لُٹ سکتا ہے، کوئی قتل ہو سکتا ہے اور جس لڑکی کی طرف اشارہ کر دے وہ غائب ہو سکتی ہے۔ ناصر بھی کاروباری آدمی ہے لیکن اُس کے کاروبار کا دارومدار حاجی کے کاروبار پر ہے۔ ناصر کی کچھ زمین بھی ہے۔ حاجی چاہے تو اُسے کاشتکاری کے معاملے میں بھی تباہ کر سکتا ہے۔ حاجی کا یہی خطرہ اس کے واسطے کافی ہے کہ غنڈے، بدمعاش، سزا یافتہ اور جرائم کی دنیا کے آدمی اس کے ہاتھ میں ہیں۔ ناصر کو اپنی ماں اور اپنی کنواری بہن کا خیال رہتا ہے۔ حاجی بڑی آسانی سے ان دونوں مستورات کو ذلیل و خوار کرا سکتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انہیں ایسا غائب کرا سکتا ہے کہ آپ ساری عمر انہیں نہ ڈھونڈ سکیں۔"

"آپ یہاں بہت پُرانے ہیں" — میں نے کہا — "کیا کوئی تھانیدار اسے لگام نہیں ڈال سکا؟"

"یہ تھانیداروں کو لگام ڈال لیا کرتا ہے"۔ سب جج نے کہا — "یہ دیکھ لیتا ہے کہ یہ تھانیدار کس فطرت کا ہے۔ یہ اس کے مطابق اُسے اپنا مرید بناتا ہے۔ شراب، روپیہ پیسہ، عورت، شرافت، شرافت کا پردہ، خلوص اور قربانی کی ایکٹنگ، یہ سارے ڈھنگ کھیل لیتا ہے۔ آپ کو یہ شرافت اور باوقار ہونے کی مار دے رہا ہے۔"

"آپ نے مجھ پر احسان کیا ہے کہ مجھے اس کی یہ خصلتیں بتا دی ہیں" — میں نے کہا — "میں اُسے واقعی شریف اور باوقار آدمی سمجھتا تھا۔"

ایک طرح کا پاگل پن

سب جج نے بات آگے سنائی — "یہ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ناصر حاجی کی بیٹی کو طلاق دینے کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن ناصر نے ایک پابندی اور بھی اپنے اوپر لے لی۔ یہ اس کا اخلاق ہے۔ اُس نے میرے بھائی کو بتایا ہے کہ حاجی کی بیٹی نے اپنا آپ اس کے حوالے کر رکھا ہے لیکن اس کے ساتھ خود کوئی بات نہیں کرتی۔ ناصر کوئی بھی بات کرتا ہے تو وہ توجہ سے سُنتی ہے۔ سر ہلاتی ہے لیکن اپنی کوئی رائے نہیں دیتی۔ اتنے امیر گھرانے کی لڑکی ناصر کے گھر میں کام کاج، ہانڈی روٹی اپنے ہاتھ سے کرتی ہے۔ اُس نے ناصر کو کبھی کوئی طعنہ نہیں دیا۔ ماتھے پر کبھی شکن نہیں آنے دی لیکن اُس کے ہونٹوں پہ مُسکراہٹ نہیں آتی۔ اُس نے ناصر سے وعدہ کیا تھا کہ اُس کی آنکھ میں آنسو نہیں آئے گا۔ وہ اپنا وعدہ نبھا رہی ہے۔ وہ ناصر کے اشاروں پہ چلتی ہے۔ ناصر کہہ ہی نہیں سکتا کہ اس کی بیوی نے اس کا فلاں کام نہیں کیا یا اس کی کوئی خواہش پوری نہیں کی لیکن یہ معاملہ صرف جسمانی ہے۔ لڑکی کا دل اور اُس کی رُوح یہاں نہیں ....

"ناصر نے صرف ایک ہفتہ اس کے ساتھ میاں بیوی کا تعلق رکھا۔ اس کے بعد اُس نے لڑکی سے کہا کہ تمہیں بیوی نہیں سمجھوں گا۔ بیوی نے اُسے

کہا کہ وہ ایسا نہ سوچے۔ ناصر نے کہا — 'میرے دل میں تمہاری اتنی محبت ہے کہ میں تمہارے اُن جذبات کو ناپاک اور پامال نہیں کرنا چاہتا جو تم اپنے دل میں دباتے ہوئے ہو' — ناصر اُس سے ناراض نہیں ہوتا بلکہ یہ احتیاط کرتا ہے کہ وہ ناراض نہ ہو....

"اس لڑکی نے ناصر کا یہ خیال رکھا کہ وہ شادی کے بعد صرف ایک بار اپنے ماں باپ کے گھر گئی۔ اس کے بعد ماں نے اُسے بلایا۔ ماں اُسے گھر لے جانے کے واسطے بھی آئی۔ ناصر نے اُسے کہا کہ وہ تھوڑی دیر کے واسطے چلی جائے لیکن اُس نے ناصر سے کہا کہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ ناصر نے اُسے کہا کہ چلو میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ لڑکی نے کہا کہ میں تمہیں اُس گھر میں نہیں لے جاؤں گی۔"

"کیا یہ ایک طرح کا پاگل پن نہیں ہے؟" — میں نے کہا — "مسلمان گھروں میں تو ایسا نہیں ہوتا۔"

"بہت کچھ ہوتا ہے"۔ سب جج نے کہا — "انسان کی فطرت کو آپ تو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ بہر حال میں آپ کو جو کچھ سُنا رہا ہوں یہ بالکل سچ ہے۔ ناصر نے اپنی بیوی کو بیوی کی بجائے ساتھی یا دوست بنا لیا اور اس کے ساتھ جسم کا تعلق ختم کر کے اُس کے جذبات کو سنبھالنے لگا تو یہ لڑکی خاموش رہتے ہوئے اس کی غلام ہو گئی۔ یہ جو ایک مہینہ گذرا ہے اس دوران لڑکی نے تین مرتبہ ناصر سے پوچھا ہے — 'تم مجھ سے ناراض ہو گئے ہو؟' — ناصر نے کہا کہ وہ ناراض نہیں نہ کبھی ہو گا....

"کوئی تین دن گزرے ہیں کہ لڑکی نے ایک بار پھر ناصر سے کہا — 'تم ناراض ہو گئے ہو' — ناصر نے جھنجلا کر کہا — 'ہاں ہاں، میں ناراض ہو گیا ہوں' — لڑکی کو جیسے بڑا سخت جھٹکا لگا ہو۔ اُس کے آنسو بہنے لگے۔ وہ چونکہ بولتی بہت کم ہے اس واسطے ایسی نظروں سے ناصر کو دیکھنے لگی جن میں رحم اور ڈر تھا۔ ناصر کو رحم آ گیا اور اس نے بیوی سے کہا — 'کوئی آدمی اس حالت کو برداشت نہیں کر سکتا جو تم نے میرے واسطے پیدا کر رکھی ہے۔ کبھی کبھی خیال آ جاتا ہے کہ میں بے غیرت اور ڈرپوک ہوں یا تم پاگل ہو یا ہم

دونوں پاگل ہیں۔ جو کچھ بھی ہے میں نے قبول کر لیا ہے۔ میں نے تمہارے جذبات کا جس طرح پاس کیا ہے یہ اتنی بڑی قربانی ہے جو کوئی آدمی نہیں دے سکتا لیکن تم نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا کہ کبھی بتا دو کہ وہ کون ہے جس کے پاس تمہارا دل اور تمہاری رُوح ہے ۔۔۔۔

"لڑکی تھوڑی دیر ناصر کو دیکھتی رہی پھر بولی ۔۔۔ "تمہیں مجھ پر شک نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ زندہ تو نہیں" ۔۔۔ ناصر نے اُسے کہا کہ یہی بتا دو کہ وہ کون تھا؟ کب مرا ہے؟ لڑکی نے کہا ۔۔۔ "وہ مرا نہیں۔ اُسے مارا گیا ہے" ۔۔۔ ناصر نے کچھ غصے کا اظہار کیا کہ وہ اُس آدمی کا نام نہیں بتاتی۔ لڑکی نے کہا ۔۔۔ "وہ ایک غریب آدمی تھا۔ میرے سوا دُنیا میں اُس کا کوئی نہیں تھا۔ اُس کا نام سلیمان تھا۔ میرا باپ کہتا ہے کہ سلیمان کو بھیڑیوں نے چیر پھاڑ دیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ بھیڑیا ایک ہی ہے اور وہ میرا باپ ہے" ۔۔۔ ناصر نے حیران ہو کر کہا ۔۔۔ "وہ سلیمان جو حاجی صاحب کا منیم ہوا کرتا تھا؟" "ہاں، وہی منیم" ۔۔۔ لڑکی نے کہا ۔۔۔ "اُسے اس جرم کی سزا دی گئی ہے کہ میں اُسے چاہتی تھی۔ وہ پیار کا ترسا ہوا تھا۔ میں نے اُسے پیار دیا اور میرے باپ کے کُتوں نے اُسے چیر پھاڑ دیا" ۔۔۔ ناصر نے بتایا کہ اتنا کہہ کر وہ چلانے لگی ۔۔۔ "کُتے ۔۔۔۔ کُتے ۔۔۔۔ میرا باپ کُتا ہے۔ انسانوں سے پیار چھیننے والے کُتے ہیں۔ سب کُتے ہیں" ۔۔۔ وہ تو جیسے پاگل ہو گئی تھی۔ ناصر نے اُسے بازوؤں میں لے کر گلے لگا لیا۔ وہ ہچکیاں لیتی رہی پھر اُسے سکون آ گیا ۔۔۔

"ناصر نے اُسے کہا کہ وہ درپردہ تھانیدار کو بتا سکتا ہے کہ سلیمان کو قتل کیا گیا ہے لیکن پولیس ثبوت مانگے گی۔ تم کیسے کسی کو یقین دلا سکتی ہو کہ سلیمان کو حاجی صاحب نے کُتوں سے مروایا ہے؟ لڑکی نے کہا ۔۔۔ "میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ باپ نے مجھے کہا تھا کہ سلیمان کو میں کُتوں سے مرواؤں گا ۔۔۔۔ اب تھانیدار کو بتا بھی دو گے تو کیا ہوگا۔ میرا باپ، اُس کے نوکر اور ہر کوئی پھانسی چڑھ جائے، سلیمان تو مجھے نہیں ملے گا" ۔۔۔

"اب ناصر بہت پریشان ہے۔ وہ آپ کو یہ بات بتاتے ڈرتا ہے۔ حاجی اُسے بھی کُتوں سے مروا دے گا۔ ناصر نے میرے بھائی سے کہا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے واسطے بہت بڑی قربانی دے رہا ہے۔ یہ سلسلہ وہ کب تک جاری رکھ سکے گا۔ اس کی ماں اور بہن ہر وقت پریشان رہتی ہیں۔ ناصر کی بیوی اُن کے ساتھ بھی کوئی بات نہیں کرتی۔ ناصر کی ماں کہتی ہے کہ یہ امیر ماں باپ کی بیٹی ہے اس واسطے تکبر سے ان کے ساتھ نہیں بولتی۔ ناصر اپنی ماں اور بہن کی غلط فہمیاں دُور کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے لیکن ایک نہ ایک دن تصادم ہوگا ۔۔۔۔ یہ آپ کا کیس ہے۔ اگر آپ نے ابھی تک کوئی رپورٹ نہیں لکھی تو ابھی نہ لکھیں۔ میں نے آپ کو جو سراغ دیا ہے اس پر تفتیش کریں۔"

حیران کُن اور ناقابلِ یقین

میں نے سب جج کا شکریہ ادا کیا کہ اُس نے مجھے روشنی دکھائی تھی۔ مجھے تو پہلے روز سے شک تھا کہ منیم کو بھیڑیوں نے نہیں مارا لیکن صرف شک کرنے سے بلکہ یقین کر لینے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ ثبوت کی ضرورت تھی۔ میں نے سب جج کے گھر سے آ کر اُسی رات اے۔ ایس۔ آئی راجیشور کو بٹھا لیا اور اُس سے پوری رپورٹ لی۔ اُس کی رپورٹ سے ظاہر ہوا کہ وہ بھی میری طرح حاجی کو شریف آدمی اور منیم سلیمان کی موت کو حادثہ سمجھتا رہا ہے۔ اُس نے مجھے تفصیل سے بتایا کہ اس نے کیا تفتیش کی ہے۔

باغ میں ایک مالی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس نے اے ایس۔ آئی کو بتایا تھا کہ دونوں نوکر صبح کے وقت کُتے لے گئے تھے۔ اُس نے یہ کہا کہ رات کو اُس نے بھیڑیوں کے بھونکنے کی آوازیں سُنی تھیں۔ اے۔ ایس۔ آئی نے اور بھی کئی آدمیوں سے پوچھ گچھ کی تھی۔

میں نے کیس اے۔ ایس۔ آئی راجیشور سے لے لیا اور اُسے

پاس بٹھا کر اُس کے ساتھ واردات اور تفتیش کے ہر پہلو پہ تبادلۂ خیالات کیا۔ میں نے اسے۔ ایس۔ آئی کو نہ بتایا کہ مجھے کیا راز ملا ہے اور اس واردات کا پس منظر کیا ہے۔ میں نے اسے یہ تاثر دیا کہ یہ حادثہ نہیں قتل کی واردات ہے۔ ہم دونوں نے جب اُسے ایک مجرم کہہ کر آپس میں بات چیت کی تو ہر پہلو سے یہ ہمیں مجرم نظر آنے لگا۔

میں نے پہلے دن کی باتیں یاد کیں۔ سب سے پہلے یاد آیا کہ میں نے جب کھُرے اور پگ دیکھنے شروع کیے تھے تو یہ نشان مجھے باغ کی طرف لے جا رہے تھے۔ اُس وقت میں نے دو آدمی باغ کی طرف تیز تیز جاتے دیکھے۔ وہ ان لوگوں میں سے نکل کر گئے تھے جو لاش کو دیکھنے کے واسطے اکٹھے ہو گئے تھے۔ پھر یہی دو آدمی مویشی کھول کر باغ سے نکلے اور انہیں ہانکتے ہوئے اُس راستے پر لے آئے جس پر کھُرے تھے۔ اُس وقت میں نے اُدھر توجہ نہیں دی تھی۔ اب میں نے ان دو آدمیوں اور مویشیوں پر غور کیا تو میرے ذہن میں سوچ آئی کہ حاجی نے دیکھا کہ میں کھُرے دیکھتا باغ کی طرف جا رہا ہوں تو اُس نے اپنے ان دو نوکروں سے کہا ہو گا کہ دوڑ کر جاؤ اور مویشی اس راستے پر لے آؤ۔ یہ اُس نے کھُرے مٹانے کا انتظام کیا تھا۔ سب جج نے مجھے بتایا تھا کہ حاجی بہت ہی عقل مند آدمی ہے۔ اس کی عقل تک عام انسان نہیں پہنچ سکتا۔

میں نے اپنے ذہن پر اور زیادہ زور دیا تو مجھ کو یاد آیا کہ میں نے حاجی سے پوچھا تھا کہ کُتے آج صبح باہر نکالے گئے تھے؟ حاجی یہ کہہ کر باغ میں کہیں روپوش ہو گیا تھا کہ نوکروں سے پُوچھ کر بتاتا ہوں۔ اگر وہ صاف دل ہوتا تو کسی نوکر یا مالی کو وہیں بلا لیتا لیکن وہ خود گیا اور دیر بعد آیا۔ اب مجھے شک ہُوا کہ اُس نے اپنے نوکروں اور مالی کو کوئی نئی ہدایات دی تھیں۔

حاجی تفتیش کے دوران مجھے جب بھی ملا اُس نے سلیمان کی تعریفیں کیں۔ میں نے جب ان تعریفوں کے الفاظ پر اور اُس کے انداز پر غور

کیا تو مجھے خیال آیا کہ نوکر کتنا ہی اچھا اور دیانت دار کیوں نہ ہو مالک اُس کی اس طرح تعریفیں نہیں کیا کرتا۔ میں نے ذہن پر مزید زور دیا تو مجھے حاجی کی تعریفوں اور باتوں میں بناوٹ اور اُس کے افسوس اور غم میں ایکٹنگ نظر آئی۔

سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہاں بھیڑیوں کے پنجوں کا ایک بھی نشان نہیں ملا تھا۔ کئی اور چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آئیں۔ اب چونکہ میں اس خونی ڈرامے کو نئے زاویے سے دیکھ رہا تھا اس واسطے مجھے حاجی ہر پہلو سے مجرم نظر آیا اور میں نے حاجی کو ذلیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ دن کے وقت جب بازار میں خوب بھیڑ تھی اور آڑھت کی منڈی میں خوب رونق تھی، میں اے۔ ایس۔ آئی، ہیڈ کانسٹیبل اور چار کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور حاجی کی دکان پر چھاپہ مارنے کے انداز میں جا دھمکا۔ اس کی دکان میں کئی لوگ تھے۔ میں نے حاجی سے کچھ بھی نہ کہا۔ اسے بازو سے پکڑا اور باہر بازار میں لے آیا۔

لوگ جمع ہو گئے۔ سارے بازار کو خبر ہو گئی کہ حاجی کی دکان پر پولیس نے چھاپہ مارا ہے۔ ذرا سی دیر میں سینکڑوں تماشائیوں کا ہجوم ہو گیا۔ میں چاہتا تھا کہ سارا شہر تماشہ دیکھے۔ میں نے اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ اسے ہتھکڑی لگا لو۔ اے۔ ایس۔ آئی آگے بڑھا تو حاجی پیچھے ہٹنے لگا۔ میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا۔ اُس کا رنگ اُڑ گیا اور وہ دبی دبی زبان میں کہہ رہا تھا کہ میں بھاگوں گا نہیں، ہتھکڑی نہ لگاؤ تمہارے ساتھ چلوں گا۔ میری عزت کا خیال کرو۔ وہ ہتھکڑی نہیں لگانے دے رہا تھا۔ اُس نے بولی دینی شروع کر دی — "ایک ہزار نقد دوں گا.... ڈیڑھ ہزار.... دو ہزار" — اور اُس نے دھیمی آواز میں کہا — "ایسی چیز پیش کروں گا جو آپ نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی" — میں اس "چیز" کا مطلب سمجھتا تھا۔ ہم نے اُسے ہتھکڑی لگا لی۔ تھانے کا راستہ ایک اور طرف

بھی تھا لیکن اُسے پوری طرح ذلیل کرنے کے واسطے میں اُسے بازار میں سے گزار کر لے گیا۔ اُسے اس طرح ذلیل کرنے سے میرا مطلب یہ تھا کہ اس کے نوکروں چاکروں کے دماغوں سے یہ نکل جاتے کہ حاجی کوئی بہت بڑا آدمی ہے۔

حاجی کو گرفتار کرنے کا اقدام میری دلیری تھی۔ اس کے خلاف میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ ایسے سرکردہ آدمی کی گرفتاری سے پہلے مجھے اچھی طرح سوچ لینا چاہئے تھا۔ شہر والوں کے لئے حاجی کی گرفتاری ایک حیران کُن اور ناقابلِ یقین واقعہ تھا۔

مجھے بے غیرت کہہ لیں

تھانے میں پہنچ کر میں نے اُسے حوالات میں بند کر دیا۔ اُس نے مجھ پر رعب ڈالنے کی کوشش کی اور منت سماجت بھی کی اور مجھے بہت ساری رشوت بھی پیش کی۔ میں نے اس کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ اے۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ حاجی کے اُن دونوں نوکروں کو جو کتے باہر لے گئے تھے اور مالی اور اُس کی بیوی کو تھانے لے آتے اور انہیں تھانے تک ڈراتا رہے۔ انہیں کہے کہ حاجی گرفتار ہو چکا ہے اور اب وہ کبھی ان کا مالک نہیں بن سکے گا۔ وہ پھانسی کے تختے پر یا ساری عمر کے لئے جیل میں جا رہا ہے۔

میں نے تھانے کے تمام عملے کو اکٹھا کر کے کہا کہ حاجی کسی کو پیغام بھیجنے کے لئے یا کوئی اور کام کرانے کے لئے پیسے پیش کرے گا۔ اگر کسی نے حاجی کی کوئی درپردہ مدد کی اُسے میں اعانتِ جرم میں گرفتار کر لوں گا۔

ایک جوان اور اچھی شکل و صورت والا آدمی تھانے میں آیا اور اپنا تعارف کرایا۔ ”میں حاجی صاحب کا داماد ہوں۔ میرا نام ناصر ہے ۔۔۔ میں

حاجی صاحب کی بابت معلوم کرنے آیا ہوں۔ کیا تھانے سے انہیں ضمانت پر رہا کروایا جا سکتا ہے؟“

”یہ مشورہ کسی وکیل سے لینا تھا۔“

”میں نے آپ ہی سے پوچھنا بہتر سمجھا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”اگر غلطی کی ہے تو معافی چاہتا ہوں۔“

پولیس اور تھانے سے لوگ ڈرا کرتے ہیں۔ ناصر کے چہرے پر مجھے ڈر نظر نہ آیا۔ اس کا بولنے کا طریقہ اتنا پختہ تھا کہ اس کے متعلق سب جج نے مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ صحیح معلوم ہوا۔

”ناصر بھائی!“ ۔۔۔ میں نے اُسے کہا۔ ”حاجی صاحب کو میں نے دفعہ ۳۰۲ یعنی قتل کے جرم میں پکڑا ہے۔ اس کی ضمانت ہائی کورٹ سے بھی نہیں ہو سکے گی۔“ ۔۔۔ میں نے اُسے بٹھا لیا اور کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم دل سے نہیں چاہتے کہ حاجی ضمانت پر رہا ہو۔ تم اس لئے آئے ہو کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ داماد نے اپنے سسر کے واسطے کچھ نہیں کیا۔ تمہاری بیوی خوش ہو گی کہ اس کا باپ پکڑا گیا ہے۔“

وہ حیران سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔

”مجھے تمہاری ضرورت ہے ناصر!“ ۔۔۔ میں نے کہا۔ ”تم نے اچھا کیا ہے کہ خود ہی آ گئے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم جانتے ہو کہ سلیمان کو بھیڑیوں نے نہیں حاجی کے کتوں نے مارا ہے۔ تمہاری بیوی تو اور زیادہ اچھی طرح جانتی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

وہ تھوڑی دیر کے لئے میرے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔

”نہیں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں“ ۔۔۔ ناصر نے کہا۔ ”لیکن داماد اور سگی بیٹی حاجی صاحب کے خلاف گواہ بنے تو برادری اور دوسرے لوگوں میں ہماری کیا حیثیت رہ جاتے گی؟“

”گواہ نہیں بناؤں گا“ ۔۔۔ میں نے کہا۔ ”مجھے تمہاری گواہی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ تمہاری بیوی کو بھی میں گواہ نہیں بناؤں گا۔ تم دونوں مجھے

راستہ دکھاؤ۔ اگر کہو تو میں رات کو وردی کی بجائے پرائیویٹ کپڑوں میں تمہارے گھر آجاؤں گا۔"

"میں بیوی کے ساتھ بات کر لوں۔"

"ضرور کرو" — میں نے کہا — "لیکن یہ خیال رکھنا کہ مجھے کچھ نہ بتاؤ گے تو میں تمہیں شہادت چھپانے کے جرم میں گرفتار کر سکتا ہوں اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ اب تمہارا سسر تمہیں کسی بھی قسم کا نقصان پہنچانے کے واسطے باہر نہیں آسکے گا۔ اس کی غنڈہ گردی ختم ہو چکی ہے۔"

اُس نے اُسی وقت مجھے وہ بات سُنادی جو سب جج کے بھائی کو سُنا چکا تھا۔ مجھے یہ شخص آج تک یاد ہے۔ اُس کا چہرہ اور اُس کا ایک ایک لفظ یاد ہے۔ اس قسم کے آدمی معمولی قسم کے لوگ نہیں ہوا کرتے۔ ساری عمر یاد رہا کرتے ہیں۔ اُس نے سب جج کے بھائی کو اپنی بیوی کے متعلق اپنا جو رویہ سنایا تھا وہ آپ پڑھ چکے ہیں لیکن آپ اس رویے کو تصور میں نہیں لا سکتے۔ ناصر نے جب اپنا یہ رویہ مجھے سُنایا تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے سسر کے ڈر سے اپنی بیوی کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ نہیں کرتا تھا کہ اُس کے ساتھ جسمانی تعلق ختم کر کے اُس کی پرستش کر رہا تھا۔

"آپ مجھے ڈرپوک کہیں گے" — اُس نے مجھے کہا — "آپ مجھے بے غیرت بھی کہہ سکتے ہیں لیکن میں اس لڑکی کی دل سے قدر کرتا ہوں کہ اُس نے جس سے محبت کی، اُس کے مرنے کے بعد بھی اُسے زندہ رکھا اور اپنے خاوند کو دھوکے میں رکھنے کی بجائے یا خاوند کے ساتھ جھوٹی محبت کرنے کی بجائے اور چھُپ چھُپ کر آنسو بہانے کی بجائے خاوند کو دیانتداری سے کہہ دیا کہ میرا جسم تمہارا ہے، دل اور روح کہیں اور ہے۔ میں اپنے آپ کو غیرت مند سمجھتا ہوں کہ اس لڑکی کی وفا کا گلا نہیں گھونٹ رہا۔"

"کیا تم ساری عمر اپنی بیوی کے ساتھ یہی رویہ رکھو گے؟" — میں

نے کہا — "نہیں رکھ سکو گے ناصر! میں تمہیں ایک مشورہ دیتا ہوں۔ تمہارے سسر کو شاید سزائے موت نہیں ملے گی۔ عمر قید ضرور ملے گی۔ تم دوسری شادی کر لینا۔ اس طرح کیسے عمر کٹے گی یار!"

"سسر میرا آج مر جاتے ہیں اس کی بیٹی کو اسی طرح سینے سے لگائے رکھوں گا" — ناصر نے کہا — "میری ایک بات لکھ لیں۔ میں معمولی سا پڑھا ہُوا ہوں۔ میرے پاس کوئی اُلٹا سیدھا علم نہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ ناصر، تجھے تیرا اللہ صلہ دے گا۔ یہی لڑکی مجھے کہے گی، یہ لے ناصر! میرا دل اور میری رُوح، یہ سب تمہارا ہے۔"

میں نے بڑے عجیب عجیب لوگ دیکھے ہیں۔ تھانے میں جب کسی کو بلایا جاتا ہے تو وہ اور زیادہ عجیب ہو جاتا ہے لیکن ناصر جیسا آدمی میں نے ایک ہی دیکھا ہے۔ یہ ناصر ہی تھا۔ مجھے اس کی بیوی سے بھی ملنا تھا۔ تفتیش کے واسطے اُس کی ملاقات ضروری تھی۔ اُسی سے میں معلوم کر سکتا تھا کہ اُسے کس طرح پتہ چلا تھا کہ سلیمان کو حاجی نے کتوں سے مروا دیا ہے۔ یہ تو سرکاری ملاقات تھی۔ میں ویسے بھی اس لڑکی کے ساتھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ناصر سے کہا کہ وہ انکاری تو نہیں ہو جائے گی کہ اُسے کچھ بھی معلوم نہیں؟ ناصر نے کہا کہ وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ میں خود ہی اُس سے بات کر لوں۔

کتوں پر خون تھا

اس دوران حاجی کے دونوں نوکر، اس کا مالی اور مالی کی بیوی آ گئے تھے۔ میں نے ناصر کو گھر بھیج دیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ میں ان نوکروں اور مالی وغیرہ سے کہلوا سکتا تھا کہ سلیمان کو حاجی نے مروایا ہے لیکن ثبوت کیا پیش کروں گا۔ حاجی خود اقبال جرم کر لیتا تو بھی ثبوت اور شہادت کی ضرورت تھی۔ میں نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ دونوں نوکروں، مالی اور اُس کی بیوی کو حوالات کے سامنے لے گیا اور سلاخوں میں سے انہیں دکھایا کہ ان کا آقا حاجی حوالات میں بیٹھا ہے۔

حاجی مجھ کو دیکھ کر سلاخوں سے آلگا اور واہی تباہی بکنے لگا کہ میں نے اُسے بغیر کسی جُرم کے بند کر دیا ہے اور مجھے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ وہ چالاک اور عقل مند آدمی تھا۔ اپنے نوکروں کو دیکھ کر وہ مجھ پر رُعب کس رہا تھا۔ میں اکیلا ہوتا تو وہ منت سماجت کرتا اور مجھے رشوت پیش کرتا۔ اُس کے نوکروں نے اپنے مالک کو حوالات میں دیکھا تو اُن کے رنگ اُڑ گئے۔ میں نے حاجی کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔

نوکروں کو وہاں سے ہٹا کر ان سے کہا کہ تم نے اپنے مالک کو دیکھ لیا ہے۔ یہ سیدھا پھانسی کے تختے پر جا رہا ہے۔ یہ ضمانت پر رہا نہیں ہو گا۔ اب یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کے ڈر سے اگر اب بھی جھوٹ بولو گے تو اسی کے ساتھ بندھے جاؤ گے اور وہیں جاؤ گے جہاں یہ جا رہا ہے۔ سچ بولو گے تو فائدے میں رہو گے۔

میں مالی کو اپنے دفتر میں لے گیا اور دوسروں کو باہر بٹھا دیا۔ مالی ادھیڑ عمر تھا۔ میں نے اُس کے ساتھ باتیں کیں جن کا تعلق کیس کے ساتھ نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ ذہنی طور پر ہوشیار آدمی ہے۔ بڑی پختہ زبان میں بولتا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ خود ہی سچ بولے گا یا مجھے سچ بلوانا پڑے گا۔

"سچ کیوں نہیں بولوں گا حضور!"— اُس نے کہا —"لیکن مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں۔ میرا ان لوگوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اگر انہوں نے کچھ کیا ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں تو ان کے ساتھ نہیں تھا۔"

"کیا کیا ہے انہوں نے؟"— میں نے کہا —"مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ انہوں نے کوئی غلط حرکت کی ہے۔"

"یہی حضور!"— وہ گھبرانے لگا —"یہ کتوں اور بھیڑیوں کی کوئی بات تھی۔ چھوٹے تھانیدار صاحب ہمیں ساتھ لاتے تو کہتے رہے کہ منیم کو قتل کیا گیا ہے۔ تم لوگ سچ بولنا ورنہ رگڑے جاؤ گے۔ قرآن پاک کی قسم ہے حضور!..."

میرے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے اُس نے بتایا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ باغ میں رہتا ہے اور اُس کا مکان کتوں کے ڈربے کے قریب ہے اور رات کو کتوں کی ہلکی سی آواز بھی اُس کے مکان میں سنائی دیتی ہے۔

"اب یہ بتاؤ کہ جس رات منیم مارا گیا تھا اُس رات کُتے کس وقت باہر لے جاتے گئے تھے۔"

"صبح کے وقت"— اُس نے جواب دیا۔

میں نے اُس کی بیوی کو اندر بلایا اور اُس سے پُوچھا کہ اُس کے کتنے بچے ہیں۔ اُس نے تین بتاتے۔ ایک ابھی ایک سال کا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ اگر میں اُسے جیل میں بند کر دوں اور اُس کے بچے باہر روتے بلبلاتے اور بھوکے مرتے رہیں تو اُسے کیسا لگے گا؟ وہ ماں تھی، اُس کے چہرے پر اندر کے شدید درد کا تاثر آگیا اور اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی آگئی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ رہ سکتی ہے، شرط یہ ہے کہ جھوٹ نہ بولے۔

"مجھے بتاؤ اُس رات کُتے کس وقت ڈربے سے نکالے گئے تھے؟"

اُس کا خاوند بول پڑا —"میں کہہ رہا ہوں ناجی، صبح کے وقت"...

میں اُس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ وہ بنچ پر بیٹھا ہُوا تھا۔ میں نے اُس کے کان پر اتنی زور سے تھپّڑ مارا کہ وہ فرش پر جا پڑا۔ اُس کی بیوی سے کہا کہ وہ مجھے صحیح جواب دے۔

"کُتے رات کو ڈربے سے نکالے گئے تھے"— اُس نے خوف سے دبی ہوئی آواز میں کہا۔

ان لوگوں کے پاس گھڑیاں تو تھیں نہیں کہ میں صحیح وقت معلوم کرتا۔ وقت کا اندازہ کرنے کے لئے میں نے بہت سے سوال کئے تو پتہ چلا کہ مالی اور اُس کی بیوی ابھی سوتے ہی تھے کہ ان کی آنکھ کھُل گئی۔ مالی نے بیوی سے کہا کہ میں دیکھ آؤں کُتے کیوں شور کر رہے ہیں۔ مالی نے واپس جا کر بیوی کو بتایا کہ تاجا اور بشیرا چاروں کُتوں کو کہیں لے گئے ہیں۔

"اب تم بتاؤ" — میں نے مالی سے کہا — "حوالات میں بٹھا دوں؟" —
اُس کی آنکھیں مجھ پر اس طرح جم گئیں جیسے وہ مر گیا ہو۔ میں نے پوچھا — "وہ کتنی دیر بعد واپس آئے تھے؟"

"میرے حساب میں وہ دو گھنٹوں بعد آئے تھے" — اُس نے جواب دیا — "میں سو گیا تھا۔ کتوں کی آواز پر جاگا اور باہر نکل آیا۔ میرا خیال تھا کہ حاجی صاحب بھی شاید ساتھ ہوں۔ وہ رات کے شکار پر گئے ہوں گے لیکن حاجی صاحب ساتھ نہیں تھے۔"

"مجھے دو سوالوں کے جواب دو" — میں نے کہا — "واپس آکر انہوں نے کتوں کو نہلایا تھا؟ تمہیں انہوں نے کہا تھا کہ کسی کو بتانا نہیں کہ کتے باہر لے جائے گئے تھے؟ اس کے علاوہ اس معاملے میں جس کسی نے تمہیں کوئی بھی بات کہی ہو وہ بتا دو۔"

اُس نے جواب دیا کہ انہوں نے کتوں کو نہلایا تھا اور اُس نے بھی اُن کی مدد کی تھی۔ انہوں نے اُسے کہا تھا کہ حاجی صاحب کے سوا کسی کو نہ بتانا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ روشنی نہیں تھی۔ وہ اپنی لالٹین جلا کر باہر لایا تھا۔ کتوں کے مُنہ لال تھے۔ مالی نے اُسے شکار کا خون سمجھا تھا۔

"اگلے روز جب آپ باغ میں آئے تھے اُس وقت میں باغ کے اُس کونے میں کام کر رہا تھا" — اُس نے کہا — "حاجی صاحب آئے اور مجھے اور میری بیوی سے کہا کہ تھانیدار یا کوئی اور پُوچھے کہ کتے کس وقت باہر لے جائے گئے تھے تو کہنا کہ صبح کے اُجالے کے وقت۔"

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے حاجی سے پوچھا تھا کہ کتے باہر لے جائے گئے تھے تو وہ یہ کہہ کر دُوڑ پڑا تھا کہ نوکروں سے پُوچھ کر بتاتا ہوں۔ وہ زیادہ دیر لگا کر واپس آیا تھا۔ وہ مالی اور اُس کی بیوی کو ہدایات دیتا رہا تھا۔

اب مالی نے اس کی تصدیق کر دی اور اس نے یہ بھی بتا دیا کہ حاجی صاحب نے اسے پچاس روپے انعام دیا تھا۔ اسے آج کل کے پانچ سَو روپے

سمجھیں۔ انعام کے ساتھ اسے حاجی صاحب اور دونوں نوکروں کی طرف سے بڑی خوفناک دھمکیاں بھی ملی تھیں۔

سلیمان اور چھوٹی بیگم پر شبہ

دونوں نوکروں میں سے میں نے تاجے کو بُلایا۔ مالی اور اُس کی بیوی کو باہر بٹھا دیا۔ اُس نے بھی حاجی کو حوالات میں دیکھا تھا۔ اُس کا دم خم ٹوٹ چکا تھا۔ مجھے زیادہ سوال جواب نہ کرنے پڑے۔ اُس نے کہا کہ ہم تو حکم کے بندے ہیں۔ جو حکم ملا وہ پورا کیا اور انعام لے لیا۔ آدمی تو ہمارے ہاتھوں مروایا گیا ہے۔ اب مریں گے تو ہم مریں گے، حاجی صاحب دے دلا کر بری ہو جائیں گے۔

مجھے اس شخص پر رحم نہ آیا۔ وہ سزا یافتہ تو نہیں تھا لیکن پکا بدمعاش تھا۔ اپنے متعلق اُس نے سب کچھ بتا دیا۔ حاجی کی ساری کرتوت بتائی۔ شہر کی جن عورتوں کے ساتھ حاجی کے تعلقات تھے اُن کے نام بتاتے اور جو غنڈے بدمعاش اور عادی مجرم حاجی کے ہاتھ میں تھے وہ بھی بتاتے اور اُس نے سلیمان کے قتل کی کہانی اس طرح سُنائی کہ واردات سے ایک روز پہلے حاجی نے اُسے اور بشیرے سے کہا کہ منیم کو وہ ایک رات اُن کے ساتھ یہ کہہ کر بھیجے گا کہ تم تینوں رات کو کتے لے کر فلاں گاؤں کو روانہ ہو جاؤ اور حاجی صبح آئے گا۔ وہاں فلاں آدمی کے ساتھ شکار کو جائیں گے۔ راستے میں تاجا اور بشیرا کتوں کو منیم کے پیچھے ڈال دیں گے اور اُسے مروا دیں گے۔

دوسرے دن حاجی نے پھر تاجے، بشیرے اور منیم کو بُلا کر اُس گاؤں کا اور گاؤں کے ایک آدمی کا نام بتا کر کہا — "رات کھانا کھا کر تم تینوں چاروں کتوں کو ساتھ لے کر چل پڑنا اور اُس آدمی کے گھر پہنچ جانا۔ وہ تمہارے انتظار میں ہوگا۔ تم دو سوا دو گھنٹوں میں پہنچ جاؤ گے۔ باقی رات وہاں آرام کرنا۔ میں صبح مُنہ اندھیرے آجاؤں گا۔ اُس آدمی کے ساتھ ہرنوں کے شکار کے لئے جانا ہے۔"

تاجے نے بیان دیتے ہوئے کہا:

"منیم سلیمان نے ہنس کر کہا کہ حاجی صاحب! میں کبھی شکار پر نہیں گیا۔ مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جاتے۔ حاجی صاحب نے اُسے بڑی محبت سے کہا کہ سلیمان! اب میں ہر جگہ تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ گھر کا اور دکان کا کاروبار تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تمہارا حق ہے کہ کھیل کُود میں بھی تمہیں ساتھ رکھوں ....

"سلیمان بہت خوش ہُوا کہ حاجی صاحب اُس پر اتنے زیادہ مہربان ہو گئے ہیں۔ حاجی صاحب اُس پر پہلے ہی بہت مہربان تھے۔ ہم نے حاجی صاحب کے بڑے خطرناک کام کئے ہیں اور ان کا ہر راز ہمارے پاس ہے لیکن مجھے اور بشیرے کو حاجی صاحب کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہونے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ صرف سلیمان تھا جو ان کے گھر جب چاہتا چلا جاتا اور جتنی دیر چاہتا وہیں رہتا تھا۔ وہ حویلی کے ہی ایک کمرے میں رہتا تھا جس کا دروازہ گلی میں کُھلتا تھا اور ایک دروازہ اندر کی طرف تھا....

"نہ مجھے معلوم ہے نہ بشیرے کو کہ سلیمان کا قصور کیا تھا۔ بس اُسے کُتوں سے مروانا تھا۔ میرا خیال ہے کہ سلیمان اور اپنی چھوٹی بیگم پر حاجی صاحب کو شبہ ہو گیا تھا۔ ان کی چھوٹی بیگم جوان ہے۔ سلیمان بڑا خوبصورت جوان تھا۔ یہی وجہ ہو سکتی تھی۔ ویسے تو سلیمان بڑا شریف اور برخوردار نوجوان تھا ... شام کو ہم نے سلیمان کو اپنے ساتھ روٹی کھلائی اور گپ شپ لگاتے رہے سلیمان ہم سے پوچھتا رہا کہ شکار پر کیا ہوتا ہے۔ میں اور بشیرا اس انتظار میں تھے کہ لوگ سو جائیں اور پیدل سفر کرنے والوں کا وقت گزر جائے....

"کُتوں کے رکھوالے ہم دونوں ہیں۔ شام کو ہم نے کُتوں کو کھانے کے لئے کچھ نہیں دیا تھا۔ جس طرح بھوک سے انسان کو غصہ آتا ہے اسی طرح کُتے بھوکے ہوں تو مالکوں کو بھی کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ حاجی صاحب کے کُتے بڑے خونخوار ہیں۔ کوئی اجنبی انہیں ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ ہم سلیمان کو ساتھ لے کر چل پڑے اور ایسی باتیں کرتے گئے جن سے سلیمان بہت خوش

ہوتا تھا۔ ہم اُسے باغ میں نہ لے گئے۔ باہر باہر سے آگے نکل گئے سلیمان سے کہا کہ وہ آگے چلتا چلے اور ہم کُتے لے آتے ہیں۔ اُسے کچھ بھی شک نہ ہُوا۔ چلتا گیا اور میں اور بشیرا باغ میں چلے گئے اور کُتے لے آتے ....

"یہ کُتے میرے اور بشیرے کے اشاروں پر کام کرتے ہیں ہم سلیمان تک پہنچ گئے۔ اُسے کہا کہ چلو ذرا دوڑ لگائیں، کُتے سُست ہو گئے ہیں۔ ہم دونوں نے دو دو کُتے پکڑے ہوئے تھے۔ کُتے بھوکے تھے اس لئے بے چین اور بے قابو ہو رہے تھے۔ ہم دوڑے اور سلیمان تین چار قدم آگے ہو گیا۔ بوہلی (بُل ڈاگ) بشیرے کے پاس تھا۔ اُس نے کُتے کو سلیمان کی طرف اشارہ دیا اور مُنہ سے ایک مخصوص آواز نکالی۔ اُس نے کُتے کی زنجیر پٹے سے الگ کر دی۔ خونخوار کُتا دوڑا اور سلیمان کی ران مُنہ میں لے لی۔ سلیمان چیخنے چلّانے لگا۔ میں نے کہا بھاگو سلیمان کھڑے نہ رہو.... یہ میں نے اس لئے کہا تھا کہ وہ بھاگے گا تو کُتے اسے شکار سمجھ کر اس پر ٹوٹ پڑیں گے ....

"اُس نے بھاگنے کی کوشش کی تو ہم نے باقی تین کُتوں کو بھی چھوڑ دیا۔ بوہلی کُتا پہلے ہی سلیمان کو پکڑے ہوئے تھا۔ باقی کُتوں نے اُسے شکار سمجھا اور کچھ دیر بعد چاروں نے سلیمان کی وہ حالت کر دی جو آپ نے دوسرے دن جا کر دیکھی۔ ہم نے کُتوں کو بڑی ہی مشکل سے زنجیریں ڈالیں۔ یہ تو سلیمان کو کھا رہے تھے۔ حاجی صاحب نے کہا تھا کہ کام صحیح ہو جائے تو واپس آ کر کُتوں کو نہلا دینا تاکہ خون کا نشان باقی نہ رہے۔ ہم نے واپس لا کر پہلے کُتوں کے آگے دُودھ رکھا پھر کھانے کے لئے دیا۔ انہیں چین آ گیا تو مالی کو ساتھ لے کر انہیں خوب نہلایا۔"

"ایک بات بتاؤ" میں نے اپنی عقل کا امتحان لینے کے لئے کہا ——— "دوسرے دن جب میں لاش کے قریب سے کھُرے اور کُتوں کے پنجوں کے نشان دیکھتا دیکھتا باغ کی طرف جا رہا تھا تو تم دونوں باغ میں چلے گئے اور وہاں سے مویشی کھول کر اسی راستے پر انہیں ہانک لائے تھے۔ کیا تمہیں

حاجی نے کہا تھا کہ دوڑ کر جاؤ اور مویشیوں کو ادھر لاؤ؟"

"ایسے ہی ہُوا تھا"۔ اُس نے جواب دیا۔ "حاجی صاحب آپ کو دیکھ رہے تھے۔ ہم تماشائیوں میں کھڑے تھے۔ انہوں نے بشیرے کے کان میں کہا تھا کہ باغ میں جاؤ اور مویشی کھول کر اس راستے پر لے آؤ اور آگے ندی میں لے جانا تاکہ کوئی شک نہ ... ہے ... جناب! حاجی صاحب کو اللہ نے ہم سب سے زیادہ عقل دی ہے۔"

میری رائے یہ ہے کہ عقل اللہ کا بہت بڑا انعام ہے لیکن اس میں خطرے بھی ہیں۔ بعض آدمی اپنے آپ کو اتنا عقلمند سمجھ لیتے ہیں کہ اپنے ہر ... ر اپنی ہر بات کو صحیح کہتے ہیں۔ ایسے آدمی اکثر نقصان اُٹھاتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جنہیں خدا عام انسانوں کی نسبت زیادہ عقل دے دیتا ہے اور وہ عقل کو ... ائی کاموں میں استعمال کرتے ہیں۔ ایک نہ ایک دن یہی عقل ان کو دھوکہ ... اگر آتی ہے جیسے سپاہی گرینیڈ پھینکنے لگے تو پھینکنے سے پہلے ہی گرینیڈ اس کے ... پنے ہاتھ میں پھٹ جاتے۔

میں تنہائی میں اُسے شہزادہ کہتی ہوں

بشیرے کو بُلایا۔ اُس نے مجھے بھٹکانے کی کوشش ... میں نے صرف دو باتیں کیں تو اُس نے سر جھکا لیا، پھر اُس نے بیان دے دیا۔ معمولی سی دو تین باتوں کے سوا اُس کا بیان تاجے کے بیان سے ملتا تھا۔ ان دونوں کو میں نے حراست میں لے لیا لیکن حاجی سے بات کرنے سے پہلے میں نے اُس کی بیٹی (ناصر کی بیوی) سے ملنا ضروری سمجھا۔ مجھے مقدمہ مضبوط کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ چاہئے تھا۔ شام کا اندھیرا گہرا ہوگیا تھا۔ میں نے وردی اُتاری۔ اپنے کپڑے پہنے اور ناصر کے گھر چلا گیا۔

ناصر کی بیوی میرے سامنے آگئی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ ناصر کے بغیر میرے ساتھ بات کرے گی؟ وہ تیار ہوگئی اور ناصر اُسے میرے پاس چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ وہ صحیح معنوں میں خوبصورت لڑکی تھی لیکن اُداس۔

"ناصر نے تمہیں بتا دیا ہوگا کہ حاجی صاحب حوالات میں بند ہیں"—— میں نے کہا۔ "اس کا تمہیں ضرور افسوس ہوگا۔ اگر مقدمہ ثابت ہوگیا تو ضروری نہیں کہ انہیں سزائے موت ہو۔ ہو سکتا ہے عمر قید بھی نہ ہو کیونکہ قتل کرنے والے دوسرے ہیں۔"

"اگر میرے باپ کو سزائے موت نہ ہوئی تو مجھے افسوس ہوگا"—— اُس نے کہا۔ "کیا آپ کے قانون میں ایسی سزا نہیں کہ قاتل نے جس طرح کسی کو قتل کیا ہے اُسے اسی طرح موت کی سزا دی جائے؟ میرے باپ کو آپ اس کے کتوں سے اسی طرح نہیں مروا سکتے جس طرح اس نے سلیمان کو مروا دیا ہے؟" اُس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ کہنے لگی۔ "میں اپنے باپ کی لاش کے ٹکڑے دیکھنے کو بے چین ہوں۔"

میں نے کچھ باتیں کر کے اُس کے جذبات کی تسکین کی۔ مجھے فائدہ یہ ملا تھا کہ اس کے جذبات سے میں پہلے ہی واقف ہو چکا تھا۔ اس کے مطابق باتیں کر کے میں نے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس میں ذرا جھجک رہ گئی تھی وہ بھی ختم ہوگئی۔

"تمہیں کس طرح پتہ چلا تھا کہ تمہارے باپ نے سلیمان کو کتوں سے مروایا ہے؟"

اُس نے بڑی لمبی آہ بھری اور کہنے لگی۔ "ناصر نے بتایا ہے کہ اس نے آپ کو ساری باتیں بتا دی ہیں۔ میرے اور اس کے جو تعلقات ہیں وہ بھی اس نے آپ کو بتا دیئے ہیں۔ یہ شخص اگر مجھے کہے گا کہ جلتے ہوئے تنور میں کھڑی ہو جاؤ تو خدا کی قسم میں تنور میں کھڑی ہو جاؤں گی، مسکراؤں گی، سی نہیں کروں گی۔"

"لیکن اس وقت تو وہ تمہارے کہنے پر جلتے تنور میں کھڑا ہے"—— میں نے کہا۔ "وہ مسکرا رہا ہے۔ سی نہیں کر رہا ... یہ بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے سلیمان کے قتل کی بات ہو جائے تو اچھا ہے۔"

"میں کہہ رہی تھی کہ ناصر آپ کو ہماری ازدواجی زندگی کے متعلق سب

کچھ بتا چکا ہے۔" اُس نے کہا — "میرا باپ جس طرح سلیمان کا دشمن ہوا تھا، یہ ساری کہانی مجھے سنانی پڑے گی۔ میں نے خود تو سلیمان کو قتل ہوتے نہیں دیکھا۔ سلیمان ہمارے گھر میں آیا تو معصوم اور بڑا ہی بھولا سا لڑکا تھا...

"میرے باپ نے مجھے اور میری امّی کو بتایا کہ یہ یتیم ہے اور اپنے چچا کے ظلم سے بھاگ آیا ہے۔ سلیمان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نہیں بتا سکتی کہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ اگر میرا باپ اور امّی وہاں نہ ہوتے تو میں سلیمان کے آنسو اپنے دوپٹے سے صاف کر دیتی۔ میرے دل سے آواز آئی کہ یہ لڑکا میرا ساری عمر کا ساتھی ہے....

"میرا دل شاید کمزور تھا۔ میرے دماغ میں بہت سے خیال آئے۔ ایک میں تھی کہ باپ اور ماں کا سارا پیار صرف مجھے ملا تھا اور ایک یہ خوبصورت لڑکا تھا جس سے پیار چھین لیا گیا تھا۔ ایک میں تھی جو اپنی بڑی امیرانہ حویلی میں رہتی تھی اور ایک سلیمان تھا جس کا کوئی گھر گھاٹ ہی نہ تھا۔ آپ ان باتوں کو سمجھتے جانتے ہوں گے۔ میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ میں سلیمان کی رُوح بن گئی یا اُس کی رُوح میرے جسم میں آ گئی....

"سلیمان کو ابّو نے ایسی نوکری دے دی کہ وہ آجاتا تھا اور دکان پر بھی کام کرتا تھا۔ ابّو نے اُسے حویلی کا ہی ایک کمرہ دے دیا۔ سلیمان نے جب اچھے کپڑے پہنے، اُسے اچھا کھانے کو ملا اور میرے باپ کا، میری ماں کا اور میرا پیار مل گیا تو اُس کا رنگ روپ کھل اُٹھا۔ میں نے اُسے شہزادہ کہنا شروع کر دیا۔ سب کے سامنے اُسے سلیمان کہتی تھی اور اکیلے شہزادہ۔"

"اُس کے ساتھ تنہائی کی ملاقاتیں فوراً شروع ہو گئی تھیں؟"

"فوراً ہی سمجھ لیں" — اُس نے کہا — "وہ ڈرتا تھا۔ کہتا تھا یہ امانت میں خیانت ہے۔ میں نے اُس کا ڈر دُور کر دیا تھا۔ ہمارا پیار پاک تھا۔ میں تو اتنی دلیر ہو گئی تھی کہ کبھی کبھی رات کو جب سب سو جاتے تھے، میں اُس کے کمرے میں چلی جاتی تھی۔ وہ ایمان کا پکا تھا۔ پہلے تو وہ ڈرتا رہا۔ جب اُس کے دل

میں محبت پیدا ہوئی تو وہ ایمان کا اور زیادہ پکا ہو گیا۔ آپ شاید اس محبت کا مطلب نہیں سمجھ سکتے۔"

میں اس لڑکی کی باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دے رہا تھا۔ میں اس کے لہجے اور انداز کو دیکھ رہا تھا۔ یہ لڑکی یقیناً نارمل نہیں تھی۔ وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں اور آہستہ آہستہ اس طرح بول رہی تھی جیسے وہ اکیلی بیٹھی اپنے آپ کے ساتھ باتیں کر رہی ہو۔ اگر میں صحیح بیان کر رہا ہوں تو آپ اس طرح سمجھ لیں کہ ہم تصور بناتے ہیں اور اسے دیکھتے ہیں لیکن اس لڑکی کو تصور فلم کی طرح نظر آ رہا تھا اور بول بھی رہا تھا اور وہ لطف حاصل کر رہی تھی۔

میں اشارہ سمجھ گئی

وہ اسی لہجے اور انداز سے سُناتی رہی۔ وہ اور سلیمان صحیح معنوں میں جسم اور رُوح بن گئے۔ ایک روز حاجی نے اپنی بیٹی سے کہا کہ اُسے پتہ چلا ہے کہ وہ سلیمان کے کمرے میں جاتی ہے اور سلیمان اُسے تنہائی میں ملتا ہے۔ بیٹی نے بڑی دلیری اور خود اعتمادی سے کہا — "آپ نے جو کچھ سُنا ہے وہ غلط نہیں لیکن آپ کی عزت پر حرف نہیں آئے گا۔ سلیمان نمک حرام نہیں۔"

باپ اُس روز تو چُپ ہو گیا، تین چار دنوں بعد لڑکی کو ماں نے کہا — "تمہارے ابّو پریشان ہیں کہ تم سلیمان کو اپنا نوکر نہیں سمجھتیں اور تم نے اُسے کوئی اور ہی درجہ دے دیا ہے۔"

بیٹی نے ماں کو صاف کہہ دیا کہ سلیمان کو ملے بغیر نہیں رہ سکتی اور خاندان کی عزت کا اُسے پورا احساس ہے۔ ماں نے دنیا دیکھی تھی۔ وہ بیٹی کا مطلب سمجھ گئی اور بیٹی کو سمجھانے لگی کہ اس محبت کا انجام وہ نہیں ہو گا جو اُس نے سوچ رکھا ہے۔ بیٹی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں باپ کے پیار نے اُسے خودسر بھی بنا دیا تھا۔ اُس نے ماں کو تسلی دی لیکن اس کی نصیحت پر

توجہ نہ دی۔

"پانچ چھ سال گزر گئے تھے" لڑکی نے مجھے بتایا ۔۔۔ "اب نہ مجھے کسی کی نصیحت کی پرواہ تھی نہ سلیمان کو۔ میں نے سلیمان سے کہہ دیا تھا کہ میرے باپ نے تمہیں نوکری سے نکالا تو سمجھ لو کہ اس نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں تمہارے ساتھ نکل چلوں گی۔ اب سلیمان ہوشیار ہو گیا تھا۔۔۔ ایک روز سلیمان نے مجھے بتایا کہ چھوٹی بیگم نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ تین سال پہلے میرے باپ نے دوسری شادی کی تھی۔ اس دوسری بیگم کی عمر اب پچیس چھبیس سال ہے۔ میرے باپ کی عمر آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس جوان عورت نے سلیمان کو اپنے کمرے میں بلایا۔ سلیمان نے مجھے بتایا کہ میری سوتیلی ماں نے اسے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کی لیکن سلیمان اس کے ہاتھ نہ آیا۔۔۔

"اس کے بعد میری سوتیلی ماں جو اپنے آپ کو چھوٹی بیگم کہلاتی تھی میری اور سلیمان کی دشمن ہو گئی۔ میں سلیمان سے ملتی رہی۔ ہم اکیلے بیٹھتے تو دنیا کو اور تمام خطروں کو بھول جایا کرتے تھے۔ دو تین مہینے پہلے باپ نے میری منگنی کر دی۔ میں نے ناصر کو جو میرا منگیتر تھا ایک عورت کی زبانی پیغام بھیجا کہ میں اسے قبول نہیں کروں گی۔ بہتر ہے کہ وہ میرا رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دے ورنہ وہ ساری عمر کے لئے خوشیوں سے خالی رہ جائے گا۔

یہاں سے ہمارے لئے حالات بہت خراب ہو گئے۔ چھوٹی بیگم میرے باپ کو میرے اور سلیمان کے خلاف بھڑکاتی رہتی تھی۔ مجھے پتہ چلا کہ ناصر نے کہیں کہہ دیا تھا کہ وہ میرے ساتھ شادی نہیں کرے گا لیکن میرے باپ نے اسے دھمکی دے کر میرے ہی رشتے پر قائم رکھا۔"

اس عجیب و غریب لڑکی نے بڑی لمبی کہانی سنا دی جو مختصر الفاظ میں اس طرح ہے کہ اس نے اپنے باپ سے کہہ دیا کہ وہ ناصر کے ساتھ شادی نہیں کرے گی۔ ادھر سوتیلی ماں نے حاجی کو لڑکی کے خلاف پہلے سے زیادہ بھڑکانا شروع کر دیا۔ حاجی اب چھوٹی بیگم کی زیادہ سنتا تھا اور لڑکی

کی ماں یعنی پرانی بیوی کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا۔ سلیمان نے ایک روز لڑکی کو بتایا کہ رات کو جب سب سو گئے تھے چھوٹی بیگم اس کے کمرے میں چلی گئی اور اسے کہا کہ تم میری محبت اور دوستی کو قبول کر لو اور حاجی کی بیٹی کے ساتھ تعلق توڑ دو۔ سلیمان نے کمرے سے بھاگ کر اس سے جان چھڑائی۔

قتل سے دس بارہ دن پہلے حاجی نے اپنی بیٹی سے کہا ۔۔۔ "سلیمان کا خیال دل سے نکال دو۔ یہ بدمعاش بنتا جا رہا ہے۔ اس نے چھوٹی بیگم کی عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سدھرتا ہے یا نہیں۔ میں اسے موقعہ دے رہا ہوں۔"

لڑکی کو غصہ آ گیا۔ اس نے کہا ۔۔۔ "آپ اسے نوکری سے جواب دے دیں۔ وہ کہیں اور چلا جائے گا۔ آپ اپنی چھوٹی بیگم کو سنبھالیں۔ وہ سلیمان کی عزت پر ہاتھ ڈال رہی ہے ۔۔۔۔ اور میں آپ کو ایک بار پھر بتا رہی ہوں کہ میں ناصر کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔"

اس پر باپ بیٹی میں بہت جھگڑا ہوا۔ باپ نے بیٹی سے کہا ۔۔۔ "تم ایک یتیم اور غریب کا خون میرے ہاتھوں کرانا چاہتی ہو۔ میں اس سلیمان کو کتوں سے پھڑواؤں گا۔"

لڑکی نے مجھے بیان دیتے ہوئے کہا ۔۔۔ "میں اسے دھمکی سمجھتی رہی۔ اگر ذرا سا بھی شک ہوتا تو میں سلیمان کو گھر سے بھگا دیتی۔ تھوڑے سے ہی دن گزرے تھے کہ ایک صبح اطلاع ملی کہ سلیمان کو بھیڑیوں نے چیر پھاڑ دیا ہے۔ میری جو حالت ہوتی اس کا آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ میری امی بھی اس روز روتی رہی تھی۔ چھوٹی بیگم مسکراتی اور ہنستی رہی۔ دن کے وقت وہ میرے پاس آئی اور نرم سی آواز میں اس نے مجھے کہا ۔۔۔ 'دیکھ لیا تم نے؟ اپنی ماں سے کہنا میرے خلاف زبان بند کر لے ورنہ ماں بیٹی اسی طرح چیری پھاڑی جاؤ گی۔ میں کتوں کو بھیڑیئے بنا سکتی ہوں'۔۔۔۔

"میں اس کا اشارہ سمجھ گئی۔ یہ تو میں پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ سلیمان کو کتوں سے مروایا گیا ہے۔ چھوٹی بیگم نے اس کی تصدیق کر دی۔ پھر

مجھے چُپ لگ گئی۔ میں نے اپنے باپ سے کچھ بھی نہ کہا اور اسی خاموشی میں میری شادی ہو گئی۔"

دوسری بیوی، جوان بیٹی

ناصر کے ساتھ شادی کر کے اس کا جو رویہ رہا وہ آپ ناصر کے بیان میں پڑھ چکے ہیں۔ اب وہ ناصر کو اپنا پیرومُرشد سمجھتی تھی۔ اس کے بیان سے مجھے اس کی اور سلیمان کی پاک محبت کا ثبوت ملا۔ ایسی کوئی بات نہ ملی جو میرا مقدمہ مضبوط کرتی۔ یہ تصدیق ہوتی کہ حاجی نے سلیمان کو کتوں سے مروایا ہے۔ کسی گواہ کے یہ الفاظ کہ قاتل نے اُسے کہا تھا کہ فلاں کو قتل کر دوں گا، قاتل کو سزا نہیں دلا سکتے۔

میں ناصر کے گھر سے نکلا تو رات بہت گزر گئی تھی۔ میری توجہ اس پر ہونی چاہیئے تھی کہ مقدمہ کس طرح مضبوط کروں۔ موقعہ کا کوئی گواہ نہیں تھا۔ کوئی آلۂ قتل نہ تھا۔ کتوں کو شہادت کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تاجے اور بشیرے کے اقبالِ جرم میں یہ خطرہ تھا کہ وہ سیشن کورٹ میں جا کر اپنے بیانات سے منحرف ہو سکتے تھے لیکن میں جذبات میں اُلجھا ہوا تھا۔ میرے دل اور دماغ پر یہ لڑکی چھائی ہوئی تھی۔ چھوٹی بیگم بھی عورت ہی تھی۔ اُسے حاجی نے پہلے بتا دیا ہو گا کہ وہ سلیمان کو کس طرح مروائے گا۔ مجھے خیال آیا کہ انسان کا دل سمندر کی طرح گہرا ہوتا ہے اور کسی کے دل کا حال کوئی نہیں جان سکتا۔ مجھے پنجابی کا ایک مصرع یاد آیا ——

دل دریا سمندروں ڈونگھے کون دلاں دیاں جانے ہُو

میں نے رات دو بجے حوالات سے حاجی کو نکالا اور اپنے دفتر میں لا بٹھایا۔ اُس کا سر ڈول رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں نہ بند تھیں۔ اُس نے مری ہوئی آواز سے کہا۔ "جتنی رقم کہو گے دوں گا۔ کچھ اور بھی مانگو۔"

"کیوں اتنی رقم ضائع کرتے ہیں آپ حاجی صاحب!" —— میں نے

کہا —— "پھر ثابت کر دیں کہ آپ نے سلیمان کو اپنے کتوں سے نہیں مروایا۔ میں ابھی آپ کو چھوڑ دوں گا۔" اُس کی حالت دیکھ کر میں نے کہا —— "قتل کے بعد قاتل کی یہی حالت ہو جایا کرتی ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کو سنا دوں کہ آپ نے سلیمان کو کیوں اور کس طرح قتل کرایا ہے۔ کرائے کے قاتل اور نوکر قتل کرنے تک ساتھ دیا کرتے ہیں۔ معاملہ جب تھانے میں آتا ہے تو یہ لوگ اپنی جان چھڑانے کے لئے اپنے مالک کو سامنے کھڑا کر دیا کرتے ہیں۔ میرے پاس چار اقبالِ جرم اور آدھی درجن گواہ آ گئے ہیں۔ آپ بیان نہ دیں۔"

اُس نے بولنا شروع کر دیا۔ وہ جو کچھ بیان کر رہا تھا وہ مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا۔ میں نے اُس سے بہت ساری باتیں پوچھیں اور یہ بھی پوچھا کہ اُس نے کسی اور طریقے سے سلیمان کو کیوں نہ مروا دیا، کتوں سے مروانے کی کیا ضرورت تھی۔

"اُس نے میری دوسری بیوی پر دست درازی کی تھی" —— اُس نے کہا —— "اور اُس نے میرا نمک کھاتے ہوئے میری بیٹی کے ساتھ بھی نازیبا دوستی لگا رکھی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ اسے بڑی خوفناک سزا دوں گا۔ اچانک کتوں کا خیال آ گیا۔ میں نے غصے کی حالت میں اُسے کتوں سے مروانے کا طریقہ سوچا تھا۔ میں نے اس پر غور کیا تو یہ سکیم میرے ذہن میں تیار ہو گئی کہ اُسے کتوں سے مروا کر مشہور کر دوں گا کہ اسے بھیڑیوں نے ہلاک کیا ہے۔ میں نے سلیمان پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں اُس سے خفا ہوں۔ اسی واسطے وہ میرے جال میں آ گیا۔"

حاجی، تاجے اور بشیرے سے میں نے مجسٹریٹ کے سامنے بیان دلا دیئے اور انہیں جیل کی حوالات میں بھیج دیا لیکن مقدمہ تیار کرنے کے لئے میرے ہاتھ خالی تھے۔ میں نے موقعہ کے دو گواہ پیدا کر لئے اور باقی خانے جو خالی تھے وہ بھی پُر کر لئے۔ ملزم کو سزا دلانے کے لئے پولیس کو کچھ چکر بازی کرنی پڑتی ہے۔ وہ میں نے بھی کی اور چالان عدالت میں پیش کر دیا۔

کیس مجسٹریٹ سے ہو کر سیشن کورٹ میں پہنچا۔ مجھے ایسی سزاؤں کی توقع نہیں تھی جو سیشن جج نے دیں۔ سرکاری وکیل قابل تھا۔ اُس نے ثابت کر دیا کہ مجرم

نمبر ایک حاجی ہے۔ اُس کے بعد نوکروں کا درجہ آتا ہے۔ سیشن کورٹ نے ناجے اور بشیرے کو عمر قید دی اور حاجی کو سزائے موت دے دی۔ سیشن جج انگریز تھا۔ اُس نے فیصلہ بڑا اچھا اور مدلّل لکھا تھا۔ اُس نے یہ بھی لکھا کہ سزا حاجی جیسے لوگوں کو سب سے زیادہ ملنی چاہیئے جن کے پاس دولت ہے اور وہ اپنے نوکروں اور جرائم پیشہ لوگوں کو بے دریغ انعام و کرام اور نوکری سے نکال دینے کی دھمکی دے کر جسے چاہیں قتل کرا دیتے ہیں۔

ہائی کورٹ نے حاجی کی اپیل مسترد کر کے سزائے موت بحال رکھی۔

داستان دو دوستوں کی

جوان بیوی کا بوڑھا خاوند قتل ہو جاتے تو ذہن میں پہلا سوال یہ آتا ہے — "کیا اس بوڑھے کا پہلی بیوی سے کوئی بیٹا جوان ہے؟" — اور اگر سوتیلی ماں قتل ہو جائے تو بھی شک پہلی بیوی کے بیٹوں پر ہوتا ہے۔

ہندوستان کے ایک شہر نما قصبے کی ایک واردات سناتا ہوں۔ رات کے دو بجے مجھے جگا کر بتایا گیا کہ قتل کا ایک کیس آیا ہے۔ بوڑھے خاوند کی جوان بیوی قتل ہو گئی ہے اور رپورٹ دینے خاوند اور اُس کا جوان بیٹا آیا ہے۔ میں تھانے گیا۔ وہاں دو آدمی بیٹھے تھے۔ ایک کی عمر تقریباً پچاس سال تھی۔ دوسرا ستائیس اٹھائیس سال کا تھا۔ وہ باپ بیٹا تھے اور چہروں سے معزز خاندان کے لگتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے محلے کا ایک معزز آدمی تھا جسے میں جانتا تھا۔

باپ کو آپ اُس کے اصل نام کی بجائے اللہ بخش اور اُس کے جوان بیٹے کو اشرف کہہ لیں۔ اللہ بخش نے بتایا کہ وہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اُسے ایک چیخ سنائی دی۔ اُس نے اپنے ساتھ والے پلنگ پر دیکھا۔ اُس کی بیوی پلنگ پر نہیں تھی۔ اللہ بخش کو ڈیوڑھی میں کچھ ہلکا سا شور اور قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھولنے لگا تو ڈیوڑھی والی چٹخنی چڑھی ہوئی تھی۔ ڈیوڑھی کے دائیں اور بائیں دو کمرے تھے۔ دونوں کا ایک ایک دروازہ اندر کی طرف اور ایک ایک ڈیوڑھی میں کھلتا تھا۔

اللہ بخش نے اس کمرے میں روشنی دیکھی۔ ہاتھ لگایا تو کواڑ کھل گئے۔ اتنی دیر میں اُس کا بیٹا اشرف آ چکا تھا۔ باپ بیٹا کمرے میں گئے۔ وہاں فرش پر اللہ بخش کی بیوی پڑی تھی۔ سر سے خون اتنا بہہ گیا تھا کہ دروازے تک

چلا گیا تھا۔ اس کمرے کا ڈیوڑھی میں کھلنے والا دروازہ کھلا تھا۔ ڈیوڑھی میں جا کے دیکھا۔ باہر والا دروازہ بھی کھلا تھا۔

مقتولہ کی عمر تیئیس چوبیس سال تھی۔ وہ پچاس سالہ اللہ بخش کی دوسری بیوی تھی۔ اشرف اللہ بخش کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اس کی عمر بتا چکا ہوں۔ ستائیس اٹھائیس سال تھی۔ میں جان گیا کہ بوڑھے خاوند کی جوان بیوی اور جوان بیٹے کا ڈرامہ کھیلا گیا ہے جو صدیوں سے کھیلا جا رہا ہے مگر کوئی عبرت حاصل نہیں کرتا۔

باقی باتیں تو بعد میں معلوم کرنی تھیں۔ سب سے پہلے موقعۂ واردات پر پہنچنا تھا۔ اللہ بخش یہ دیکھ آیا تھا کہ اس کی بیوی مر چکی ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ جب میں موقعہ دیکھنے جا رہا تھا تو ان سے مزید باتیں پوچھتا گیا۔ مقتولہ زیورات کی شوقین تھی۔ اس کے کانوں میں بڑے سائز کے جھمکے رہتے تھے۔ بازوؤں میں سونے کے دو وزنی کڑے اور انگلیوں میں دو انگوٹھیاں رہتی تھیں۔ گلے میں زنجیر اور پان کے پتے کی شکل کا لاکٹ ہوتا تھا۔ لاش کے ساتھ ان زیورات میں سے کوئی ایک بھی چیز نہیں تھی۔ اللہ بخش نے یقین کے ساتھ کہا کہ قاتل یہ زیورات اتار کر لے گیا ہے۔

اللہ بخش کے گھر گئے۔ چوکیدار دروازے پر کھڑا تھا۔ چند آدمی گلی میں کھڑے تھے۔ چوکیدار نے کسی کو اندر نہیں جانے دیا تھا۔ میں اکیلا اندر گیا۔ ڈیوڑھی کشادہ تھی۔ ایک بلب جل رہا تھا۔ واردات والا کمرہ کھلا تھا۔ وہاں بھی بلب روشن تھا۔ لاش فرش پر پڑی تھی۔ اس کی ایک ٹانگ شلوار میں تھی دوسری شلوار سے باہر تھی۔ کمرے میں دو پلنگ تھے۔ ایک دائیں طرف کی دیوار کے ساتھ اور ایک سامنے والی دیوار کے ساتھ تھا۔ ان پر گدے اور گدوں پر پھولدار پلنگ پوش بچھے ہوتے تھے۔ ایک پلنگ پوش بالکل صحیح حالت میں تھا۔ دوسرا ادھر ادھر سے اکٹھا ہوا پڑا تھا۔ تکیہ بھی اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ اس پلنگ پر کوئی لیٹا یا سویا رہا اور کروٹیں بدلتا رہا تھا۔

لاش کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کی عزت کے ساتھ کھیلا گیا ہے اور بے ترتیب پلنگ پوش والا پلنگ اس جرم میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے بعد

مقتولہ کو قتل کیا گیا اور اس کے زیورات اتارے گئے۔

مقتولہ خاصی خوبصورت لڑکی تھی۔ اسے جتنی ضربیں لگیں وہ سر پر تھیں۔ لاش اور کمرے کو پولیس کی نظروں سے دیکھ کر میں نے ڈیوڑھی کی طرف توجہ دی۔ اللہ بخش کو اندر بلایا۔ ڈیوڑھی کے دو کونوں میں بیکار سا کچھ سامان پڑا تھا۔ میں اسے دیکھنے لگا۔ مجھے کپڑے دھونے والا ایک موٹا ڈنڈہ پڑا نظر آیا۔ اس کا رنگ سفیدی مائل تھا۔ اس کی حالت بتاتی تھی کہ بہت عرصہ اسے کپڑے دھونے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس پر خون لگا ہوا تھا۔ خون تازہ تھا۔ آلۂ قتل یہی تھا۔ اے۔ ایس۔ آئی میرے ساتھ تھا۔ اس نے کاغذات تیار کرنے شروع کر دیئے۔

میں نے دروازوں کے متعلق ایک بار پھر اللہ بخش سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ڈیوڑھی کا اندر والا دروازہ ڈیوڑھی کی طرف سے چٹخنی سے بند تھا اور باہر والا کھلا تھا۔ واردات والے کمرے کا ڈیوڑھی میں کھلنے والا دروازہ کھلا تھا اور اندر کو کھلنے والے کی چٹخنی چڑھی ہوئی نہیں تھی۔ اس کے کواڑ بند تھے۔ اللہ بخش نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ ڈیوڑھی کے دائیں اور بائیں جو کمرے ہیں ان کی چٹخنیاں بند رہتی ہیں مگر اس کمرے کی کھلی ہوتی تھیں۔

"کیا مقتولہ اس کمرے میں سویا کرتی تھی؟"

"نہیں" — اللہ بخش نے جواب دیا — "یہ کمرہ مہمانوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بیوی میرے ساتھ سونے والے کمرے میں سوتی تھی۔"

"آج رات بھی آپ کے کمرے میں سوتی تھی؟"

"جی ہاں" — اس نے جواب دیا — "وہ میرے کمرے میں سوتی تھی"

"ڈیوڑھی کا باہر والا دروازہ اندر سے بند نہیں کیا جاتا تھا؟"

"بالکل بند کیا جاتا تھا" — اللہ بخش نے جواب دیا — "آج میں نے خود دیکھا تھا کہ اس کی زنجیر چڑھی ہوئی تھی۔"

میں نے دروازہ بند کر کے زنجیر جو دائیں بائیں چڑھی تھی چڑھائی اور

دیکھا کہ یہ باہر سے کسی طریقے سے کھولی جاسکتی تھی یا نہیں۔ میں نے بڑی اچھی طرح دیکھا۔ باہر سے یہ زنجیر نہیں کھولی جاسکتی تھی۔

اس سے ظاہر ہوا کہ مقتولہ خود اپنے سونے والے کمرے میں سے آئی۔ واردات والے کمرے کا دروازہ اس نے اندر سے کھولا۔ ڈیوڑھی کا باہر والا دروازہ اندر سے کھلا تھا یا مقتولہ نے خود کھولا۔ پھر وہ اپنے قاتل کے ساتھ واردات والے کمرے میں چلی گئی ۔۔ لیکن قتل کیوں ہوئی؟ زیورات کون اتار کر لے گیا؟

جرم کا ایک اور نقشہ میرے دماغ میں آیا۔ مجرم ایک سے زیادہ ہوں گے۔ وہ کسی راستے سے، یا کسی طریقے سے ڈیوڑھی کا باہر والا دروازہ کھول کر اندر آ گئے۔ انہیں کسی گھر بھیدی نے بتایا ہوگا کہ مقتولہ فلاں وقت پیشاب کے لئے اٹھتی ہے۔ وہ اُٹھ کر باہر نکلی تو مجرموں نے اسے پکڑ لیا اور واردات والے کمرے میں لے گئے۔ گھر بھیدی نوکر ہی ہو سکتا تھا۔ باہر والا دروازہ اُسی نے کھولا ہوگا۔

میں نے اللہ بخش سے نوکروں کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا کہ ایک بوڑھا آدمی گھر میں بارہ تیرہ سال سے ملازم ہے۔ گھر کے برتن اور کپڑے دھونے اور دیگر کاموں کے لئے اسی بوڑھے کی بیوی مستقل ملازم ہے۔

گھر میں ایک جوان بیٹا بھی تھا۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ جوان بیٹے کا بوڑھا باپ جوان لڑکی سے شادی کر لیتا ہے تو وہی قتل ہوتا ہے۔ بیٹے یا جوان بیوی کے قتل کی وارداتیں کم ہی ہوتی ہیں۔ اس واردات میں بیوی قتل ہوئی تھی۔ اگر مقتولہ کے درپردہ مراسم اپنے خاوند کے جوان بیٹے کے ساتھ تھے تو اس نے اپنے باپ کی بیوی کو قتل کیوں کیا؟

یہ کارستانی اللہ بخش کی بھی ہو سکتی تھی۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ مقتولہ کے زیورات بھی اتارے گئے تھے اور اس پر مجرمانہ حملہ بھی ہوا تھا تو یہ جرم اُس کے اپنے خاوند کا نہیں ہو سکتا۔ آپ پولیس کی فائلیں دیکھیں تو آپ کو عجیب و غریب بلکہ ناقابلِ یقین وارداتیں نظر آئیں گی لیکن ان وارداتوں کے

مجرموں نے اقبالِ جرم کر کے بتایا کہ انہوں نے جرائم ان طریقوں سے کیوں کئے تھے۔ مثلاً گھر کے کسی فرد کو اسی گھر کا کوئی فرد قتل کر دیتا ہے اور یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ یہ چوروں ڈاکوؤں کی واردات ہے، ایک دو ٹرنکوں کے تالے توڑ دیتے جاتے اور سامان کمرے میں بکھیر دیا جاتا ہے۔ آپ کو میرے استاد ملک احمد یار خان نے اپنی تفتیش کی ایک کہانی سنائی تھی جس میں ایک لڑکی لاپتہ ہو گئی۔ گاؤں سے کچھ دُور ایک کھڈ سے اُس کی خون آلود شلوار ملی جس سے یہ شک ہوا کہ اُسے بے آبرو کر کے قتل کر دیا گیا ہے لیکن تفتیش ہوئی تو لڑکی ایک چھاؤنی سے برآمد ہوئی۔ جس کے ساتھ وہ گھر سے بھاگی تھی، شلوار کا ڈرامہ پولیس کو گمراہ کرنے کے لئے اُسی نے کھیلا تھا۔

اس واردات میں بھی مجھے کوئی ڈرامہ نظر آ رہا تھا۔ اللہ بخش اپنے بیٹے کو قتل نہ کر سکا۔ اُس نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا اور پولیس کو گمراہ کرنے کے لئے زیورات اور مجرمانہ حملے کا ڈرامہ کھیلا۔

یہ ڈرامہ اللہ بخش کا بیٹا اشرف بھی کھیل سکتا تھا جس کی یہ صورت میرے دماغ میں آئی تھی کہ لڑکی بدچلن نہیں تھی اور اُس نے بوڑھے خاوند کو قبول کر لیا تھا۔ میں نے خاص طور پر دیکھا تھا کہ اللہ بخش پچاس سال کی عمر میں بوڑھا نہیں لگتا تھا۔ اس کی چال ڈھال میں ابھی بڑھاپا نہیں آیا تھا۔ اشرف نے اپنی جوان سوتیلی ماں پر ڈورے ڈالے ہوں گے اور اس لڑکی نے اُسے دھمکی دی ہوگی کہ وہ اُس کے باپ کو بتا دے گی۔ اشرف نے اُسے قتل کر دیا یا کرا دیا ہوگا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ مجرموں کے لئے اُسی نے کھولا ہوگا۔

وہ ننگے پاؤں گئی تھی

یہ سب امکانات تھے اور قیاس آرائیاں۔ میں نے لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوانے کی کارروائی اور ذمہ داری اپنے اے۔ ایس۔ آئی اور

کانسٹیبل کے سپرد کر دی تھی۔ میں نے خود حویلی کا جائزہ لینا ضروری سمجھا اور اندر چلا گیا۔ سب سے پہلے میں اللہ بخش کے سونے والے کمرے میں گیا۔ پہلی جس چیز پر نظر پڑی وہ زنانہ چپل تھے جو ایک پلنگ کے ساتھ پڑے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ لاش کے پاؤں میں چپل نہیں تھے۔ اللہ بخش نے بتایا کہ یہ مقتولہ کے چپل ہیں جو وہ گھر میں پہنا کرتی تھی۔

مجھے اپنی کوتاہی کا احساس ہو گیا۔ میں نے فوراً ایک آدمی کو برآمدے میں اس کام کے لئے کھڑا کر دیا کہ کسی کو صحن میں نہ آنے دے اور ایک آدمی کو کھوجی کے گاؤں دوڑا دیا۔ وہ کوئی ڈیڑھ میل دور رہتا تھا۔ کھوجی سرکاری ملازم نہیں تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ میں صحن میں سے سونے کے کمرے میں گیا تھا۔ صحن کچا تھا۔ کھرے مٹ چکے ہوں گے۔ مجھے روشنی کا بھی انتظار کرنا تھا۔ صحن میں کھرے دیکھنے کے لئے برآمدے کے بلب کی روشنی بھی ناکافی تھی۔ چنانچہ میں دن کی روشنی اور کھوجی کے انتظار میں ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے لئے باہر گلی میں کرسیاں رکھوا کر بیٹھ گیا اور سب سے پہلے اس گھر کے بوڑھے نوکر کو بلایا اور اپنے پاس زمین پر بٹھا لیا۔

پہلے میں آپ کو اللہ بخش کی سوشل حیثیت بتا دوں۔ وہ کاروباری آدمی تھا۔ یہ کپڑے کا تھوک کاروبار تھا۔ اللہ بخش سمندر پار سے بھی کپڑا منگواتا تھا۔ یہ لاکھوں کا کاروبار تھا جس سے اللہ بخش دولت کما رہا تھا۔ یہ دولت کا کھیل تھا کہ اُس نے اس عمر میں ایک جوان اور کنواری لڑکی کے ساتھ شادی کی تھی۔ شہر میں وہ مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں میں بھی معزز اور رئیس سمجھا جاتا اور منڈی میں اس کا اثر و رسوخ چلتا تھا۔ میں نے اس کی امارت کی ایک جھلک اس کے سونے کے کمرے میں دیکھی تھی۔ فرنیچر، پلنگ پوش اور سجاوٹ وغیرہ کا سامان قیمتی تھا۔

اشرف اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اللہ بخش کی تین بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں۔ سب بچپن میں ہی مر گئی تھیں۔ صرف اشرف زندہ رہا اور اب باپ کے ساتھ کاروبار میں لگا ہوا تھا۔ اُس نے دس جماعتیں پاس کی تھیں۔ اچھا خوبرو

جوان تھا۔ شکل و صورت سے بھلا مانس نہیں لگتا تھا۔

مجھے ابھی یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ مقتولہ کس کی بیٹی تھی اور کہاں کی رہنے والی تھی۔ وہ جہاں کہیں کی بھی رہنے والی تھی وہاں سے اس کی دوستی اور دشمنی معلوم کرنی تھی۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ معلوم کرنا تھا۔ ابھی میں نے اللہ بخش کے نوکر کو پاس بٹھایا تھا لیکن اس سے کچھ پوچھنے کی مہلت نہ ملی کیونکہ مجھے تماشائیوں میں سے کسی کی بلند للکار سنائی دی ۔۔۔ "او ظالمو! تم نے میری بہن کو قتل کر دیا ہے۔ ادھر سامنے آ بدمعاش! میں تیری بدمعاشی دیکھتا ہوں۔"

کانسٹیبلوں نے اُسے پکڑ لیا لیکن وہ اُن کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اُسے اپنے پاس بلایا اور ڈانٹ کر چُپ کرایا۔ اس سے پوچھا کہ اُس نے کیا بک بک لگا رکھی ہے۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ وہ اتنی آہستہ بولے کہ میرے سوا کوئی سُن نہ سکے۔

"جناب عالی!" ۔۔۔ اُس نے بڑی دھیمی آواز میں کہا ۔۔۔ "آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ مجھے معلوم ہے میری بہن کو کس نے قتل کیا ہے۔ میرا دوست نذیر گواہ ہے"۔ اس نے اپنے دوست کو آواز دی ۔۔۔ "ادھر آ نذیرے!" ۔۔۔ نذیر آیا تو اُسے کہا ۔۔۔ "بتا انہیں بہن کیا کہا کرتی تھی"۔

نذیر بولنے ہی لگا تھا کہ میں نے اُسے روک دیا اور کہا ۔۔۔ "میں تم دونوں کا بیان تھانے میں چل کر لوں گا۔ بات جو بھی کہنی ہو میرے کان میں کہنا۔ اگر تم اونچی بولے اور یہ آواز قاتل کے کان میں پڑ گئی تو وہ اپنا بچاؤ کر لے گا۔ تم اس کے سگے بھائی ہو؟"

"بالکل سگا جی!" ۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "میرے سوا اس بیچاری کا کوئی نہیں تھا"۔

"قاتل کون ہے؟" ۔۔۔ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

"اشرف" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ۔۔۔ "اللہ بخش کا بیٹا ..... مجھے بہن بتایا کرتی تھی کہ اشرف اُس کی عزت کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں نے تین بار اشرف سے کہا تھا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائے لیکن یہ باز نہ آیا۔ میں نے اپنے

اس دوست کے ساتھ ذکر کیا تو ہم دونوں نے اشرف کو دھمکی دی کہ وہ باز نہ آیا تو اس کے باپ کو بھی بتائیں گے اور اس کی ہڈیاں بھی توڑیں گے۔"

"ہم ایسے شریف لوگ نہیں ہیں کہ اپنی عزت کی بھی پرواہ نہ کریں" — اس کے دوست نذیر نے کہا — "اگر اسے پھانسی نہ ہوئی تو میں اسے زندہ نہیں رہنے دوں گا۔"

"تم نے اس کے باپ کو بتا دیا تھا؟"

"ابھی نہیں" — مقتولہ کے بھائی نے جواب دیا۔

"تم نے اسے باپ کو بتانے اور ہڈیاں توڑنے کی دھمکی کب دی تھی؟"

"پرسوں"۔

"پھر اس نے کیا کہا تھا؟" — میں نے پوچھا۔

"اُلٹا ہمیں تڑی دیتا تھا" — اس نے جواب دیا — "کہتا تھا کہ خدا نے مجھے اتنا دیا ہے کہ تم دونوں کو اندر کرا سکتا ہوں اور تمہاری بہن کو زمین کے تختے سے اٹھا سکتا ہوں ... میری بہن نے بھی اسے کہا تھا کہ اس کے باپ کو بتا دے گی۔"

میں نے دونوں کو تھانے جا کے انتظار کرنے کو کہا اور یہ بھی کہ وہ کسی کے ساتھ کوئی بات نہ کریں۔

نوکرانی بیگم کی رازدار تھی

میں نے اللہ بخش کے ملازم کو پرے بھیج دیا تھا۔ اسے بلا لیا وہ آیا تو اللہ بخش اور اشرف بھی آ گئے۔

"آپ نے اس شخص کا شور شرابہ سنا ہے" — اللہ بخش نے کہا — "یہ ہم پر الزام تھوپ رہا ہے کہ اس کی بہن کو ہم نے قتل کیا ہے۔"

"کیا ہم نے اسے قتل کر کے اس کے زیورات اتار لئے ہیں؟" — اشرف نے کہا — "ہم زیورات دینے والے ہیں اتارنے والے نہیں۔"

"اپنی بہن کے قتل کی خبر سن کر اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے" — میں نے کہا — "آپ لوگ فکر نہ کریں۔"

"میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ اس کی نہ سنیں" — اللہ بخش نے کہا۔

"معلوم نہیں آپ کے کان میں کیا کہہ گئے ہیں" — اشرف نے کہا۔

"میں کانوں کا کچا نہیں میرے بھائی!" — میں نے کہا — "لیکن انہوں نے نہیں بلکہ میں نے ان کے کانوں میں کہا ہے کہ انہوں نے ایسی بکواس پھر کی تو حوالات میں بٹھا دوں گا۔ میں نے انہیں ڈرانے کے لئے کہا ہے کہ تھانے چل کر بیٹھیں۔ اگر پھر بھی انہوں نے آپ جیسے معزز حضرات کو بدنام کرنے کی کوشش کی تو میں ان کے خلاف بڑی سخت کارروائی کروں گا۔"

میں نے دیکھا کہ اللہ بخش تو بہت پریشان تھا لیکن اشرف کا ردِ عمل اور رویہ کچھ اور تھا۔

"آپ کو کسی پر شک تو ہو گا؟" — میں نے پوچھا — "کسی کے ساتھ آپ کی ذاتی دشمنی کاروبار کی وجہ سے یا اس بیوی کی وجہ سے ہے؟"

"نہ جی" — اللہ بخش نے کہا — "منڈی میں، محلے میں، ہندوؤں اور سکھوں میں کسی سے ہمارے متعلق پوچھ لیں۔ ہر کسی کے منہ سے ہمارے لئے خیر کا کلمہ ہی نکلے گا۔ کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں۔"

میں نے انہیں پرے جانے کو کہا۔ وہ چلے گئے تو میں نے ان کے نوکر کی طرف توجہ دی۔ بوڑھا اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ رونے پر آ گیا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ غریب اور بوڑھا آدمی ہے، اپنی جان بچاتے اور جو کچھ جانتا ہے بتا دے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ قتل کے متعلق وہ کچھ بھی نہیں جانتا۔

میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ڈیوڑھی کا دروازہ اندر سے کھولنے والا یہی تو نہیں تھا؟ اس نے بتایا کہ وہ رات اپنے گھر میں گزارتا ہے۔ اس رات اسے بلایا گیا تو یہ اپنے گھر سے آیا تھا۔

"تمہاری بیگم کیسی طبیعت کی تھی؟" — میں نے پوچھا — "ہنسنے کودنے والی تھی یا چپ چاپ رہتی تھی؟ غصیلی تھی؟"

"چپ چاپ رہنے والی نہیں تھی" — اس نے جواب دیا — "غصہ تو اسے

کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ ہنس مکھ تھی۔ شوقین مزاج تھی۔ کپڑوں اور زیور کا بہت شوق تھا۔"

"اپنے خاوند کے ساتھ اُس کا رویہ کیسا تھا؟"

"بہت اچھا"۔ اُس نے جواب دیا۔ "ان کے ساتھ تو وہ ایسے رہتی تھی جس طرح بچو لی کھیلا کرتے ہیں۔"

"تمہارے مالک (اللہ بخش) کی عادت اور فطرت کیسی ہے؟"

"حضور!"۔ اُس نے جواب دیا۔ "دولت ہو تو انسان جوانی اور بڑھاپے میں کوئی فرق نہیں محسوس کرتا۔ میرے مالک زندہ دل انسان ہیں۔ ان کی عادتیں اور فطرت ایسی ہے کہ ان کے دشمن بھی ان کے دوست بن جاتے ہیں۔"

"اور ان کا بیٹا اشرف کیسا آدمی ہے؟"

"دو سال ہوتے اشرف کی بیوی مر گئی ہے"۔ اُس نے جواب دیا۔ "لیکن اُس نے دوسری شادی نہیں کی۔ نئی بیگم (مقتولہ) بھی اسے کہتی رہتی تھی کہ شادی کر لو لیکن اشرف نہیں مانتا تھا... اشرف اچھا آدمی ہے۔"

"نئی بیگم کا اشرف کے ساتھ رویہ اور سلوک کیسا تھا؟"

"آپس میں بہت کم بولتے تھے"۔ اس نے کہا۔ "بیگم اسے بلاتی تھی، بات کرتی تھی لیکن اشرف اُس سے کھچا کھچا رہتا تھا۔"

"نئی بیگم نے تمہارے سامنے کبھی اشرف سے کہا تھا کہ شادی کر لو؟"

"بیگم کے متعلق میں آپ کو جو کچھ بتا رہا ہوں اس میں زیادہ تر باتیں مجھے اپنی بہو نے بتاتی ہیں"۔ اُس نے کہا۔ "بیگم میری بہو کو بہت چاہتی تھیں وہ ہے تو اس گھر کی خادمہ لیکن بیگم نے اُسے اپنی سہیلی بنا رکھا تھا۔ بیگم دل کی اکثر باتیں میری بہو سے کیا کرتی تھیں۔ بہو میری بیوی کو سنایا کرتی تھی۔ اس گھر کی عزت کو ہم نے ہمیشہ اپنی عزت سمجھا ہے۔ اس گھرانے نے میرے گھرانے کی پرورش کی ہے۔ ہم انہی کا دیا کھاتے ہیں۔"

"میں اس گھرانے کی عزت تباہ نہیں کرنا چاہتا"۔ میں نے کہا۔ "مجھے

ہر ایک بات بتا دو تاکہ میں مالکوں کی عزت بچا سکوں۔ اگر مجھے بعد میں پتہ چلا کہ تم نے مجھ سے کوئی بات چھپائی تھی تو میں تمہیں شہادت چھپانے کے جرم میں گرفتار کر لوں گا... تم نے کبھی اللہ بخش کی غیر حاضری میں اشرف کو بیگم کے ساتھ الگ کمرے میں دیکھا ہے؟"

"نہ جی"۔ اُس نے جواب دیا۔ "میں نے کبھی نہیں دیکھا۔"

"کبھی آپس میں لڑتے یا جھگڑتے دیکھا ہے؟"

"نہ جی"۔ اُس نے کہا۔ "میں نے بتایا ہے ناکہ ان کی آپس میں بول چال تقریباً بند تھی۔"

"تمہاری بہو نے تمہیں یا تمہاری بیوی کو کبھی بتایا ہے کہ بیگم کے درپردہ تعلقات کسی اور کے ساتھ تھے؟"۔ میں نے کہا۔ "تمہاری بہو نے کبھی شک کا اظہار کیا ہے کہ بیگم کا چال چلن مشکوک ہے؟"

"نہیں"۔ اُس نے جواب دیا۔ "ایسی بات کبھی نہیں ہوئی۔"

"بیگم کے والدین کیسے لوگ ہیں؟"

"اُس کے والدین مر چکے ہیں"۔ اُس نے کہا۔ "اُس کا صرف یہ بھائی ہے جو آپ کے ساتھ باتیں کر کے گیا ہے... یہ اچھی شہرت کا آدمی نہیں۔ کوئی نہ کوئی چکر چلاتے رکھتا ہے اور پیسے کما لیتا ہے۔ سنا ہے جوا کھیلتا ہے اور پیتا پلاتا بھی ہے لیکن اس کا یارانہ بڑے لوگوں کے ساتھ ہے۔ آدمی اچھا نہیں۔ معلوم نہیں اللہ بخش صاحب نے اس کی بہن کے ساتھ شادی کیوں کی ہے۔"

پلنگ پر چوڑیوں کے ٹکڑے

یہ تو چند ایک مختصر سی باتیں ہیں جو میں نے لکھی ہیں۔ اس سے پوچھ گچھ کرتے صبح ہو گئی۔ کھوجی آ چکا تھا۔ میں کھوجی کو اندر لے گیا۔ میں نے روشنی میں یہ حویلی دیکھی، تو مجھے اندازہ ہوا کہ اللہ بخش خاندانی امیر تاجر ہے۔ یہ اس

زمانے کی امیرانہ عمارت تھی۔ اس کی دو منزلیں تھیں۔ نیچے تو کمرے ہی کمرے اور کشادہ صحن تھا، اُوپر تین ہی کمرے تھے۔ میں نے کھوجی سے کہا کہ وہ صحن اور برآمدے میں اور ہر جگہ مقتولہ کے پاؤں کے نشان (کھُرے) دیکھے۔

اُس نے کچھ وقت صرف کر کے صحن میں کھُرے تلاش کر لیے۔ صحن کا فرش پکا نہیں تھا۔ کھُروں کے مطابق مقتولہ صحن میں ننگے پاؤں آئی اور ڈیوڑھی کے ساتھ والے (واردات) والے کمرے میں چلی گئی۔ کمرے میں اور ڈیوڑھی میں اُس کا کھُرا ڈھونڈنا مشکل تھا کیونکہ کمرے کا فرش ٹائلوں والا تھا۔ ڈیوڑھی کا فرش کچا تھا لیکن میں نے بھی احتیاط نہ کی۔ وہاں میرے علاوہ اور بھی آدمی پھرتے رہے تھے۔ کھُرا نہ مل سکا۔ میرے پُوچھنے پر کھوجی نے یقین کے ساتھ کہا کہ واردات والے کمرے میں داخل ہوتے تک مقتولہ اکیلی تھی۔ اس سے ظاہر ہُوا کہ اُسے اپنے کمرے سے زبردستی نہیں اُٹھایا گیا تھا۔

میں نے کھوجی سے کہا کہ لاش پوسٹ مارٹم کے لیے گئی ہے۔ وہ جا کر مقتولہ کے پاؤں دیکھ کر آئے اور بتائے کہ صحن میں پائے جانے والے کھُرے مقتولہ کے ہیں یا کسی اور کے۔

میں نے نوکر سے معلوم کر لیا تھا کہ اشرف کا کمرہ اوپر کی منزل میں ہے جسے چوبارہ کہا جاتا تھا۔ مجھے چونکہ اشرف پر بھی شبہ تھا اور اس شبے کو مقتولہ کے بھائی نے پختہ کر دیا تھا اس لیے میں اوپر چلا گیا کہ اشرف کا کمرہ دیکھوں۔ مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ حویلی میں داخل ہونے کا کوئی راستہ ہے یا نہیں۔ میں نے اللہ بخش، اشرف اور دو معززین کو ساتھ لے لیا تھا کیونکہ میں تلاشی لے رہا تھا۔

اشرف کا کمرہ کھُلا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ بڑے اچھے ذوق وشوق سے کمرہ سجایا ہُوا تھا۔ پلنگ پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ آلۂ قتل تو مجھے مل ہی گیا تھا جو میں نے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا تھا۔ یہ کپڑے

دھونے والا ڈنڈا تھا جس پر خون تھا۔ ڈاکٹر کو اس پر لگے ہوئے خون کی رپورٹ لینے کے لیے اسے لاہور بھیجنا تھا۔ میں کمرے میں اپنے مطلب کی کوئی چیز ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے پلنگ کے نیچے دیکھا۔ کُرسیوں کے پیچھے دیکھا اور میں نے ایک بار پھر پلنگ کے نیچے دیکھا تو مجھے ایک ایسی چیز نظر آگئی جو کئی وارداتوں میں نظر آیا کرتی ہے۔ یہ ٹوٹی ہوئی چُوڑی یا چُوڑیوں کے دو ٹکڑے تھے۔

یہ ٹکڑے سرہانے کی طرف فرش پر پڑے تھے۔ میں نے اُٹھا لیے۔ پلنگ کا تکیہ ہٹا کر دیکھا۔ چھوٹا سا ایک ٹکڑا وہاں بھی پڑا تھا۔ یہ پلنگ تکیے والا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی عورت اس پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس نے بازو اُوپر کیا تو پلنگ کا تکیہ جو لکڑی کا تھا، اس کے ساتھ کلائی ٹکرائی اور ایک دو چُوڑیاں ٹوٹ گئیں۔

میں نے اشرف کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ میں نے معلوم کر لیا تھا کہ اس گھر میں کوئی اور عورت یا بچی نہیں تھی۔ صرف مقتولہ تھی یا اُس کی نوکرانی۔ یہ چُوڑیاں کس کی تھیں؟ — مقتولہ کی؟ نوکرانی کی یا کسی اور عورت کی؟ — میں نے اشرف سے نہ پوچھا۔ کمرے میں دو اٹیچی کیس رکھے تھے۔ میں نے اشرف سے کہا کہ دونوں کھول کر دکھائے۔ اُس نے ہچکچاتے ہوئے دونوں اٹیچی کیس کھول دیئے۔ دونوں میں دُھلے ہُوئے کپڑے تھے۔ میں خون کے چھینٹوں والے کپڑے ڈھونڈ رہا تھا۔

میں نے چُوڑیوں کے ٹکڑوں کی برآمدگی کی باقاعدہ کاغذی کارروائی کی اور دو گواہوں کے دستخط کرا لیے۔ اس کے بعد میں نے حویلی کے کونے کھدرے کی تلاشی لی۔ دُھلنے والے جو میلے کپڑے پڑے تھے وہ دیکھے۔ مجھے خون کے چھینٹوں کا کوئی کپڑا نظر نہ آیا۔

نوکر کی بہو — اتنی حسین؟

میں نے اللہ بخش اور اشرف کو کانسٹیبلوں کے ساتھ تھانے بھیج۔

دیا اور ان کے نوکر سے کہا کہ وہ اپنی بہو کو ساتھ لے کر تھانے چلا جائے۔ میں ہسپتال چلا گیا۔ مجھے دیکھنا تھا کہ مقتولہ کے بازوؤں میں کیسی چوڑیاں ہیں۔ میں جب وہاں گیا تو لاش پوسٹ مارٹم کے بعد باہر لائی جا رہی تھی۔ میں نے لاش کے دونوں بازو دیکھے۔ ایک بازو میں اسی رنگ اور اسی قسم کی چوڑیاں تھیں۔

میں تھانے گیا تو مجھے اُمید تھی کہ میں شام سے پہلے قاتل کو پکڑ لوں گا۔ یہ جرائم پیشہ لوگوں کی واردات نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے مقتولہ کے بھائی سے جو تھانے میں میرے انتظار میں تھا کہا کہ وہ ہسپتال سے اپنی بہن کی لاش لے لے اور کفن دفن سے فارغ ہو کر تھانے میں آ جائے۔ اس کے دوست کو بھی میں نے اس کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ مشتبہ یا ملزم نہیں، گواہ تھے۔ ان کے چلے جانے میں تفتیش کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔

میں نے اشرف کو الگ کر لیا۔

"تم ایک معزز باپ کے بیٹے ہو" ــ میں نے اُسے کہا ــ "باپ کی اور اپنی عزت کی خاطر میرے ساتھ سچ بولو۔ میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔ میری اس نصیحت پر عمل نہیں کرو گے تو اپنا انجام سوچ لو۔ بہت بُرا ہوگا۔"

"میرا جُرم؟" ــ اس نے کہا ــ "آپ مجھے اُس انجام تک کس جُرم میں پہنچانا چاہتے ہیں؟" ــ

"اپنی سوتیلی ماں کے قتل کے جرم میں" ــ میں نے کہا ــ "مجھ پر ثابت کر دو کہ تم قاتل نہیں ہو۔"

میں نے دیکھا کہ وہ ڈرا نہیں۔ گھبرایا بھی نہیں ورنہ کسی بیگناہ کو تھانیدار کہہ دے کہ تم قاتل ہو تو وہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگتا ہے۔ میں نے اس میں اپنے آپ میں اعتماد دیکھا اور بولنے کی جُرأت بھی۔

"اُسے قتل کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی" ــ اس نے کہا ــ "میں آپ کو صاف بتا دیتا ہوں کہ اس عورت کو تو میں منہ بھی نہیں لگاتا تھا۔ یہ بھی سوچیں کہ لاش کے ساتھ زیورات نہیں تھے۔ کیا میں نے زیورات اُتارے تھے؟ اتنا بڑا کاروبار میرے ہاتھ میں ہے۔ ہر روز ہزاروں روپے میرے

ہاتھوں میں اِدھر اُدھر ہوتے ہیں۔"

میں نے چوڑیوں کے ٹکڑے اُس کے آگے رکھتے ہوئے پُوچھا ــ "یہ چوڑیاں کس کی تھیں؟"

"مجھے معلوم نہیں" ــ اشرف نے کہا۔

"میں معلوم کرنے کے طریقے جانتا ہوں اشرف!" ــ میں نے کہا ــ "تمہیں بتانا پڑے گا۔"

اُس نے قسمیں کھانی شروع کر دیں اور کہا کہ یہ مقتولہ کی چوڑیاں نہیں۔ میں پیچھے پڑ گیا تو اُس نے کہا کہ یہ اُس کی نوکرانی کی ہو سکتی ہیں۔ اُس کے کمرے کی جھاڑ پونچھ وہی کرتی ہے۔ شاید جھاڑ پونچھ کرتے اُس کی ایک آدھ چوڑی ٹوٹ گئی ہو۔

میں اُسے وہیں بیٹھا چھوڑ کر باہر نکلا۔ برآمدے میں بوڑھے نوکر کے پاس ایک خوبصورت عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کی عمر تیئیس چوبیس سال ہوگی۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ایسے خوبصورت رنگ، ایسی اچھی شکل وصورت اور اتنے اچھے جسم کی لڑکی اس نوکر کی بہو ہو سکتی ہے۔ میں نے نوکر سے کہا کہ اپنی بہو کو میرے پاس بھیجو۔

وہ ڈرتی شرماتی مجھ تک پہنچی۔ میں نے اُسے کہا کہ اپنے دونوں بازو میرے آگے کرو۔ اُس نے بازو آگے کئے تو یہ اُسی قسم کی چوڑیاں تھیں جن کے ٹکڑے میرے پاس تھے۔

"اشرف کے کمرے کی جھاڑ پونچھ کون کرتا ہے؟" ــ میں نے پُوچھا۔

"میرا بابا" ــ اُس نے جواب دیا۔

میں اُسے اُس کے سُسر کے پاس بھیج کر اپنے کمرے میں گیا اور اشرف سے کہا ــ "میں تمہیں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ سچ بولو۔ اس کے بعد تمہارا ٹھکانہ حوالات ہوگا۔ تم نے جھوٹ بولا ہے کہ تمہارے کمرے کی جھاڑ پونچھ نوکرانی کرتی ہے ..... اب میں تمہیں مہلت نہیں دوں گا۔ بتاؤ کہ مقتولہ تمہارے کمرے میں کیا کرنے گئی تھی۔ بدبخت انسان! تم تھانے میں

ہو منڈی میں نہیں۔ تم نہیں جانتے، پلنگ پر ٹوٹی ہوئی چوڑی کا ایک ٹکڑا جُرم کی پوری کہانی سُنایا کرتا ہے۔ اگر تم دوسرے طریقے سے بتانا چاہتے ہو تو میں تمہیں دو کانسٹیبلوں کے حوالے کر دیتا ہوں۔ وہ تم سے سچ اُگلوا لیں گے۔"

خاوند نیم پاگل — بیوی حسین اور ہوشیار

اُس نے سر جُھکا لیا۔ میں خاموش رہا۔ اُس نے سر اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور چہرے پر گھبراہٹ بھی تھی۔

"یہ میں آپ کو بتا دیتا ہوں کہ یہ کس کی چوڑیوں کے ٹکڑے ہیں" — اُس نے درخواست اور عرض کے لہجے میں کہا — "لیکن اس کا تعلق قتل کے ساتھ نہیں۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ میرے والد صاحب کو پتہ نہ چلے .... یہ درست ہے کہ میرے کمرے کی جھاڑ پونچھ نوکر کرتا ہے لیکن چوڑیوں کے ٹکڑے اُس کی بہو کے ہیں۔ میں نے دیکھے نہیں تھے۔ وہ بھی نہ دیکھ سکی اس لئے اُٹھائے نہیں۔"

"تم نے اپنا یہ راز مجھے دے دیا ہے تو ایک اور بات بتا دو" — میں نے کہا — "یہ کہاں تک سچ ہے کہ تم نے مقتولہ کے ساتھ بھی اپنی نوکرانی جیسے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی تھی؟"

"یہ بالکل غلط ہے" — اُس نے کہا — "آپ کا شک بجا ہے۔ میں جوان ہوں، وہ بھی جوان تھی۔ اب میں نے آپ کو اپنی نوکرانی کی بات بتا دی ہے تو آپ نے سمجھ لیا ہے کہ میں بدکار آدمی ہوں۔ میں نے ایسے واقعات سُنے ہیں کہ جوان بیٹے نے بوڑھے باپ کی جوان بیوی کے ساتھ تعلقات قائم کر لئے لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔"

"تم اُسے ماں سمجھتے تھے؟"

"بالکل نہیں" — اُس نے کہا — "میں اُسے اپنی ماں کا درجہ نہیں دے سکا۔ میں تو اُس کے ساتھ بات تک نہیں کرتا تھا.... اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کو سُنا دوں کہ میرے والد صاحب نے یہ شادی کس طرح کی تھی۔"

میرے کہنے پر اُس نے بڑی لمبی کہانی سُنا دی۔ یہ میں آپ کو مختصر کر کے سناتا ہوں۔ اشرف کی عمر بائیس تیئیس سال ہوتی تو اُس کی ماں مر گئی۔ اُس کے باپ نے دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ پیار ہوتا ہی ہے لیکن اشرف کی ماں کو اس کے ساتھ دیوانگی جیسا پیار تھا کیونکہ یہ تین لڑکیوں میں ایک ہی لڑکا تھا۔ لڑکیاں بچپن میں ہی مر جاتی رہیں۔ اشرف کو ماں سینے سے لگائے رکھتی تھی۔ وہ مر گئی۔ اشرف کے دل میں ماں کی اتنی محبت تھی کہ مجھے اپنی کہانی سُناتے ہوتے اُس کے آنسو بہہ نکلے۔

باپ نے چند مہینوں بعد اشرف کی شادی کر دی۔ ساڑھے تین چار سال بعد اس کی بیوی مر گئی۔ اشرف کی ایک ہی بچی پیدا ہوئی جو زندہ نہ رہی۔ اشرف کا دل ایسا اُچاٹ ہوا کہ اُس نے بھی اپنے باپ کی طرح دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ باپ اُسے شادی کے لئے مجبور کرتا رہا اور اشرف ٹالتا رہا۔ اس دوران ان کے نوکر کے بیٹے کی شادی ہو گئی۔ نوکر کا بیٹا ذہنی طور پر بیمار تو نہ تھا لیکن اُس کے دماغ میں کوئی نقص ضرور تھا۔ شکل و صورت کا بھی ایسا ویسا ہی تھا۔ وہ کبھی کبھی پاگلوں کی طرح حرکتیں کرتا تھا۔ بیوقوف بھی تھا۔ اللہ بخش نے اُس کی دال روٹی پوری کرنے کے لئے اُسے اپنی دکان میں چپڑاسیوں کی طرح کی نوکری دے دی تھی۔ وہ دس منٹ میں ہو جانے والا کام ایک گھنٹے میں کیا کرتا تھا۔ اللہ بخش اُسے خیرات کے طور پر تنخواہ دیتا تھا۔

ایسے نیم پاگل کو اتنی خوبصورت اور ہوشیار بیوی مل گئی۔ اس کا باپ اللہ بخش کے گھر میں نوکر تھا۔ اپنے بیٹے کی شادی کے چھٹے ساتویں مہینے اُس نے اللہ بخش اور اشرف سے کہا کہ اُسے اُمید تھی کہ اُس کا بیٹا شادی کر کے صحیح ہو جائے گا لیکن وہ ویسے کا ویسا ہے اور اس کی بیوی پریشان رہتی ہے۔ اُس نے عرض کی کہ بہو کو اللہ بخش گھر کا کوئی کام دے دے تاکہ وہ مصروف رہے اور کچھ کما بھی سکے۔ اللہ بخش کے ہاں کیا کمی تھی۔ اُس نے نوکر سے کہا کہ اُسے گھر کے برتن کپڑے دھونے پر لگا لو۔ اس طرح اس کی تنخواہ مقرر ہو گئی۔

اشرف کی بیوی کو مرے ڈیڑھ دو سال ہو گئے تھے۔ اس لڑکی نے اشرف کو اپنا آشنا بنا لیا۔ لڑکی اتنی نڈر نکلی کہ کبھی کبھی رات کو بھی چھتوں سے اشرف کے کمرے میں آجاتی تھی۔

باپ کی بیوی اور بیٹا

اس دوران اشرف بمبئی چلا گیا۔ اسے اکثر جانا پڑتا تھا۔ باہر سے مال بحری جہازوں سے آتا تھا۔ اشرف مال چھڑانے کے لئے بمبئی جاتا تھا۔ اب گیا تو جہاز لیٹ ہو گیا اور مال چھڑانے میں کوئی مشکل پیش آگئی۔ اُسے بمبئی میں ایک مہینہ لگ گیا۔

واپس آیا تو اس نے گھر میں ایک بڑی خوبصورت اور جوان لڑکی دیکھی جو زیورات سے لدی ہوئی اور ریشمی کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اللہ بخش نے اُسے بتایا کہ یہ اُس کی سوتیلی ماں ہے۔ اشرف پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ ایک تو اُس کے باپ نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا، اب اُس نے اشرف سے بات کئے بغیر دوسری شادی کر لی اور کی بھی اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی کے ساتھ۔ اشرف کو یہ افسوس بھی ہوا کہ دوسری شادی کرنی تھی تو اشرف کی ہوتی جو جوان تھا۔

اشرف کو اصل دُکھ یہ تھا کہ اس لڑکی نے اس کی ماں کی جگہ لے لی تھی۔ اُس کی ماں اس گھر کی مالکہ تھی۔ اُس کے مرنے کے بعد اشرف تصوروں میں اپنی ماں کو گھر میں گھومتا پھرتا، کام کاج کرتا دیکھتا رہتا تھا۔ یہ جذباتی یعنی نفسیاتی معاملہ تھا۔ اشرف بے شک جوان تھا اور اُس میں خود اعتمادی اور خاندانی وقار بھی تھا لیکن ماں کی محبت اور موت نے اُسے نفسیاتی مریض بنا رکھا تھا۔

”آپ مجھے پاگل کہہ سکتے ہیں“۔۔۔ اس نے نمناک سی مسکراہٹ سے کہا۔۔۔ ”میں کبھی کبھی باورچی خانے میں چلا جاتا ہوں اور دروازہ بند کر کے اپنی ماں کے ساتھ باتیں کیا کرتا ہوں۔ مجھے ماں وہاں بیٹھی ہوئی نظر آتی ہے۔“

اس طرح کی اُس نے کچھ اور مثالیں دیں جن سے میں سمجھ گیا کہ ماں کے معاملے میں وہ نفسیاتی مریض ہو چکا تھا۔ وہ باورچی خانے میں اور گھر میں نوکر اور نوکرانی کو وہ کام کرتے دیکھ سکتا تھا جو اُس کی ماں کیا کرتی تھی۔ کسی ایسی عورت کا وجود اُس کے لئے ناقابلِ برداشت تھا جو گھر کی مالکن بن جائے اور اُس کی جگہ لے لے۔

اشرف نے اپنے باپ سے کہا کہ اس گھر میں سوتیلی ماں رہے گی یا میں رہوں گا۔ اُس کا ردِعمل بڑا ہی سخت تھا۔ باپ نے اُسے بتایا کہ گھر میں ایک عورت کی ضرورت تھی۔ اشرف بھی چونکہ دوسری شادی سے انکار کر چکا تھا، اس لئے اللہ بخش نے ضروری سمجھا کہ وہ شادی کر لے۔ اللہ بخش نے اسے یہ دلیل بھی دی کہ باورچی خانہ نوکروں کے حوالے نہیں کرنا چاہئے۔ نوکر نقصان پہنچاتے ہیں۔ باورچی خانہ گھر کی مالکن کا ہی ہوتا ہے۔

”لیکن یہ لڑکی ہے کون؟“۔۔۔ اشرف نے باپ سے پوچھا۔

باپ نے اُسے بتایا کہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کر کے اُس نے نیکی کی ہے۔ لڑکی یتیم تھی۔ اس کا ایک ہی بھائی تھا جو اچھی شہرت کا آدمی نہیں۔ اسی لئے اس اتنی خوبصورت لڑکی کا کوئی رشتہ نہیں لیتا تھا۔ اس کے بھائی نے کسی سے اللہ بخش کو کہلوایا کہ آپ نیک اور خدا ترس انسان ہیں، ایک یتیم لڑکی کو سنبھال لیں ورنہ اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی اور اس کا چال چلن بھی ٹھیک نہیں رہے گا۔

اللہ بخش نے لڑکی کو دیکھا۔ پہلے تو اُس نے کوشش کی کہ اُس کی شادی کسی اور سے کرا دے لیکن اس کا رشتہ قبول کرنے کے لئے کوئی بھی تیار نہ ہوا۔ اللہ بخش نے خود اس کے ساتھ شادی کر لی۔

اشرف کے لئے اپنے باپ کی کوئی بھی دلیل قابلِ قبول نہیں تھی۔ باپ نے اسے کہا کہ وہ اگر غلطی ہی کر بیٹھا ہے تو اس کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ اُسے اب برداشت کرنا چاہئے۔ اشرف نے تو یہاں تک سوچا تھا کہ وہ اس گھر سے ہی چلا جاتے لیکن باپ کے ساتھ اُسے اتنی محبت تھی کہ اُسے اس نے اکیلا چھوڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے علیحدگی یوں اختیار کی کہ اُوپر کی منزل کے

ایک کمرے میں چلا گیا اور وہیں رہنے لگا۔ اس کی مجبوری تھی کہ اُسے اپنے باپ کی نئی بیوی کے ہاتھ کا پکا ہُوا کھانا پڑتا تھا لیکن دل سے وہ اس کھانے کو قبول نہیں کرتا تھا۔

کئی معزز لوگوں نے اشرف کے سامنے حیرت کا اظہار کیا کہ اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی ہے اور کی بھی ایک مشکوک بلکہ بدنام گھر کی لڑکی کے ساتھ۔ سب حیران اس پر تھے کہ اللہ بخش نیک، معزز اور باوقار آدمی تھا۔ اس وجہ سے وہ مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں میں بھی قابلِ احترام سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے ہر کوئی حیران تھا کہ اللہ بخش نے یہ کیا حرکت کی ہے۔ جوان بیٹے کی شادی کرنے کی بجائے اس عمر میں اپنا بیاہ رچا لیا۔

ایک اور پہلو کو بھی سامنے رکھیں۔ یہ ابتدا سے ہوتا آیا ہے کہ ہر تھانے کے علاقے کے سرکردہ اشخاص تھانیدار کے ساتھ میل ملاقات ضرور رکھتے ہیں۔ کاروبار اور تجارت کے سرکردہ تاجر تو تھانیداروں کے ساتھ دوستی لگانا اپنا فرض سمجھتے ہیں لیکن اللہ بخش ہر حلقے میں اپنا اثر رکھنے والا اونچی حیثیت کا آدمی تھا لیکن میں اسے نہیں جانتا تھا۔ دوسرے سرکردہ اشخاص اکیلے اکیلے میرے پاس آتے اور بعض ایک دوسرے کے خلاف چغلی بھی کرتے تھے۔ اللہ بخش کی میں نے کبھی صورت نہیں دیکھی تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بہت ہی شریف النفس تھا جو پولیس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

اشرف کو یہ بھی پتہ چلا کہ اُس کی سوتیلی ماں کا بھائی اچھی شہرت کا آدمی نہیں۔ وہ ہر طرح کی دلالی کرتا ہے اور یہی اس کا ذریعہ معاش تھا۔ بعد میں اُس نے اس شخص کو اپنے باپ کے پاس آتے دیکھا۔ اسے کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ وہ اللہ بخش سے پیسے لے جاتا ہے۔

بُرے لوگوں میں پھنس گیا

مختصر یہ کہ اشرف نے اپنی سوتیلی ماں اور اس کے بھائی کے ساتھ

کوئی تعلق نہ رکھا۔ اُس لیے اپنے نوکر کی بہو کے ساتھ دوستانہ گانٹھ لیا۔

سوتیلی ماں نے اس کے دل میں اپنی محبت پیدا کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اشرف نے قبول نہ کی۔ مقتولہ نے اسے یہ بھی کہا کہ وہ اُس کے باپ کی خدمت دل سے کرتی ہے اور اشرف اُسے ماں کا درجہ دے دے۔ اشرف نے مجھے بتایا کہ اُس نے اس لڑکی کی نیت پر کبھی شک نہیں کیا۔ وہ اشرف کو ماں کی حیثیت سے اپنی محبت پیش کر رہی تھی، حالانکہ عمر میں اس سے چھوٹی تھی۔ دو تین بار وہ رو بھی پڑی تھی۔

میرے پوچھنے پر اشرف نے بتایا کہ مقتولہ عامیانہ ذہن کی لڑکی تھی۔ وہ چھوٹے گھر سے بہت بڑے گھر میں آگئی تھی اس لیے وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتی تھی۔ بھڑکیلے کپڑے پہنتی اور زیورات لٹکائے رکھتی تھی۔ محلے کی عورتوں میں شوبازی کرتی اور ظاہر کرتی کہ وہ بہت امیر خاندان کی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اس کے گھر میں عورتوں نے آنا ہی چھوڑ دیا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ اُس کی رازداری تمہارے نوکر کی بہو کے ساتھ تھی؟"

"یہ بالکل ٹھیک ہے"۔ اُس نے جواب دیا۔ "بی بی (نوکر کی بہو) مجھے بتاتی رہتی تھی۔"

"تمہارے والد صاحب کے متعلق کیا بتاتی تھی؟"

"میری سوتیلی ماں بی بی سے میرے والد صاحب کا ذکر اکثر کرتی تھی"۔ اشرف نے کہا۔ "بی بی مجھے بتاتی تھی کہ وہ کہتی ہے کہ میرا دل اس بوڑھے کو قبول تو نہیں کرتا تھا لیکن میرے دل میں اس کی محبت پیدا ہو گئی ہے۔ بہت پیارا آدمی ہے اور جسمانی لحاظ سے تو یہ بوڑھا ہے ہی نہیں۔ میں تو اس شخص کی غلام ہو گئی ہوں۔"

"اور تمہارے متعلق؟"

"بی بی نے بتایا تھا کہ میری بے رُخی سے وہ پریشان رہتی ہے"۔ اشرف نے جواب دیا۔ "کہتی ہے کہ میں اس کی شادی اپنے ہاتھوں کرانا چاہتی

ہُوں۔ مجھے اپنے بھائی کے ساتھ اتنی محبت نہیں جتنی اشرف کے ساتھ ہے لیکن یہ مجھ سے نفرت کرتا ہے ..... بی بی مجھے کہتی تھی کہ میں اپنا رویہ بدل لُوں لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا۔"

میں نے اس پر جرح کی۔ بہت سوال پُوچھے۔ اسے مشتعل کیا، بھڑکایا اور پُوچھ گچھ کے سارے داؤ آزمائے لیکن وہ مجھے بالکل صاف سُتھرا نظر آیا۔ میں نے ابھی اُسے نہ بتایا کہ اُس کی سوتیلی ماں کا بھائی اور بھائی کا دوست اُس پر اور اُس کے باپ پر کیا الزام عائد کر رہے ہیں۔ میں نے اتنا ہی پوچھا کہ مقتولہ کے بھائی کے ساتھ اُس کی کبھی ملاقات ہوئی ہے؟ اُس نے بتایا کہ وہ ملتا رہتا تھا۔ وہ بھی اشرف کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا تھا لیکن اشرف اس کے ساتھ رسمی سی ایک آدھ بات کر لیتا تھا۔

میں نے اللہ بخش کو بلایا اور اشرف سے کہا کہ وہ تھانے میں موجود رہے۔ باپ بہت پریشان تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اُسے کسی پر تو شک ہوگا۔ اُس کے آنسو نکل آئے اور اُس نے سر ہلا کر کہا کہ اُسے کسی پر شک نہیں۔

"میرے ذہن میں ایک شک آتا ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "آپ کی بیوی کے بھائی کے ساتھ کسی کی دُشمنی ہوگی جس کا تعلق آپ کی بیوی کے ساتھ ہوگا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"دراصل بات یہ ہے کہ میں بہت بُرے لوگوں میں پھنس گیا تھا" ــــ اُس نے کہا۔

"آپ کو یہ نیکی مہنگی پڑی ہے" ــــ میں نے کہا ــــ "سُنا ہے کہ آپ بڑے عقلمند ہیں لیکن آپ نے یہ شادی کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے" ــــ میں نے اُسے کہہ دیا ــــ "مقتولہ کے بھائی نے آپ پر الزام عائد کیا ہے کہ مقتولہ کو آپ نے یا آپ کے بیٹے نے یا آپ دونوں نے قتل کیا یا کرایا ہے۔"

اللہ بخش اس طرح چونکا کہ کچھ دیر میرے مُنہ پر نظریں جما کر دیکھتا رہا۔ مجھے گنہگار اور بیگناہ کو پہچاننے کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اس شخص کا چہرہ، اس کا ردِ عمل اور اس کا انداز بتاتا تھا کہ یہ شخص دھوکہ کھا سکتا ہے، دھوکہ دے

نہیں سکتا اور یہ آدمی قتل ہو سکتا ہے قتل کر نہیں سکتا تاہم مجھے ابھی اس شخص کو ٹھونک بجا کر دیکھنا تھا۔

شادی کس طرح ہُوئی

"ہر کوئی حیران ہے کہ میں نے دوسری شادی کس طرح اور کیوں کر لی ہے" ــــ اُس نے کہا ــــ "میرا بیٹا مجھ سے ناراض ہُوا۔ میں نے اُسے شادی کرنے کی اور وجوہات بتائیں لیکن اصل وجہ کسی کو نہ بتائی۔ اب اس بدمعاش آدمی نے مجھ پر اپنی بہن کے قتل کا الزام لگایا ہے تو میرے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ میں وہ وجہ آپ کو بتا دوں۔ آپ کہیں گے کہ یہ شخص کتنا نرم دل، بھلے مانس اور احمق ہے۔ شادی کی بات اس طرح چلی تھی کہ مقتولہ کا بھائی امین ایک روز میرے پاس آیا۔ یہ میری دوسری شادی سے کوئی چھ مہینے پہلے کی بات ہے۔ اُس نے کہا کہ آپ کے متعلق سُنا ہے کہ آپ مسلمانوں کے درد مند ہیں اور خُدا نے آپ کو بڑا نیک دل دیا ہے۔ ایک مسلمان لڑکی کی عزت کا سوال ہے....

"میں واقعی مسلمانوں کا درد مند ہوں۔ ہر مسلمان لڑکی کی عزت کو میں اپنی عزت سمجھتا ہُوں۔ میں نے امین سے کہا کہ وہ مجھے بتائے کہ میں اس لڑکی کی مدد کس طرح کر سکتا ہُوں۔ اُس نے اپنا مسئلہ اس طرح سُنایا کہ اُس کی ایک جوان بہن ہے۔ ان کے ماں باپ مر چکے تھے۔ امین نے مجھے بڑے صاف الفاظ میں بتایا کہ وہ پیسے تو کما لیتا ہے لیکن وہ شریف آدمی نہیں۔ کوئی بھی اُس کی بہن کا رشتہ قبول نہیں کرتا۔ امین کا چونکہ بدمعاشوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا تھا اس لئے بُرے چال چلن کے آدمی اُس کے گھر آتے تھے....

"امین کی بہن آزاد خیال لڑکی تھی اور اتنی زندہ دل کہ لوگ اُسے بدکار لڑکی کہتے تھے۔ امین کے گھر داغدار چال چلن کے آدمی آتے رہتے تھے اس لئے اُسے ڈر تھا کہ اس کی بہن کسی کے دھوکے میں آکر اپنا آپ تباہ کر بیٹھے گی۔ امین میرے پاس یہ درخواست لے کر آیا تھا کہ میں اُس کی بہن کی شادی کا

بندوبست کر دوں۔ میں نے اُسے کہا کہ میں رشتہ بھی ڈھونڈ لوں گا اور شادی کے اخراجات بھی اپنے ذمے لے لوں گا۔ میں نے دو آدمیوں سے لڑکی کے رشتے کی بات کی۔ انہیں رشتے کی ضرورت تھی لیکن انہوں نے اس رشتے سے انکار کیا اور مجھے کہا کہ میں ان لوگوں کے مسئلوں میں دلچسپی نہ لوں کیونکہ امین بڑا خطرناک آدمی ہے اور اس کی بہن چال چلن کی صاف ہو ہی نہیں سکتی۔

"میں نے ان کی نصیحت پر دھیان نہ دیا۔ امین میرے پاس آتا رہا۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں نے اپنے بیٹے اشرف سے ذکر نہ کیا۔ ضرورت ہی نہیں تھی۔ اشرف اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ اشرف کو ممبئی جانا تھا۔ اس کے جانے کے دو روز بعد کا ذکر ہے کہ امین کا پیغام ملا کہ خدا کے لئے میرے گھر آئیں۔ میری بہن آپ کو بلاتی ہے۔ اسے ایک مشکل آپڑی ہے۔

"میرا اخلاق کچھ ایسا ہے کہ دشمن مدد کے لئے بلاتے تو بھی پہنچتا ہوں۔ یہ تو ایک لڑکی کا معاملہ تھا۔ اس کا گھر مجھے معلوم نہ تھا۔ میں پیغام لانے والے کے ساتھ چل پڑا۔ اس نے مجھے امین کے گھر میں داخل کر دیا۔ وہاں امین نہیں تھا۔ اُس کی بہن اکیلی تھی۔ اُس نے مجھے برآمدے میں چارپائی پر بٹھا دیا اور خود فرش پر بیٹھ گئی۔ وہاں بڑی اچھی دھوپ تھی۔ لڑکی کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ تو بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ اُس نے کہا کہ اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اُس نے مجھے اس لئے بلایا ہے کہ وہ خود میری منت سماجت کرنا چاہتی ہے کہ میں اُس کے لئے کچھ کروں۔ اپنے بھائی کے متعلق اُس نے بتایا کہ اتنا بدنام ہے کہ اس گھر میں کوئی شریف گھرانہ رشتہ لینے نہیں آتا....

"میں نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے امین کو لعنت ملامت کی تھی کہ وہ اپنی بہن کی خاطر بُرے کام چھوڑ دے۔ اُس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ نیک بننے کی کوشش کرے گا۔ اب میں اُس کی بہن کے پاس بیٹھا اس کو آنسو بہاتا دیکھ رہا تھا۔ اُس کی بہن نے کہا کہ سُنا ہے کہ آپ کی بیوی مر گئی ہے۔ آپ میرے ساتھ شادی کر لیں۔ میں آپ کی اتنی خدمت کروں گی کہ دیکھنے والے حیران رہ جائیں گے۔ میں نے ہنس کر کہا کہ میری عمر گزر چکی ہے۔ میں اب شادی کی

نہیں سوچ سکتا....

"اُس نے کہا کہ آپ کے بیٹے کی بھی بیوی مر چکی ہے۔ مجھے اُس کے ساتھ بیاہ دیں۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ بھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ کرے گا تو اپنی پسند کی کرے گا۔ لڑکی نے پہلے میرے پاؤں پکڑ کر کہا کہ میں اُس کے ساتھ شادی کر لوں پھر اُس نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر منت کی۔ میں نے اُسے ٹالا تو وہ میری گود میں بیٹھ گئی اور بازو میرے گلے میں ڈال دیئے۔ میں نے اُسے ہنستے ہوئے اُٹھانے کی کوشش کی....

"اتنے میں صحن کے سامنے یعنی ہمارے بالمقابل ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور امین باہر آیا۔ اُس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ ایک کا نام نذیر ہے جو باہر امین کے پاس بیٹھا ہے۔ تیسرے کا نام معلوم نہیں۔ امین کے ہاتھ میں کیمرہ تھا۔ لڑکی میری گود سے اُٹھ کر اندر چلی گئی۔ امین اور اُس کے ساتھی میرے پیچھے پڑ گئے۔ وہ باری باری کہتے تھے کہ تم نیکوکار بنے پھرتے ہو اور تمہاری کرتوت یہ ہے۔ ہم تو محلے کے آدمی اکٹھے کر کے سب کو بتائیں گے کہ اس شخص کو ہم نے کہا تھا کہ لڑکی کا رشتہ کرا دو اور یہ دیکھو یہ ہماری بہن کی عزت کے ساتھ کھیل رہا تھا....

"میں نے پہلے تو غصہ کیا۔ امین نے کہا کہ اُس نے میری تصویر لے لی ہے جو وہ سب کو دکھائے گا اور وہ تھانے میں رپورٹ بھی لکھوائے گا۔ میں نے انہیں بہت کچھ کہا مگر وہ تو پکے بلیک میلر اور پیشہ ور دھوکہ باز تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ فلم مجھے نکال دیں اور جتنی رقم مانگیں گے ادا کر دوں گا۔ امین کے دوست نذیر نے کہا کہ وہ رقم تو لیں گے ہی ان کا اصل مطالبہ یہ ہے کہ میں اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لوں یا اپنے بیٹے کے ساتھ اس لڑکی کو بیاہ دوں....

"میں اتنا پریشان ہوا کہ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے انہیں کہا کہ مجھے سوچنے دیں۔ تصویر اُن کے کیمرے میں تھی۔ میں اپنی عزت کی خاطر مجبور تھا۔ مجھ میں چالاکی تو ہے نہیں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں ان کے خلاف کوئی

کارروائی کرنے کی نہ سوچوں ورنہ میری بہت رسوائی ہوگی۔ میں وہاں سے آ گیا مگر میری حالت بہت بُری تھی۔ اگلے روز شام سے کچھ دیر پہلے امین آیا اور اُس نے مجھے فوٹو دکھائی۔ اُس کی بہن میری گود میں بیٹھی تھی۔ اُس کے بازو میرے گلے میں تھے۔ میرا ایک بازو اُس کی کمر میں تھا۔ ہم دونوں ہنس رہے تھے۔ یہ فوٹو دیکھ کر میرا پسینہ نکل آیا۔ امین نے مجھے کہا کہ اُس کی بہن کے ساتھ شادی کر کے مجھے پچھتانا نہیں پڑے گا۔ لڑکی کی خوبصورتی دیکھ لیں ...

"مختصراً یہ کہ میں نے خاموشی سے اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ لوگ حیران رہ گئے۔ میں نے سب کو بتایا کہ میں نے ایک لڑکی کو اخلاقی تباہی سے بچانے کے لئے شادی کی ہے۔ میں اس لڑکی سے مُنہ نہیں لگانا چاہتا تھا لیکن اُس نے رو رو کر میرے دل میں اپنی ہمدردی پیدا کر لی۔ میں نے امین کو تین ہزار روپیہ نقد دیا تھا۔ اُس نے میرے ساتھ بڑا اچھا رویہ رکھا اور مجھے یقین دلاتی رہی کہ اس نے میرے ساتھ شادی کرنے کے لئے یہ ناٹک کھیلا تھا۔ لڑکی بڑی شوقین نکلی۔ میں اُس کی فرمائش کے مطابق اُسے کپڑے اور زیورات لا لا کے دیتا رہا۔"

خاوند کو نیند کی گولی پلا دیتی تھی

اللہ بخش کی کہانی میرے لئے ایک عام آدمی کی حیثیت سے بھی اور تھانیدار کی حیثیت سے بھی دلچسپ تھی۔ کہانی بہت لمبی ہے۔ باقی کو میں ذرا مختصر کر دیتا ہوں۔ اشرف بمبئی سے واپس آیا تو اُس نے گھر میں سوتیلی ماں دیکھی۔ اُس کا جو ردِعمل تھا وہ میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ اللہ بخش نے بتایا کہ لڑکی نے اس (اللہ بخش) کے دل میں اپنی محبت پیدا کر لی۔ امین کبھی کبھی اللہ بخش سے ملتا اور اس سے پیسے لے جاتا تھا لیکن وہ اسے فوٹو نہیں دیتا تھا۔

قتل ہونے سے دو تین مہینے پہلے مقتولہ اپنے گھر گئی۔ واپس آئی تو اُس کے پاس فوٹو بھی تھی اور اس کی نیگیٹو بھی وہ لے آئی تھی۔ یہ اُس نے

اپنے بھائی کی چوری کی تھی۔ اُس نے رات کو اللہ بخش کے سامنے فوٹو اور نیگیٹو کو جلا دیا اور اس طرح اُس نے اپنی محبت کا ثبوت دیا۔ اُس رات لڑکی بہت روئی اور اُس نے اللہ بخش کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگی کہ ایک جُرم کر کے اُس نے اللہ بخش کے ساتھ شادی کی تھی جس پر وہ بہت نادم تھی۔

اللہ بخش اُس کے قتل کی وجہ نہ بتا سکا۔ اگر اس لڑکی کا کوئی مایوس امیدوار ہوتا تو وہ شادی کے فوراً بعد قتل ہو جاتی۔ اللہ بخش نے کہا کہ میری بیوی کے قتل کی خبر سُن کر امین نے آکر جو واویلا بپا کیا تھا وہ بلیک میلنگ کا چکر تھا۔

میں نے اللہ بخش سے کچھ باتیں پوچھیں، کچھ جرح کی اور اُسے ابھی تھانے میں ہی رہنے کو کہا۔ اسی میں شام ہونے کو آگئی تھی۔ میں نے امین اور نذیر کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں انہیں اپنے گواہ سمجھتا تھا۔ میں نے اُسی وقت امین اور نذیر کو اپنے ساتھ تھانے لانے کے لئے دو کانسٹیبل بھیج دیئے۔

مجھے ابھی اشرف اور اُس کے باپ کے بیانات کی تصدیق کرنی تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ میں بغیر رُکے تفتیش کرتا رہا تو کل صبح تک قاتل کا سراغ لگا لوں گا۔ میں نے اللہ بخش کے نوکر کی بیوی بی بی کو بلایا۔ اس لڑکی پر مجھے رحم آ رہا تھا۔ اتنی خوبصورت اور صحت مند لڑکی ایک نیم پاگل کی بیوی بنا دی گئی تھی۔ میرے سامنے آکر وہ بہت ڈری۔ میں نے اُس کا ڈر کم نہیں کیا۔ اُسے کہا کہ یہ تھانہ ہے جہاں آکر مرد بھی ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھتے ہیں اس لئے وہ مجھے دھوکہ دینے کی اور کچھ چھپانے کی کوشش نہ کرے۔

"بی بی!" میں نے اُس سے پوچھا "اشرف کے پلنگ پر تمہاری ایک دو چوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ تمہیں پتہ نہیں چلا تھا؟"

اُس نے سر جھکا لیا۔ میں نے یہ سوال اس لئے پوچھا تھا کہ اُسے پتہ چل جائے کہ میں اس کے متعلق سب کچھ جانتا ہوں۔

"ڈرو مت بی بی!" میں نے کہا "میرا اس سے کوئی واسطہ نہیں کہ تمہارے تعلقات کس کے ساتھ ہیں۔ یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں تمہارے متعلق ساری باتیں جانتا ہوں۔ میں تمہیں یہ بھی

بتا سکتا ہوں کہ تم کس طرح چھتوں سے اشرف کے پاس پہنچتی تھیں... نئی بیگم کے ساتھ تمہارا بڑا گہرا دوستانہ تھا۔ وہ راز کی باتیں بھی تمہارے ساتھ کر لیا کرتی تھی۔ کیا یہ صحیح ہے؟"

اُس نے سر اُٹھا کر آہستہ سے کہا — "صحیح ہے"۔ پھر ذرا آگے ہو کر منت سماجت کے لہجے میں پوچھا — "آپ میرے سسر کو تو نہیں بتائیں گے کہ اشرف کے ساتھ..."

"میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا" — میں نے کہا — "تمہاری بدنامی نہیں ہونے دوں گا۔ تمہیں گواہی دینے کے لئے کچہری بھی نہیں بلاؤں گا۔ مجھے دو چار باتیں بتا دو اور اپنے گھر چلی جاؤ۔ اشرف سے ملو۔ جو جی میں آئے کرو۔ نئی بیگم کی کسی کے ساتھ دوستی تھی؟"

"میں آپ کو سیدھی بات بتا دیتی ہوں" — اُس نے کہا۔ "بیگم کے بھائی کا دوست ہے نذیر۔ کل بیگم کو نذیر کا پیغام ملا تھا کہ میں رات کو آؤں گا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا رکھنا۔ اُس نے کوئی وقت بھی بتایا تھا۔"

بی بی ڈری ہوئی تھی۔ ایک تو ڈر کی وجہ سے اُس نے صحیح بات بتا دی۔ اس کے علاوہ میں نے دیکھا کہ وہ اتنی سادہ طبیعت کی نہیں تھی جتنی میں سمجھا تھا۔ اُس نے بات کی تو پتہ چلا کہ اُس کا ذہن پختہ ہے اور بولنا جانتی ہے۔ میں نے اُس کا حوصلہ بڑھایا تو وہ اور زیادہ کھل کر بولنے لگی۔

"اُس کے اشرف کے ساتھ بھی مراسم ہوں گے؟" — میں نے پوچھا۔

"نہیں" — بی بی نے جواب دیا — "یہ میں آپ کو یقین کے ساتھ بتاتی ہوں کہ بیگم نے اشرف کے متعلق کبھی ایسی بات نہیں سوچی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ یہ میں تو مجھ سے ایک دو سال بڑا ہے لیکن میں اسے بیٹا بنانا چاہتی ہوں۔ بیگم کی اس قسم کی دوستی اپنے بھائی کے دوست نذیر کے ساتھ تھی لیکن نذیر سے وہ تعلق توڑ رہی تھی۔ اشرف کے اباجی کو بیگم نے پیروں کی طرح ماننا شروع کر دیا تھا۔ کہتی تھی کہ اس شخص کے ساتھ میرے اندر جو محبت پیدا ہو گئی ہے وہ میری روح میں اتر گئی ہے۔ بیگم نے اپنے بھائی کو بھی ٹکا سا جواب دے دیا تھا

کہ آئندہ اس کے گھر میں نہ آیا کرے۔ قتل ہونے سے پانچ چھ دن پہلے کی بات ہے اُسے نذیر کا پیغام ملا تھا کہ رات کو آؤں گا۔ بیگم نے جواب دیا تھا کہ میرا تمہارا تعلق ختم ہے۔ اب کبھی نہ آنا۔ اس کے بعد دوبارہ بیگم کو نذیر کا پیغام آیا۔ بیگم نے انکار کر دیا۔ کہتی تھی کہ اب میں نے شریف اور خاوند کی وفادار عورت بن کے رہنے کی قسم کھا لی ہے لیکن آخری پیغام پر اُس نے کہا کہ وہ آ جائے۔ اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ آج رات اُس کی بے عزتی کر دوں گی اور اُسے کہوں گی کہ آئندہ مجھے نہ بلائے۔"

"ان کی ملاقاتیں کہاں اور کس طرح ہوتی تھیں؟"

"اشرف کے اباجی رات کو سونے سے پہلے دودھ پیتے ہیں" — بی بی نے کہا — "جس رات نذیر کو آنا ہوتا تھا بیگم دودھ میں نیند کی گولی رگڑ کر ملا دیتی تھی۔ اُسے یہ گولیاں نذیر نے لا دی تھیں۔ اس گولی سے اباجی کو بے ہوشی جیسی نیند آتی ہے۔ بیگم آدھی رات کو اُٹھ کر ڈیوڑھی کے دروازے کی زنجیر کھول دیتی تھی اور ان کی ملاقاتیں اسی کمرے میں ہوتی تھیں جس میں وہ قتل ہوئی ہے۔"

بی بی کا خیال تھا کہ امین کو اپنی بہن اور اپنے دوست نذیر کے تعلقات کا علم نہیں تھا۔ یہ دونوں مقتولہ سے پیسے لے جاتے رہتے تھے۔ ایک بار مقتولہ نے انہیں اپنے زیورات کی بھی ایک دو چیزیں دی تھیں۔ یوں سمجھیں کہ وہ مقتولہ کے ذریعے اللہ بخش کا گھر خالی کر رہے تھے مگر مقتولہ کے دل میں اللہ بخش کی محبت پیدا ہوتی تو اُس نے اپنے بھائی امین اور نذیر کو جواب دے دیا تھا۔

بی بی نے مجھے اُس عورت کا نام بھی بتا دیا جو نذیر کے پیغام لایا کرتی تھی۔ میں نے اُسی وقت ہیڈ کانسٹیبل کو یہ نام پتہ بتا کر کہا کہ اُسے تھانے لے آئے۔ میں پھر بی بی کی باتیں سننے لگا۔ میں نے اُسے کہا کہ اس نے اشرف کو یہ کیوں نہیں بتایا کہ نئی بیگم کیا کر رہی ہے۔

"اشرف میرا خاوند تو نہیں" — اُس نے سنجیدہ لہجے میں کہا — "مجھے ایک پاگل کے ساتھ بیاہ دیا گیا اور اشرف کی بیوی مر گئی تھی۔ میں نے ایک بار اسے

کہا کہ تمہارا باپ ایک گھٹیا اور بدمعاش خاندان کی لڑکی لے آیا ہے۔ تم میرے ساتھ شادی کر لو۔ میں خاوند سے طلاق لے لوں گی۔ اُس نے جواب دیا کہ تم اتنی خوبصورت ہو کہ اس حویلی کی بیگم بننے کے قابل ہو لیکن میں اپنی نسل خراب نہیں کرنا چاہتا۔ نوکرانی کو بیگم بنانا اچھا نہیں ہوتا... ہمارا تو جی جسمانی تعلق تھا۔ مجھے اشرف سے پیسے ملتے تھے اور میں بیگم سے بھی پیسے لیتی تھی۔"

مجھے اپنے کام کی کچھ اور معلومات لینی تھیں۔ وہ میں نے لے لیں۔ بی بی نے میری بہت مدد کی۔ رات ہو گئی تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل اُس عورت کو لے آیا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ بی بی اور اُس کے سسر کو الگ لے جاؤ اور انہیں بڑا اچھا کھانا منگوا کر کھلاؤ اور انہیں عزت سے کہیں بٹھاؤ۔

قاتل کی شلوار اور قمیض مل گئی

یہ ادھیڑ عمر عورت تھی۔ ترکھان کی بیوی تھی جسے زیادہ کام کاج نہیں ملتا تھا۔ بیوی چالاک اور ہوشیار تھی۔ نذیر کے پڑوس میں رہتی تھی۔ مقتولہ اور نذیر کے تعلق سے واقف تھی۔ یہ شادی سے پہلے کی بات ہے۔ مقتولہ کی شادی ہو گئی تو نذیر اسے پیغام بھیجنے کے لئے استعمال کرنے لگا۔ یہ عورت جب میرے سامنے آئی تو اُس کی ساری چالاکی ختم ہو چکی تھی۔ پولیس کے جال میں پہلی بار آئی تھی۔ میں نے بات کی تو رونے لگی۔ اُسے اپنے خاوند کا ڈر تھا۔ میں نے اُسے تسلی تو دی کہ اُس کے خاوند کو اُس کی کرتوت کا پتہ نہیں چلنے دوں گا لیکن یہ ناممکن تھا۔ اس عورت کو عدالت میں گواہی دینی تھی۔

اُس نے صاف صاف ہی بیان دے دیا۔ بی بی آپ کو بتا چکی ہے کہ ان کا سلسلہ کس طرح چلتا تھا۔ میری دلچسپی گذشتہ رات کی واردات کے ساتھ تھی۔ اُس نے بتایا کہ کچھ عرصے سے مقتولہ نے نذیر کو اس عورت کی معرفت دھتکارنا شروع کر دیا تھا لیکن آخری بار نذیر نے ایسی منت سماجت کی تھی کہ مقتولہ نے اُسے بلا لیا۔ پیغام جو نذیر نے بھیجا وہ یہ تھا کہ تم نے اپنے بھائی سے بھی ملنا

چھوڑ دیا ہے اور تمہارا بھائی ایک مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ تم اپنے بھائی سے ملنے آؤ یا مجھے اپنے ہاں بلاؤ۔ تمہارے بھائی کے لئے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔

اس عورت نے مجھے بتایا کہ مقتولہ نے غصے سے جواب دیا کہ اُسے کہہ دینا کہ جس طرح پہلے آیا کرتے تھے اسی طرح آ جانا۔ یہ پیغام دے کر مقتولہ نے کہا تھا — "میں اسے ایسی رقم دوں گی کہ ساری عمر یاد رکھے گا۔"

اس عورت کو میں نے ایک طرف کر دیا۔ امین اور نذیر کو میں نے بلوایا تھا۔ وہ آئے بیٹھے تھے۔ میں نے دونوں کو ہتھکڑیاں لگوا دیں۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ قاتل نذیر ہے۔ وہ رات کو آیا اور اپنا وہی مطالبہ کیا۔ مقتولہ نے اسے دھتکارا اور اس نے مقتولہ کو قتل کر دیا۔

میں پہلے نذیر کو ساتھ لئے اُس کے گھر گیا اور اُس کے دروازے پر رُک کر اُسے کہا — "مجھے وہ کپڑے نکال دو جو تم نے قتل کے وقت پہنے ہوئے تھے"

وہ بھی اُستاد تھا۔ بے گناہی ظاہر کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ بولنے لگا۔

"نذیر!" — میں نے تحمل سے کہا — "مجھے وہ کپڑے اپنے ہاتھوں نکال دو جو تم نے قتل کے وقت پہنے ہوئے تھے، میں اور کچھ نہیں سنوں گا۔ تمہارے گھر کا سارا سامان گلی میں پھینک کر تلاشی لوں گا اور تمہارے خاندان کی ہر ایک عورت اور ہر ایک بچے اور بوڑھے کو تھانے لے جاؤں گا۔ تم پھر بھی زبان نہیں کھولو گے تو تم جانتے ہو کہ میں زبان کس طرح کھلوایا کرتا ہوں۔ تم نے تھانے میں ترکھان کی بیوی کو نہیں دیکھا؟ تم نے تھانے میں مقتولہ کی نوکرانی کو نہیں دیکھا؟ میں نے ان کے بیان لینے کے بعد تمہیں ہتھکڑی لگائی ہے۔ پھانسی سے بچنا چاہتے ہو تو میری مدد کرو تاکہ میں تمہاری مدد کر سکوں۔"

وہ سر جھکا کر اندر چلا گیا۔ میرے پاس ٹارچ تھی۔ نذیر کے گھر دو لالٹینیں تھیں۔ وہ ہتھکڑیوں میں تھا۔ امین گلی میں ہتھکڑیوں میں کھڑا تھا۔ نذیر نے ایک سوٹ کیس سے قمیض اور شلوار نکالی جو دُھل چکی تھی لیکن خون کے دھبے پھر بھی معلوم کئے جا سکتے تھے۔ اس مقصد کے لئے شلوار قمیض لاہور بھیجی تھی۔ میرے پوچھنے پر نذیر

سے بتایا کہ یہ کپڑے اُس کی ماں سے دھوتے تھے۔ میں نے اُس کی ماں سے پوچھا تو وہ چونکہ ماں تھی اس لئے اُوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگی۔ نذیر نے اسے کہا کہ بتا دو، کوئی خطرہ نہیں۔

مختصر یہ کہ ان کپڑوں پر خون کے چھینٹے تھے۔ نذیر نے صبح ماں سے کہا کہ اس کا ایک دوست زخمی ہو گیا تھا۔ اُسے سہارا دے کر ڈاکٹر کے پاس لے گئے تو اُس کے خون کے چھینٹے کپڑوں پر پڑ گئے۔

"اب نذیر بھائی!"— میں نے کہا— "مجھے وہ زیورات نکال دو جو تم نے مقتولہ کی لاش سے اُتارے یا اُس سے لئے تھے۔"

اُس نے وہ بھی نکال دیئے۔ یہ ابھی سنار کے پاس نہیں گئے تھے۔ میرے ساتھ محلے کے دو آدمی برآمدگی کے گواہوں کی حیثیت سے ساتھ تھے۔ میں نے باقی گھر کی تلاشی لی۔ اس واردات سے تعلق رکھنے والی کوئی اور چیز نہ ملی۔

دو دوستوں کی داستان تمام ہوئی

ہم باہر آ گئے۔ مشیر نامہ لکھا۔ گواہوں کے دستخط کرائے۔ نذیر نے بھی دستخط کر دیئے۔ میں نے اس کا انگوٹھا بھی لگوا لیا۔ امین میرے قریب آیا اور مجھ سے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور میں نے اُسے ہتھکڑی کیوں لگائی ہے۔

"او بے غیرت کے بچے!"— میں نے اُسے اُس کے کان میں کہا— "یہ تمہاری بے غیرتی کا نتیجہ سامنے آ رہا ہے۔ تم نے اپنی بہن کو رقم بٹورنے کے لئے استعمال کیا اور اُسے اللہ بخش کی بیوی بنا دیا لیکن تمہاری بہن کا ایک خاوند اور بھی تھا۔ وہ تمہارا دوست نذیر تھا۔ یہ شادی سے پہلے بھی تمہاری بہن کا خاوند تھا۔ شادی کے بعد راتوں کو اُس کے گھر جاتا اور اُس سے رقم لے کر آتا تھا۔ کل رات اس نے تمہاری بہن کو قتل بھی کیا اور اُس کے زیورات بھی اُتار لایا۔ میں نے زیورات برآمد کر لئے ہیں....

کیا تم کو ان باتوں کا پہلے علم تھا؟ میں کہتا ہوں تمہیں علم تھا۔ تم اپنی بہن کی دلالی کرتے تھے۔"

اُس کی ہتھکڑی کی زنجیر کانسٹیبل نے پکڑ رکھی تھی۔ نذیر چار پانچ قدم دُور کھڑا تھا۔ اچانک امین نے جھٹکا دے کر ہتھکڑی کی زنجیر کانسٹیبل سے چھڑا لی۔ یہ لمبی ہوتی ہے۔ امین میں اتنی عقل تھی کہ اُس نے زنجیر کا دوسرا سرا اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا جس سے زنجیر چھوٹی ہو گئی۔ اُس نے زنجیر گھمائی اور اس سے پہلے کہ کوئی اُسے پکڑتا اُس نے زنجیر آگے بڑھ کر نذیر کے منہ پر ماری۔ نذیر بھی ہتھکڑیوں میں تھا۔ وہ اِدھر اُدھر ہو رہا تھا کہ امین نے زنجیر گھما کر اُس کے سر پر ضرب لگائی۔

ہتھکڑی کی زنجیر خاصی موٹی ہوتی ہے۔ نذیر چکرا کر گرنے لگا۔ امین کو پکڑنے کو دوڑے لیکن اُس نے نذیر کے ننگے سر پر ایک اور ضرب لگائی۔ نذیر گر پڑا۔ امین اُس کے سینے پر بیٹھ گیا اور اس کا گلا دبا لیا۔ اُسے پکڑ لیا گیا۔ اُس نے اُٹھتے اُٹھتے نذیر کے مُنہ پر ٹھڈ مارے۔ وہ ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ نذیر کا سر اور چہرہ لہولہان ہو گئے تھے اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

امین نے مجھے بڑے آرام سے کہا— "مجھے پھانسی دے دو۔ مجھ سے پوچھو کیا پوچھتے ہو۔ میرا بیان لکھو"— اُس کی ذہنی حالت نارمل نہیں رہی تھی۔ اُس نے کہا— "میں پھانسی کو قبول کر چکا ہوں مگر یہ ابھی زندہ ہے۔ اسے میں جان سے مار لوں۔ مجھے ایک منٹ کے لئے چھوڑ دیں۔"

نذیر کو اُٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ میں امین کو ساتھ لئے اُس کے گھر کی تلاشی کے لئے گیا۔ وہاں کوئی خاص چیز نہ ملی۔ امین بیان دینے کے لئے تیار تھا۔ اُس نے نذیر کو اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کا ساتھی اور جگری یار بنا رکھا تھا لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کا جگری یار اُس کی بہن کا آشنا بنا ہوا ہے اور اُس کی بہن سے رقم بٹور رہا تھا۔ یہ جرم کے اندر جرم ہو رہا تھا۔ امین نے تھانے میں جا کر بیان دے دیا۔ اُس نے اعتراف کیا کہ اُس نے اللہ بخش کو بلیک میلنگ کا نشانہ بنایا ہوا تھا اور اس کے بعد وہ اپنی بہن سے پیسے لیتا رہا۔ چند مہینوں سے اس کی بہن نے اُسے کہہ دیا تھا کہ اب

وہ اُس کے گھر نہ آیا کرے اور بھول جائے کہ اُس کی کوئی بہن تھی۔ اس کا امین کو زیادہ افسوس نہ ہوا بلکہ وہ کہتا تھا کہ اسے یہ خوشی ہوئی کہ اُس کی بہن اپنے گھر میں اور اپنے خاوند کے دل میں آباد ہوگئی ہے۔

تیسرے چوتھے دن نذیر بیان دینے کے قابل ہوا۔ اُس نے امین کی اور اپنی مجرمانہ حرکتیں سنائیں۔ وہ ایسے جرم کرتے تھے کہ پکڑے نہیں جاتے تھے۔ ہر جگہ دلال بن جاتے۔ بلیک میلنگ کرتے۔ جھوٹی گواہیاں دیتے یا جھوٹے گواہ مہیا کرتے۔ عیاش دولت مندوں کو عیاشی کا سامان سپلائی کرتے تھے۔ جُوا بھی کھیلتے اور کھلاتے تھے۔

نذیر نے بتایا کہ امین کو معلوم نہیں تھا کہ اُس نے اُس کی بہن کے ساتھ در پردہ سلسلہ بھی چلا رکھا ہے۔ اُس نے اس کی تفصیل بیان کی۔ آخر میں اُس نے اسی طرح مقتولہ سے ملاقات کا موقعہ پیدا کیا جس طرح بی بی اور ترکھان کی بیوی بتا چکی ہیں۔ نذیر اللہ بخش کے گھر گیا۔ باہر کے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ اندر سے کھلا تھا۔ وقت مقرر تھا۔ مقتولہ آچکی تھی۔ نذیر کو دیکھتے ہی اُس پر برس پڑی اور کہا کہ آئندہ یہاں نہ آیا کرے ورنہ وہ امین کو اور اپنے خاوند کو بتا کر اُسے موقعہ پر گرفتار کرا دے گی۔

نذیر اناڑی نہیں تھا۔ اُس نے مقتولہ کو دھمکیاں دیں۔ ان میں جھگڑا ہُوا۔ نذیر نے ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے کے ساتھ کپڑے دھونے والا ڈنڈہ پڑا دیکھا۔ اُس نے وہ اُٹھا لیا۔ مقتولہ نے اُسے چیلنج کیا کہ وہ بھاگے گی نہیں۔ ہمت ہے تو میرے قریب آؤ۔ اُسے شاید توقع نہیں تھی کہ نذیر اُس پر ہاتھ اٹھائے گا مگر نذیر نے اُس کے سر پہ ڈنڈہ مارا۔ وہ چکرا کر گری تو نذیر نے اُسے بے آبرو کیا اور اُس کے زیورات اُتار لئے۔ اُس وقت وہ ہوش میں آگئی اور اُس نے چیخیں ماریں۔ نذیر نے اُس کے سر پر چار پانچ انتہائی زور سے ڈنڈے کی ضربیں لگائیں اور بھاگ گیا۔

وہ گھر گیا۔ کپڑے بدلے اور لیٹ گیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد امین اُس کے گھر آیا۔ وہ گھبرایا ہُوا تھا۔ اُس نے کہا کہ ابھی خبر ملی ہے کہ اُس کی

بہن قتل ہوگئی ہے۔ نذیر نے اُسے کہا کہ یہ اشرف کی کارستانی ہے۔ چونکہ دونوں بلیک میلر تھے اس لئے انہوں نے قتل کی اس واردات کو اللہ بخش سے مزید رقم بٹورنے کا ذریعہ بنانے کا منصوبہ بنا لیا۔ دونوں آتے۔ میں وہیں تھا۔ انہوں نے جو شور شرابہ کیا تھا وہ میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ وہ اللہ بخش سے ملیں گے اور اُسے کہیں گے کہ پچاس ہزار روپیہ دو ورنہ جھوٹے سچے گواہ لا کر وہ اُس کے بیٹے کو قاتل ثابت کر دیں گے۔

اس کے بعد جو ہُوا وہ پولیس اور قانون کی کارروائی کی روئیداد ہے لیکن ہُوا یُوں کہ پھانسی امین کو ملی۔ یہ اس طرح ہُوا کہ امین اور نذیر کو تھانے کی کارروائی وغیرہ مکمل ہونے کے بعد جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔ جیل میں قیدی اکٹھے رہتے ہیں۔ امین کا قتل کی واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس پہ کچھ اور الزامات تھے۔ ایک الزام یہ تھا کہ اُس نے نذیر پہ قاتلانہ حملہ کیا۔

چار پانچ دن گزرے تو اطلاع ملی کہ امین نے جیل میں نذیر کو قتل کر دیا ہے۔ جیل میں قتل کی سزا سے بچنا ممکن نہیں ہوتا۔ وہاں صفائی کا کوئی گواہ نہیں مل سکتا۔ امین کا مقدمہ چلا اور اُسے سزائے موت دے دی گئی۔

